قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

مئی 2014، قیمت -/15

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

اردو طباعت واشاعت کی دنیا

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:16، شمارہ:05، مئی 2014

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا

انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: منظر سبحانی

قیمت-/15 روپے، سالانہ -/150 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000

(شعبۂ ادارت:49539009)

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

email: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7

آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194-040

مشمولات

اداریہ

ہماری بات — 2

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط — 3

انٹرویو

رسم الخط کسی بھی زبان کی روح ہے: کلدیپ نیر — شفیع ایوب — 7

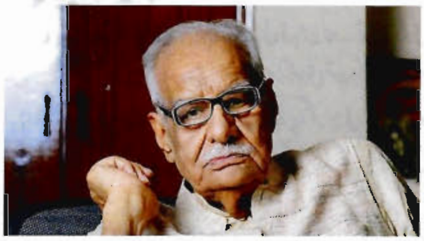

کور اسٹوری

اردو کتابوں کی فروخت کا منظرنامہ — محمد عارف اقبال — 10

جنوبی ہند کے پبلشرز کی اردو خدمات — ناظم علی — 16

تمل ناڈو میں اردو کتابوں کی اشاعت — علیم صبا نویدی — 18

زبان و تعلیم

اردو زبان میں سائنسی، تکنیکی، حرفتی پیشہ ورانہ اور اعلیٰ تعلیم کے مسائل — احتشام الحق — 22

ادبی مباحث

احتجاج کی منفرد آواز: فیض — دیوان حنان خان — 25

رامائن، مسلمان اور اردو — ثوبان سعید — 28

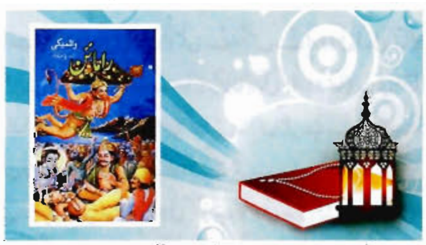

عہد ساز شخصیت: حسرت موہانی — عاقل زیاد — 32

علی عباس حسینی کے کرداروں میں مشرقی نفسیات — محمد مستمر — 34

شخصیات

ایک نغمہ گر شاعر: ساحر لدھیانوی — رہنما شیخ — 36

خراج عقیدت

پروفیسر محمود الٰہی: ایک دبستان — عبدالحق — 39

خوشونت سنگھ کی کالم نویسی اور نشاطیہ کلچر — زبیر رضوی — 43

ایک باغ و بہار شخصیت: صغرا مہدی — نگار عظیم — 45

مشاہیر ادب

علامہ شبلی نعمانی — تابش مہدی — 48

بھاشا زبان اور مسلمان — شبلی نعمانی — 50

ہماری مطبوعات

سماجی برائیاں (بوستانِ خیال کے تناظر میں) — ابن کنول — 53

تہذیب و ثقافت

اردو گیت کے فنی محاسن — سید منیر محی الدین — 56

ہم نے جنھیں بھلا دیا

عطیہ فیضی: ایک بھولی بسری داستان — وقار ناصری — 58

صحافت

اثر خیز صحافت کے علمبردار: ظفر علی خاں — منور حسن کمال — 62

دوسری زبانوں سے

وطن (فارسی افسانہ) — سعید نفیسی — مترجم: واصف احمد — 66

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف — 68

عالمی اردو نامہ

عالمی خبریں — ادارہ — 76

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 77

ہماری بات

کسی بھی زبان کی توانائی اور وسعت کا پتہ دو باتوں سے چلتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ کتنی بولی جاتی ہے۔ دوسری یہ کہ وہ کس قدر پڑھی جاتی ہے۔ پہلے پیمانے کو سامنے رکھیے تو ہندوستان یا برصغیر کی ہی نہیں پورے جنوب ایشیائی خطے میں عوامی رابطے اور عام زندگی میں استعمال ہونے والی سب سے بڑی زبان اردو یا وہ ہندوستانی زبان ہے جس میں فارسی، عربی اور سنسکرت کے مشکل الفاظ کی بھرمار نہیں۔ رہ گیا دوسرا پیمانہ، تو اس کے مطابق ہندوستان میں، بلکہ پاکستان کو چھوڑ دیں تو باقی جنوبی ایشیا میں بھی صرف ایک زبان کی حکومت ہے۔ اور وہ زبان ہے انگریزی، جس سے آج وہ ہندی والے بھی خائف نظر آتے ہیں جو ہندی کو اس ملک کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی زبان ہونے کی دعویٰ کرتے رہے ہیں۔ دنیا بھر میں انگریزی اخباروں کا سب سے زیادہ سرکولیشن ہندوستان میں ہے۔ سب سے زیادہ ایڈیشنوں اور مجموعی تعداد والے انگریزی اخبار بھی اب ہندوستان میں ہی چھپ رہے ہیں۔ پاکستان میں فی الحال وہ مقام اردو ہی کو حاصل ہے جس پر ہمارے یہاں انگریزی قابض ہو چکی ہے۔ لیکن اب وہاں بھی، ایک طرف علاقائی زبانیں زور مار رہی ہیں اور دوسری طرف تعلیمی ترقی کے نتیجے میں انگریزی کو زیادہ فروغ حاصل ہو رہا ہے اس لیے کوئی تعجب نہیں کہ اگلے دس پندرہ برسوں میں وہاں اردو دوسرے نمبر پر آ جائے۔

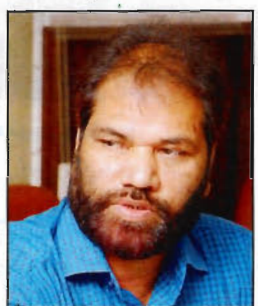

ایک زمانہ تھا کہ اردو طباعت و اشاعت برصغیر میں سب سے اونچے مقام پر نظر آتی تھی۔ اس وقت چھاپہ خانوں نے کوئی خاص تکنیکی ترقی نہیں کی تھی اور ہاتھ سے کتابت کا بھی بڑا سخت مسئلہ اور مرحلہ درپیش تھا جس سے نجات پانے کی مولانا ابوالکلام آزاد کی کوششیں اردو ٹائپ سیٹ پر چھپنے والے الہلال اور البلاغ کی مقبولیت کے باوجود بارآور نہ ہو سکی تھیں۔ اس پر بھی تقریباً ہر عصری موضوع اور ضرورت سے واسطہ رکھنے والی کوئی نہ کوئی کتاب اردو میں مل ہی جاتی تھی۔ مسلمانوں کا ہی نہیں ہندوؤں، عیسائیوں اور سکھوں کا مذہبی لٹریچر بھی اردو میں زیادہ چھپتا تھا۔ تقسیم وطن کے بعد جب اردو طباعت و اشاعت پر زوال آیا، ہجرتوں نے اردو کے جمے جمائے پرنٹنگ انفرااسٹرکچر میں دراریں ڈال دیں اور اردو رسائل و جرائد کی طرح اردو کے اشاعتی ادارے بھی دھڑا دھڑ بند ہونے لگے، تب کمپیوٹر کی آمد سے پرنٹنگ ٹیکنالوجی میں زبردست انقلاب آیا۔ اس کا فائدہ اردو کو بھی پہنچا۔ اردو کتابوں کی اشاعت پر ہونے والے خرچ میں کمی آئی، پروڈکشن کا عمل تیز ہوا، برسوں میں چھپنے والی کتابیں ہفتوں میں شائع ہونے لگیں، چھپائی کا معیار بھی اتنا بلند ہوا کہ 'اردو دنیا' اور 'بچوں کی دنیا' جیسے رسالوں نے اسے انگریزی اور ہندی کی سب سے خوب صورت اشاعتوں کے برابر لا کھڑا کیا۔

درمیانی دور میں انجمن ترقی اردو ہند، مکتبہ جامعہ، ساہتیہ اکادمی، نیشنل بک ٹرسٹ، خدا بخش لائبریری، رام پور رضا لائبریری دہلی اردو اکادمی جیسے سرکاری، نیم سرکاری اور رضا کار ادارے اپنی دیگر سرگرمیوں کے ساتھ اردو کے اہم اشاعت گھروں کے طور پر بھی سرگرم عمل رہے لیکن اس میدان میں سب سے بڑے پیمانے پر خدمات انجام دی قومی اردو کونسل نے، جس نے اردو کی ایسی کتابوں کے ہزار ہا ٹائٹل شائع کیے جنھیں شائع کرنا غیر منافع بخش تھا اور جن میں بہت سی کتابیں عرصے سے نایاب تھیں۔ سائبر ٹیکنالوجی کو اردو کتابوں کی اشاعت سے جوڑتے ہوئے قومی اردو کونسل نے ایک اور انوکھا اقدام یہ کیا کہ اپنی تمام مطبوعات انٹرنیٹ پر آن لائن مہیا کر دیں۔ اس تجربے نے اردو سے محبت رکھنے والوں کے اور بھی کئی اداروں کو تحریک دی ہے اور وہ بہت سی پرانی کتابیں آن لائن لانے کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

لیکن دو باتیں صاف ہیں۔ ایک تو یہ کہ چھپی ہوئی کتاب کا کوئی بدل نہیں اور اس کی اہمیت بہرحال قائم رہنے والی ہے۔ دوسرے یہ کہ اردو میں کتابیں چھاپنا آج کے زمانے میں بھی زیادہ منفعت بخش کاروبار نہیں ہے۔ یہ صورت حال بدل سکتی ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ کتابیں خرید کر پڑھی جائیں۔ اردو والوں کے حالات اتنے گئے گزرے نہیں ہیں کہ وہ مہینے بھر میں اپنی پسند کی ایک بھی اردو کتاب نہ خرید سکیں۔ اگر اردو قوم اتنا بھی نہیں کر سکتی تو پھر ہٹایئے سب کچھ ایک طرف۔ اردو کے مسائل اور ان کے حل کی باتیں کرنا چھوڑ دیجیے۔ ہمیں اردو زبان سے مکمل طور پر قطع تعلق کر لینا چاہیے۔ کم از کم اتنی ایمانداری تو ہمیں دکھانی ہی ہوگی! بات کڑوی ضرور ہے لیکن سچ ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ اگر ہمیں اردو سے محبت ہے تو ہمیں اسے پورے طور پر اپنانا ہوگا۔ اس کی کتابوں سمیت!

زیر نظر شمارے میں ہم نے 'کور اسٹوری' کے تحت اردو کی طباعتی و اشاعتی دنیا کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے، جو پوری طرح جامع تو نہیں ہے پھر بھی اس میں کچھ اشارے ضرور ملیں گے جو بہی خواہانِ اردو کی توجہ کے مستحق ہیں۔ امید ہے یہاں سے بات اور آگے بڑھائی جا سکے گی۔

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

آپ کی بات

منصور عثمانی

نجمہ ہاؤس، بارہ دری، مرادآباد

’اردودنیا‘ برابر نظر سے گزرتا ہے اور اکثر میرا انیس تنہائی رہتا ہے۔ مشمولات کی اہمیت نے اب اسے ادبی دستاویز کے درجے پر پہنچادیا ہے۔ ہر شمارہ گزشتہ شمارے سے اعلیٰ معیار کی جانب بڑھتا قدم ہے۔ ’بچوں کی دنیا‘ کا ایک شمارہ مجھے ملا۔ پڑھ کر بچپن کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ بہر حال، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تمام موثر پروگراموں کی طرح یہ دونوں پرچے بھی زبان و ادب کی تاریخی خدمت انجام دے رہے ہیں جس کے لیے محترم وسیم بریلوی، خواجہ اکرام الدین اور نصرت ظہیر صاحبان کو بہت بہت مبارکباد اور بے شمار دعائیں!

رئیس الدین رئیس

10/1725، دہلی گیٹ، علی گڑھ

’اردو دنیا‘ کا تازہ شمارہ مل گیا تھا۔ NCPUL اردو ادب کی جو خدمات انجام دے رہا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اگر یہ کہا جائے کہ این سی پی یو ایل دنیا کا واحد اردو ادارہ ہے جو نہایت لگن و ایمانداری کے ساتھ کام کر رہا ہے غلط نہ ہوگا۔ دلی مبارکباد!

کرشن بھاؤک

کوٹھی نمبر 201، گلی نمبر 18-K، گورونانک نگر، پٹیالہ، پنجاب

اپریل کا شمارہ ’اردو دنیا‘ باصرہ نواز ہوا۔ ’آپ کی بات‘ کے تحت اس خاکسار کے خط میں جناب گوپی چند نارنگ کی ہندی کتاب سے امیر خسرو کے محولہ دوہے میں غلط ’اردو‘ لفظ کی بجائے ہندی کی مقامی زبان اودھی کا لفظ ’ارو‘ (Aru) درکار ہے، جس کا معنی ہے ’اور‘۔ عبدالسلام صدیقی کا امتیاز علی تاج کے مشہور ڈرامے ’انارکلی‘ پر مبنی مضمون اس کے مختلف ابواب ومناظر کی تفصیل کے علاوہ کردار نگاری و مکالمہ نویسی کی شاندار عکاسی کے سبب لائق تحسین ہے۔ نصرت ظہیر صاحب نے اپنے معیاری مضمون میں مختلف اہم ومقبولِ عام اردو رسائل کی بابت معلومات فراہم کی ہیں۔ ’اردو دنیا‘ کے ارتقا میں رفقا کے تعاون نے اہم رول ادا کیا ہے اور جریدے کو قابلِ حسد مقام تک پہنچایا ہے۔ سہیل انجم کے گزشتہ صدی سے تاحال کے اردو جرائد کی بابت مقالہ بھی لائق تحسین ہے۔ صرف سری نگر

کشمیر سے دو صدیوں سے متواتر شائع ہونے والے، نیم ادبی رسالے ’حکیم الامت‘ کی طرح اور بھی دیگر رسالوں کے نام نہیں آپائے ہیں۔ ’اردو دنیا‘ کے اسی شمارے میں ادبِ اطفال، سیکولر زبان اردو کی جامعاتی سطح پر تدریس جدید تکنیکی وسائل سے متعلق معلومات، مزاحیہ کالم نگار کنہیا لعل کپور، فکر تونسوی کی شمولیت، افسانہ نگار اختر اورینوی، مرحوم جناب علی امام نقوی پر مضامین شامل کرنا قارئین کے لیے مفید ہے۔ علی جواد زیدی پر تحریر اور ان کے کلام سے انتخاب ان کی ہمہ جہت شخصیت کا اظہار ہے۔ نیاز احمد آسی نے شہر آہن جمشید پور کے ادبی فن پارے وشاعری کی مثالیں دی ہیں جو مسلم ہے، نیز ذوق کا یہ شعر صادق آتا ہے:

آسماں سخت مزاجوں کو ہنر دیتا ہے
دیکھ لو ہوتے ہیں فولاد میں جوہر پیدا

یہ شمارہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، کسی بھی اردو کے دلدادہ کے ذاتی کتب خانے کی زینت بن سکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

مارچ 2014 ’اردو دنیا‘ کا شمارہ پیش نظر ہے۔ یہ شمارہ بھی سابقہ شماروں کی طرح حسن طباعت اور کتابت سے مزین اور محققانہ اور گراں قدر مشمولات کا مجموعہ ہے۔ طوطیِ ہند حضرت امیر خسرو پر جو مضامین شائع ہوئے ہیں وہ قاموسی حیثیت رکھتے ہیں۔ حسب ذیل گراں قدر مضامین بہت پسند آئے: امداد امام اثر کی انگریزی شاعری، خراج عقیدت کے تحت عظیم ناول نگار اور افسانہ نگار قرۃ العین حیدر پر پروفیسر ابوالکلام قاسمی کا مضمون بڑا ہے درد کا رشتہ۔ اردو کے معروف افسانہ نگار رام لال پر ان کے بیٹے وی ونود چھابڑا کا مضمون بعنوان اب کوئی نہیں آتا ہے یہاں، مخمور دہلوی، ملا رموزی کا مضمون خفیہ بیوی اور محققانہ مضمون ذوق کا نظریہ تعلیم، صحت کے تحت شہد ایک قدرتی غذا اور لاجواب دوا اور فاضلانہ تبصرے، کرشن بھاوک کے مضمون میں یہ مندرج ہے کہ امیر خسرو کا اصل نام ابوالحسن ہے جب کہ ظ انصاری اور ابوالفیض سحر کے مضمون میں ان کا نام یمین الدین خسرو ملتا ہے۔

اخلاق حسین ’اثر‘

صادق منزل، چوکی امام باڑہ، بھوپال

مارچ 2014 کا شمارہ ’اردودنیا‘ کا دلچسپ اور فکرانگیز ہے۔ ’ہماری بات‘ میں آپ نے امیر خسرو کے یوم پیدائش کو یوم اردو منانے اور تسلیم کرنے کا ذکر فرمایا ہے۔ سرکاری منظوری نامہ بھی شائع ہوجاتا تو معلوم ہوجاتا کہ اس کی نوعیت کیا ہے۔ ویسے اگر آپ نے قارئین سے مشورہ کیا ہوتا تو اچھا تھا۔ یونیسکو کے رکن ممالک نیز تنظیم کے صدر دفتر میں ہر برس 31 فروری کو مادری زبانوں کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ میں یوم اردو کے لیے 21 فروری تجویز کرتا اور اس طرح ہمارا رشتہ عالمی زبانوں سے بھی ہوجاتا۔ ’آپ کی بات‘ کے سلسلے میں ’گزارش‘ بہت ضروری ہے۔ پروفیسر حمید سہروردی کا ڈاکٹر عبدالحی کا مصاحبہ بہت اچھا ہے۔ اس میں تقسیم وطن اور اردو پر علمی وفکری تبصرہ ہے۔

جناب سلیم شہزاد اور ڈاکٹر نعمان خاں کے مضامین اچھے ہیں۔ دونوں مضامین میں اندرونی ربط ہے اور دونوں کی یکجائی اشاعت حسن ترتیب کی علامت ہے۔ سلیم شہزاد نے اردو میں پہلی مرتبہ درس مکتب میں ادبی تحریروں کی اشاعت پر بامعنی سوالات اٹھائے ہیں۔ اس موضوع پر انگریزی میں بہت سی کتابیں ہیں۔ سلیم شہزاد نے جو بال بھارتی کا اقتباس دیا ہے وہ مہاراشٹر کی درسی کتاب سے ہے۔ اس کی رہنمائی نوید خان صاحب اردو

آمیز، بال بھارتی نے فرمائی ہے۔ سلیم صاحب نے اس اقتباس کو غیرادبی کہا ہے، اسے لسانی اقتباس کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ خود انھوں نے ایک جگہ اسے استعمال کیا ہے۔ ہاں سلیم شہزاد صاحب اور نعمان خاں صاحب اگر یہ بھی لکھ دیتے کہ مولوی محمد حسین کے یہاں اردو حروف تہجی کی تعداد کتنی ہے اور یہ کہ 'ے' اور 'ی' کے لیے دو نقطے جیسے یاد اور چیل میں کس طرح پڑھائے اور سمجھائے گئے ہیں تو اچھا ہوتا۔ پروفیسر غضنفر کے عالمانہ مضمون میں یہ نکتہ رہ گیا تھا۔

محمد بشیر مالیر کوٹلوی

اسٹیٹ آفیسر، پنجاب وقف بورڈ، دہلی گیٹ، نزد مالیر کوٹلہ

ایم اے حق کا مضمون 'افسانچوں کی عالمی گونج' اردو دنیا مارچ میں پڑھا۔ بڑا ہی پرمغز اور معلوماتی مضمون ہے۔ حق صاحب کئی زاویوں سے دامن بچا کر صاف نکل گئے۔ ان کا فوکس ایک ہی بات پر رہا کہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی افسانچے مقبول ہو رہے ہیں۔ ہر چھوٹی، واقعاتی، نثری تحریر افسانچہ نہیں ہوسکتی۔ چند جملے ہی سہی، وہ بھی تکنیک سے گزر کر ہی افسانچہ بنتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک کامیاب افسانہ نگار جو افسانے کے ہر موڑ سے واقف ہو، وہی معیاری افسانچہ تخلیق کرسکتا ہے۔ میرے نزدیک افسانے سے افسانچہ تخلیق کرنا زیادہ مشکل کام ہے۔ حق صاحب اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں: ''آج ہندوستان میں افسانچہ نگاروں کی ایک بڑی جماعت وجود میں آچکی ہے اور یہ تعداد بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔'' آج معیاری جرائد افسانچے شائع نہیں کرتے کچھ ایک نے تو اشتہارات دے دیے کہ افسانچے اشاعت کے لیے مت بھیجیں۔ اس زوال کی وجہ یہ ہماری روز بروز بڑھتی ہوئی جماعت ہی ہے۔ حق صاحب نے سینئر ادبا کو آواز دی ہے کہ وہ بھی افسانچے تخلیق کریں۔ رتن سنگھ اور پال صاحب کے علاوہ کس نے افسانچوں کے لیے قلم سنبھالا۔ سلام بن رزاق، انور قمر، احمد سہیل، عبدالصمد، شوکت حیات، شرون ورما، اسرار گاندھی، میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ کچھ ادبا تو افسانچوں کو ادب کی صنف مانتے ہی نہیں چٹکلے گردانتے ہیں۔ سونے پہ سہاگہ یہ ہوا کہ اس بڑی جماعت نے تو قاری کو بھی افسانچوں سے متنفر کردیا اور مدیران نے بھی توبہ کرلی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بڑھتی ہوئی اس جماعت کو افسانچوں کے بارے میں معلومات دی جائے تاکہ افسانچہ لکھنے والوں کی تعداد نہیں، افسانچوں کا معیار بڑھے تبھی یہ صنف مقبول ہوگی ورنہ یہ گمنامی کے اندھیروں میں بھٹکتی رہے گی۔ پاکستان میں اس صنف کو بہت کم اپنایا گیا ہے۔ فون پر ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ پاکستان میں تو افسانچوں کو ادب کی صنف ہی نہیں مانتے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ اہل پاکستان منٹو کے شیدائی ہیں۔

ایم راگھو راؤ

ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا، مدھیہ پردیش

مارچ 2014 کا شمارہ ملا۔ امیر خسرو ایک بلند پایہ شاعر، مقبول موسیقار تھے۔ مثنوی، غزل، دوہا، گیت، نظم، قصیدہ، رباعی وغیرہ میں انھیں دستگاہ حاصل تھی، ان کی تصانیف میں ہندوستانی تہذیب و فلسفہ، مہمان نوازی، گلوں، رسم و دستور کی ستائش کی گئی ہے۔ امیر خسرو کا کلام اپنی مقبولیت کی وجہ سے مقبول ہوتا رہا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کا شمار اردو کے اہم شاعر، مکتوب نگار، تذکرہ نویس، مترجم اور اردو شاعری کے بانی کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ وہ صاحبِ طرز انشاپرداز تھے۔ قرۃ العین حیدر بیسویں صدی کے نصف آخر کی اردو میں سب سے ممتاز دانشور تھیں۔ انھوں نے اپنا کوئی ناول محض قصہ گوئی اور خالی واقعات اور کرداروں کی کھتونی کی صورت میں نہیں لکھا۔ ہر ناول کا کوئی نہ کوئی تاریخی یا علمی یا ثقافتی پس منظر ہے جس کے لیے گہرے غور و خوض کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

مصطفیٰ ندیم خاں غوری

پلاٹ نمبر4، زرینہ منزل، ورنداون کالونی، قدیم جالنہ، مہاراشٹر

'اردو دنیا' مارچ 2014 کے مطابق 3 مارچ کو 'یوم اردو' منانے کی قومی اردو کونسل کی تجویز معقول ہے کیونکہ یہی تاریخ طوطیِ ہند حضرت امیر خسروؒ کی تاریخ ولادت ہے اسی مناسبت سے اس شمارے کو حضرت امیر خسرو کی سوانح حیات پر لکھی گئی چار عمدہ کور اسٹوریز سے مزین کیا گیا ہے جن میں معلومات کا خزینہ درج ہے۔ ظ انصاری/ ابوالفیض سحر (مرحوم) کے مضمون میں حضرت امیر خسرو کے حالات زندگی اور تاریخی و سماجی ماحول کو نہایت گہرائی و گیرائی سے پیش کیا گیا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کور اسٹوری بعنوان 'ہندوی کا نقاشِ اوّل امیر خسرو' اہمیت رکھتی ہے اس میں امیر خسرو کے کلام کی باریکیوں اور لسانی رموز سے عالمانہ انداز میں روشناس کرایا گیا ہے۔ کرشن بھاوک کے امیر خسرو پر لکھے مضمون میں دو باتیں کسی قدر کھٹکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ غلط تراجم کا بیان (ص 18) مضمون کے تسلسل میں بے محل اور بے ربطی کا موجب محسوس ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ مضمون میں اِس پیراگراف کی شمولیت سے مصنف کا منشا کیا ہے؟ دوسرے یہ عبارت کہ ''...امیر خسرو کے سامنے سجدہ کرنے کے بعد ہی اولیا کے حضور میں جایا کرتے ہیں۔'' (ص 21) ہم نے دیکھا کہ مدینہ شریف میں یہ کیفیت نہیں ہوتی چنانچہ عقیدت اور عقیدہ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ عقیدہ کے تحت سجدہ صرف خدا کو ہی کیا جاسکتا ہے۔ اب عقیدت میں اگر یہ کیفیت طاری ہوتی ہو تو اِس میں احتیاط بہرحال لازمی ہے کیونکہ مصنف نے جو دیکھا سو لکھا۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد نے حضرت امیر خسرو سے متعلق سوانحی واقعات کا تسلسل عیسوی سنین اور ان سے مطابقت رکھنے والے ہجری سنین میں بڑے ہی دلآویز انداز میں پیش کیا ہے جس میں حضرت امیر خسروؒ کی رزم و بزم کی صلاحیتیں نمایاں ہیں اُنھوں نے بڑے بڑے واقعات کو تاریخی تسلسل سے چھوٹی چھوٹی مگر واضح عبارتوں میں بڑی ندرت سے مندرج کرکے ایک لاثانی شاہکار کی تشکیل کی ہے جو ہر خامی و کوتاہی سے مبرا ہے۔

رضوان الرضا رضوان علیگ

عبدالعلی طبیہ کالج کٹولی ملیح آباد، لکھنؤ

مارچ کا شمارہ 'اردو دنیا' بہت اہم ہے اس میں ہندوستانی تاریخ زبان و ادب تہذیب و ثقافت کا ذخیرہ ہے۔ اداریہ سے لے کر حضرت امیر خسرو، مولانا محمد حسین آزاد، ذوق دہلوی، قرۃ العین حیدر، امداد امام اثر اور رام لعل سے متعلق صرف شمارے کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے 'ہندوی کا نقاش اوّل' بڑے ہی مدلل انداز میں اشعار کی توضیح اور مثالوں سے تحریر فرمایا ہے۔ کرشن بھاوک کے مضمون میں گل اور پھل، جاندار ذی روح مویشی اور طائر، جوگی ساحر حکمراں اور فنکار، دہلی سے لاانتہا محبت، اودھ کی سرزمین ملبوسات، وضع قطع، تہذیب و تمدن، دہلوی ہندی سے محبت موسیقی اور ہندوستان کے مغنی پرندے، جیسے ذیلی عنوانات کے تحت مختلف مضامین کی نیرنگیاں اپنا حسن بکھیر رہی ہیں جس سے

امیر خسرو کی ہمہ جہت شخصیت نمایاں ہو رہی ہے۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے قرۃ العین حیدر سے متعلق اپنی داستان میں جوان کی داستان رقم کی ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ جناب امتیاز عالم کا تحریر کردہ مقالہ 'امداد امام اثر کی انگریزی شاعری' یقیناً ایک اہم بازیافت ہے جسے کئی خطوط، تذکرے اور نظم کے ترجمے سے مثال دے کر مدلل بنایا گیا ہے۔ رام لعل اردو کے نامور افسانہ نگاروں میں تھے۔ امیر خسرو کے ایک شعر کا ترجمہ ہے "مثل مشہور ہے کہ جس کے پاس ہنر زیادہ ہے اس کی روزی کم ہوتی ہے" یہ صرف رام لعل ہی کے لیے نہیں بلکہ بہت سے ایسے ادیب و شاعر کے لیے بھی صادق آتا ہے۔

فلک فیروز

کشمیر یونیورسٹی، سری نگر

مارچ 2014 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ شمارے کے سرورق پر 'امیر خسرو اور یوم اردو' رقم کیا ہوا پایا تو دل نے چاہا کہ ایک ہی نشست میں پورے رسالے کا مطالعہ کر بیٹھوں۔ 'ہماری بات' کے عنوان سے خواجہ اکرام صاحب کی تحریر پڑھی جس میں امیر خسرو سے متعلق مدلل جانکاری تھی نیز خسرو کے یوم پیدائش 3 مارچ کو 'یوم اردو' کے بطور منانے کی سرکاری منظوری کا ذکر بھی تھا جو کہ ایک خوش آیند بات ہے۔ گوپی چند نارنگ کا مضمون خاص نوعیت کا تھا۔ حمید سہروردی سے مصاحبہ کافی اطلاعاتی تھا۔ قرۃ العین حیدر کے 'فن اور زندگی' سے متعلق ابوالکلام قاسمی کا مضمون 'بڑا ہے درد کا رشتہ' رسالے کی زینت اور شان و جان تھا۔ ادارہ 'یوم اردو' کی تجویز حکومت کو پیش کرنے اور حکومت کی منظوری ملنے کے لیے مبارکباد کا مستحق ہے۔

یعقوب الرحمن

ایوب محل، مہاراشٹر

مارچ کے شمارے میں پروفیسر حمید سہروردی صاحب سے عبدالحی کی ملاقات کے اقتباسات پڑھ کر تشنگی بڑھ گئی۔ کیا اچھا ہوتا کہ مکمل انٹرویو شائع کیا جاتا۔ پچھلے دنوں حمید سہروردی صاحب اور ڈاکٹر عبدالمجید بیدار صاحب یہاں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے تشریف لائے۔ بڑا لطف رہا۔ بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ ایک سوال کے جواب میں سہروردی صاحب نے کہا کہ "اردو کا مسئلہ تہذیبی نہ ہو کر سیاسی ہوگیا۔ اب سیاسی حربے استعمال کرنے ہوں گے۔" ڈاکٹر سہروردی صاحب اردو کے شاعر و ادیب ہی نہیں بلکہ اردو دوست بھی ہیں۔ حضرت امیر خسروؒ سے متعلق مضامین پسند آئے۔ انتخاب کے لیے مبارکباد قبول کیجیے۔ عبدالقدوس صاحب نے ای اردو بکس کے تحت ہم جیسوں کے لیے بہت سی کام کی باتیں کی ہیں۔ 'تبصرہ و تعارف' کا کالم ہمیشہ کی طرح جاندار ملک بھر میں اردو سرگرمیوں کے تحت کیا ہو رہا ہے احقر کے لیے یہ جاننے کا ذریعہ 'خبرنامہ' ہے۔

محمد دانش

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

'اردو دنیا' مارچ 2014 کا شمارہ بہت خوب، سرورق کی تصویر خوبصورت اور اس پر لکھی ہوئی تصویر دیدہ زیب ہے جو خسرو اور اردو کے دلکش رشتوں کو واضح کرتی ہے۔ بطور طالب علم بی اے اردو سال آخر میری پہلی پسند مشمولات میں ان مضامین کو دیکھنا ہوتی ہے جن کا تعلق کسی قدر میرے نصابی مضامین سے ہوتا ہے جنھیں پڑھ کر ادب کی بے شمار معلومات اور علم و آگہی سے واقف ہوتا ہوں۔ ادبی مباحث میں ایم اے حق کا مضمون 'افسانچوں کی عالمی گونج' اور اس کے فوراً بعد امتیاز عالم کا مضمون 'امداد امام اثر کی انگریزی شاعری' یہ دونوں مضامین کافی وقیع اور معلومات افزا ہیں۔ اثر کی انگریزی شاعری کے حوالے سے امتیاز صاحب نے بہت خوب لکھا ہے جو کہ ادب کی نئے طالب علموں کے لیے تحقیق و جستجو کے لیے نئے زاویے فراہم کرتا ہے۔ امداد امام اثر کی ادبی حیثیت، زبان دانی اور جمالیات فن سے میں کافی متاثر تھا چونکہ ابھی دو چند مہینے پہلے ہی ان کی کتاب کاشف الحقائق پڑھی تھی۔ اس لیے مضمون کا ہر جملہ میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا۔

سلمان جونپوری

23، اقرا ڈپلیکس، نارول، وٹوا روڈ، احمد آباد

مارچ 2014 کا شمارہ 'اردو دنیا' موصول ہوا۔ ادارے نے حضرت امیر خسرو کے یوم پیدائش پر کور اسٹوری کا موضوع امیر خسرو کے نام کر کے بہترین علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے۔ مدیر محترم کی تحریر ہماری بات بہت معلوماتی ہے۔ اردو ادب کے کہنہ مشق نقاد و ادیب گوپی چند نارنگ صاحب کا مقالہ 'ہندوی کا نقاش اول امیر خسرو' پسند آیا امیر خسرو پر بقیہ مشمولات بھی بہت خوب ہیں۔ اردو کی منفرد ناول نگار اور دانشور قرۃ العین حیدر پر محترم ابوالکلام قاسمی نے 'بڑا ہے درد کا رشتہ' اچھے انداز سے سپرد قلم کیا ہے۔ اردو دنیا کا خبرنامہ بھی بہت معلوماتی ہیں جس سے اردو کے بارے میں اہم خبریں ملتی ہیں۔

شکیل سہسرامی

یوایس بی ایل سی پٹنہ 15

مارچ 2014 کا اردو دنیا زیر مطالعہ ہے۔ اس رسالے کی یہی خاصیت ہے کہ اس کی ایک چیز کئی کئی بار پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ کچھ بات براہ راست سمجھ میں آجاتی ہے اور کچھ ذہن پر زور ڈالنے کے باوجود بھی سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ صفحہ نمبر 5 پر سات سطروں پر محیط ادارے کی گزارش ہم جیسے مکتوب نگاروں کے لیے تازیانۂ عبرت ہے جو مکتوب کو مضمون بنا دیتے ہیں اور غیر ضروری باتوں سے قارئین کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ آپ کی گزارش سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایک قاری اگر ایک چیز کو دل لگا کر پڑھے اور صرف اسی کے بارے میں ایک مختصر مضمون اور اپنی رائے متعین کرے تو ایک صحت مند تنقید سامنے آسکتی ہے۔ جو مکتوب کی صورت میں ہوگی جو ہر آئندہ شمارے کا ایک بولتا آئینہ ہوگی۔ میرا مشورہ ہے کہ ادارہ اس بہترین گزارش کا برابر اعادہ کرتا رہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اچھا رہے گا۔

محمد ابراہیم نثار

متعلم مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ماہ نامہ 'اردو دنیا' کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق یوم خسرو اور اردو کو پڑھ کر بہت مسرت حاصل ہوئی۔ اسے دیکھنے اور پڑھنے کے بعد میں سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ ہندوستان کا کوئی بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا شاعر ادیب صوفی، ولی، پیر و مریدان کا کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طور اردو زبان سے واسطہ ضرور رہا ہے انھیں میں سے امیر خسرو بھی ہیں اگرچہ کہ یہ فارسی زبان کے شاعر شمار کیے جاتے ہیں مگر اردو زبان سے بھی ان کا تعلق رہا ہے، اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان قابل مبارکباد ہے کہ اس نے ان معماران اردو زبان کو کبھی نظرانداز نہیں کیا ہے۔ قلم کار اپنے مضمون کے ذریعے خراج عقیدت پیش کرتے ہیں گوپی چند نارنگ جنھوں نے امیر خسرو کو ہندوی کا نقاش اول کیا ہے۔ اس شمارے میں امیر خسرو گوشہ کے علاوہ بیسویں صدی کی اہم افسانہ ناول نگار قرۃ العین حیدر کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے اور میں ابوالکلام قاسمی کا ممنون و مشکور ہوں کہ انھوں نے اس مضمون کے ذریعے سے بہت ہی کارآمد باتیں بتائی ہیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ، ضلع نظام آباد

فروری 2014 کا شمارہ بروقت ہمدست ہوا۔ شبنم گورکھپوری کے انٹرویو میں زبان و ادب کے وہ سب پہلو آگئے ہیں جس سے عصری دور میں زبان و ادب دوچار ہے البتہ ان کا بہ حیثیت مترجم قارئین کو آگہی حاصل ہوئی۔ مالیگاؤں میں اردو کتاب میلہ کی رپورٹ قابل ستائش ہے۔ جس میں ہر دن کی تفصیل سے رپورٹ اور سرگرمیوں کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اس طرح کے کتاب میلے ہندوستان کی دیگر

ریاستوں میں منعقد کیے جائیں تاکہ اردو کے تئیں بیداری پیدا ہوسکے۔ صدی تقاریب کے تحت جاں نثار اختر اور غلام ربانی تاباں کی زندگی اور کلام کے نمونہ کو پیش کیا گیا اور ان پر تنقیدی مضامین و گوشے شائع ہوئے یہ اچھا عمل، تاکہ نئی نسل ان ادیبوں و شاعروں کے کارناموں سے واقف ہوگی۔ ترنم ریاض نے آفتاب تنقید کی تخلیقی ضیا وارث علوی پر وارث علوی کی تنقید اور ادب میں ان کا نظریہ سے بحث کی ہے۔ وارث علوی نے ادب میں سب سے الگ و منفرد راہ نکالی۔ دیگر مشمولات بھی معلومات سے پر ہیں۔ فاروق شیخ کا اچھا تعارف ہے۔ انھوں نے اردو تہذیب و زبان کو عام کیا اور اپنا وقت اردو زبان و ادب کے لیے وقف کا۔ دیگر حصے بھی معیاری اور فکر انگیز ہیں۔

ایس ایس علی

اکولہ (مہاراشٹر)

ماہنامہ 'اردو دنیا' فروری 2014 کے اداریے اور کور اسٹوری کے مضامین کے ذریعے آپ نے ہم مہاراشٹر کے باشندوں کو خوشی و انبساط سے ہم کنار کیا ہے۔ ہر چند کہ صفحہ 4 پر آپ کی ہدایت کہ شمارے کی صرف تعریف و توصیف ہی نہ کی جائے، پیش نظر ہے، لیکن فرطِ جذبات سے مغلوب ہونا، فرطِ مسرت سے آنکھوں کا نم ہونا، قلم کو بے اختیار اٹھا کر قلبی کیفیات کو سپردِ قرطاس کرنا، یہ سب بے اختیاری باتیں ہیں، اور ان کا اظہار ناگزیر ہے۔ مالیگاؤں کا کتاب میلہ علاقائی ہونے کے باوجود اس نے قومی میلوں کے گزشتہ تمام ریکارڈز توڑ دیے اور صرف دس دنوں میں 87 لاکھ روپے کی اردو کتابیں فروخت ہوئیں۔ کوئی 20 سال قبل ممبئی کے مشہور ادارے نونیت پبلی کیشنز کے عہدے داران ودربھ کے دورے پر آئے ہوئے تھے۔ یہ ادارہ مراٹھی میں تدریسی مواد فراہم کرتا ہے۔ میں نے ان سے اردو میں بھی اپنی مطبوعات شائع کرنے کی بات کہی تو انھوں نے اردو طلبہ اور ان کے سرپرستوں کی قوتِ خرید کا سوال اٹھایا۔ آج صورتِ حال بالکل بدل چکی ہے۔ ادارہ نونیت اب اردو میں بھی دل کھول کر مواد فراہم کر رہا ہے۔ جناب امتیاز وحید نے مالیگاؤں کتاب میلے کی روداد بڑے خوبصورت انداز میں تفصیل وار قلم بند کی ہے۔ انھوں نے گویا کتاب میلے کی سیر ہی کروادی۔ 'سرزمین ہند کا اردوستان: مہاراشٹر' یہ ہے وہ عنوان جو جناب عبدالحلیم صدیقی نے اپنے مضمون کے لیے تجویز کیا ہے۔ اللہ کرے ان کا یہ یقین صدفی صد صحیح ثابت ہو۔

جفار حسن خاں

گاندھی کالونی، رُدرپور، اُدھم سنگھ نگر، اتراکھنڈ

'اردو دنیا' ماہ فروری 2014 نظر نواز ہوا۔ سرورق

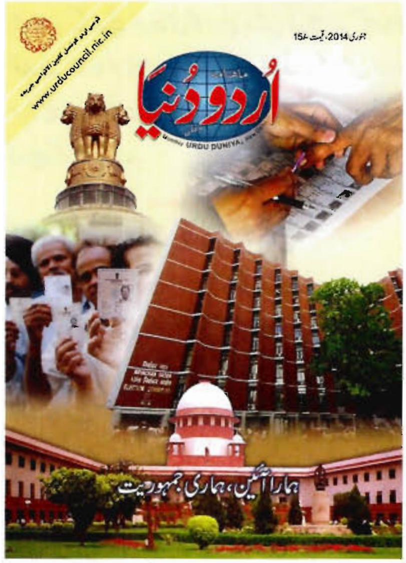

مالیگاؤں میں منعقد اردو کتاب میلے کی تصاویر اور خصوصی گوشہ میں مرحوم جاں نثار اختر اور مرحوم غلام ربانی تاباں کی تصاویر دیکھیں تو اندازہ ہوا کہ اس بار بھی پچھلے شماروں کی طرح بہترین مواد پڑھنے کا شرف حاصل ہوگا۔ اس شمارے میں اشفاق احمد کا شبنم گورکھپوری سے انٹرویو کافی معلوماتی ہے۔ مالیگاؤں اردو کتاب میلے سے متعلق تمام مشمولات اچھے ہیں یہ میلہ فروغِ اردو زبان کا بہترین کارنامہ ہے۔ عارف حسین جونپوری، راشد انور راشد، عبدالحق اور محترمہ خدیجہ آئین کے مضامین مرحوم جاں نثار اختر کے بارے میں کافی اہم معلوماتی ہیں۔ مرحوم جاں نثار اختر کا کلام بھی پڑھنے کو ملا۔ اسی طرح جناب قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، خیر صاحب اور شہپر رسول کے غلام ربانی تاباں پر مضامین بھی اہم ہیں۔ ترنم ریاض کا وارث علوی کے لیے خراج عقیدت بے حد اچھا ہے۔ خراجِ عقیدت کے موضوع پر عتیق اللہ صاحب، شفیع ایوب، غلام شبیر، محمد خلیل، منظر اعجاز اور زبیر رضوی کے مضامین بھی قاری کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔

اعجاز احمد

جوائنٹ سکریٹری، المحمود ایجوکیشنل سوسائٹی، شموگہ

'اردو دنیا' کا شمارہ ہر ماہ اپنی آب و تاب و تمام تر رعنائیوں کے ساتھ مل رہا ہے جس کے لیے میں اور المحمود ایجوکیشن سوسائٹی شیموگہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مشکور و ممنون ہیں۔ فروغِ اردو میں 'اردو دنیا' کا کردار بے مثال ہے۔ قومی کونسل کی کاوشوں کی جتنی بھی تعریف کریں کم ہے۔ 'اردو دنیا' میں 'اردو ادب' اور کئی معلوماتی مضامین نیز خبر نامے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ 'اردو ادب' ہر ماہ قسط وار 'اردو دنیا' کی شکل میں شائع ہو رہا ہے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ 'اردو دنیا' میں ایسے مضامین شائع کریں جس سے اردو اساتذہ کو جدید ترین طریقۂ درس و تدریس سے واقفیت حاصل ہو۔

صادق علی انصاری

'نشیمن' 198 اے شیخ سرائے سیتاپور، یوپی

'اردو دنیا' جنوری 2014 ملا۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ کئی شمارے ایک ساتھ سامنے رکھیے اور پھر یہ سوچیے کہ ان سب میں بہتر شمارہ کون سا ہے تو قطعی یہ طے کر پانا مشکل ہوگا۔ معمول کے مطابق 'ہماری بات' فکر انگیز ہے اور 'آپ کی بات' بھی دلچسپی لیے ہوئے معلوماتی ہے۔ انٹرویو عمدہ ہے۔ راغب اختر نے اچھے اچھے سوالات یاور عباس سے پوچھے ہیں۔ ویسے یاور عباس کے ہمراہ بی بی سی سے وقار احمد اور رضا علی عابدی وغیرہ بھی جڑے رہے ہیں۔ رضا علی عابدی کا بھی تعلق لکھنؤ سے اور جناب وقار احمد کا تعلق سیتاپور سے ہے۔ جرمنی جیسے دو حصوں کا مل کر ایک ہو جانا یاور عباس نے اچھی مثال دی ہے اس سے پاکستان اور ہندوستان کے رہبرانِ سیاست درس لے سکتے ہیں۔ مجاز پر مضمون بھی اچھا لگا۔

ڈاکٹر حاذق فرید

صدر شعبۂ اردو، کرشک کالج پکری برانواں، نوادہ

'اردو دنیا' جلد 16 کا دوسرا شمارہ بہت دنوں بعد پڑھا، بڑی مسرت ہوئی۔ جریدے میں کافی نکھار آ گیا ہے۔ ایسا میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ میرے پیش نظر 'اردو دنیا' (ترقی اردو بیورو) کا وہ شمارہ 1986 بھی ہے جب ڈاکٹر فہمیدہ بیگم بطور نگراں تھیں۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی رسالے کے معیار کو قائم رکھنا بہت بڑی بات ہے یقیناً یہ آپ کی محنت کا پھل ہے اور آپ واقعی ستائش کے مستحق ہیں کیونکہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اب فعال شخصیتوں کے ہاتھوں میں ہے۔ ان میں خصوصی طور پر آپ اظہر من الشمس ہیں۔ آپ تحریری ہی نہیں بلکہ جسمانی طور پر بھی محفلوں میں نظر آتے ہیں۔ میری مراد صرف مالیگاؤں کے اردو کتاب میلے سے نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے کسی بھی شہر میں مشاعرہ ہو یا ورک شاپ، ادبی سیمینار ہو یا تعزیتی نشست اور رسم اجرا ہو یا کیلی گرافی آرٹ کی نمائش، ہر جگہ آپ کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کافی فعال اور انرجیٹک ہیں۔ خدا کرے اس شعبے میں آپ زیادہ سے زیادہ دنوں تک رہیں تاکہ اردو ادب کی جو آب یاری ہو رہی ہے وہ ہوتی رہے۔ اس شمارے میں 'دو شاعر ایک صدی' (نصرت ظہیر صاحب) کے تحت جاں نثار اختر اور غلام ربانی تاباں کے خصوصی گوشے میں راشد انور راشد، عبدالحق، رؤف خیر اور شہپر رسول کے مقالے اور انتخابِ کلام کافی اچھے ہیں اس کے لیے ادارہ اور متذکرہ مقالہ نگار مبارکباد کے مستحق ہیں۔

■

شفیع ایوب

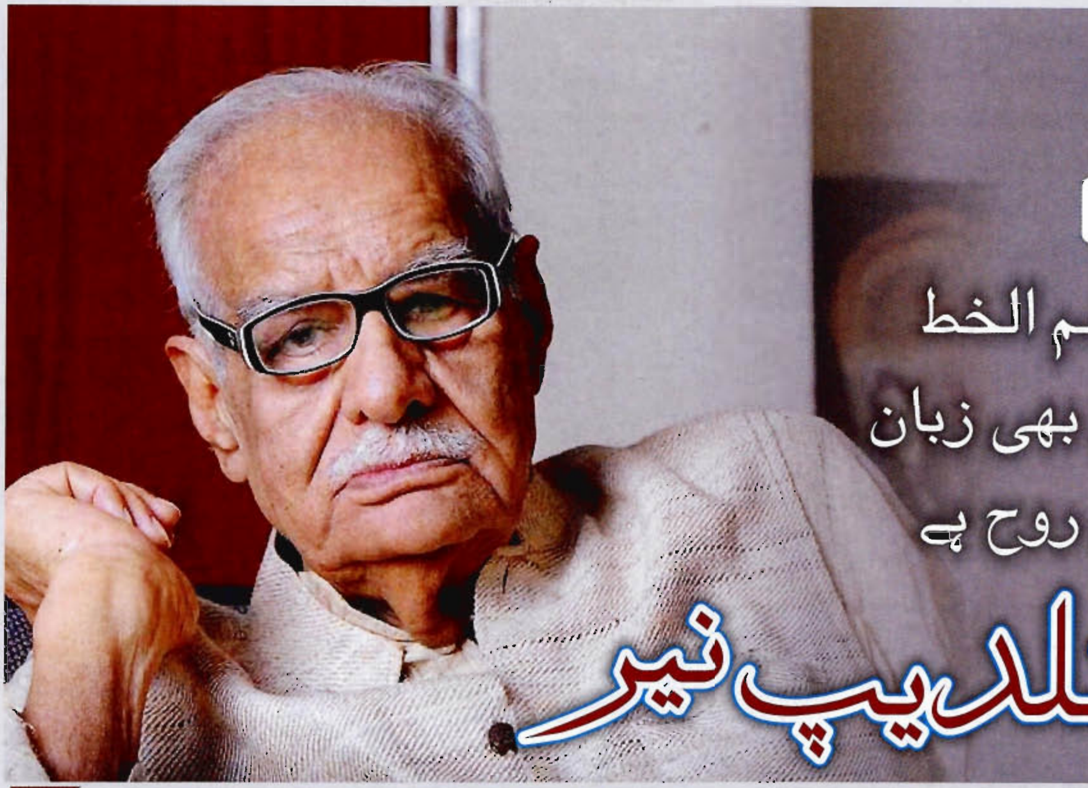

رسم الخط کسی بھی زبان کی روح ہے

کلدیپ نیر

کلدیپ نیّر ملک کے مشہور و معروف مفکر ، دانشور اور صحافی ہیں۔ ایک ایسے صحافی جن پہ خود صحافت ناز کرسکتی ہے۔ 14اگست 1924 کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے کلدیپ نیّر نے اپنی نوے (90) سالہ زندگی میں بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ لیکن حق و صداقت کی آواز بلند کرنے میں انھوں نے کبھی کوتاہی نہیں برتی۔حق گوئی و بیباکی کے لئے قیمت بھی چکانی پڑی ،جیل بھی گئے لیکن قلم کی حرمت پہ کبھی آنچ نہیں آنے دی ۔کلدیپ نئیر ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور سیکولرزم کے سب سے بڑے علمبرداروں‌میں سے ایک ہیں۔ 1947میں وہ آگ کا دریا پار کر کے سیالکوٹ سے دلّی پھنچے تھے۔انھوں نے ہندوستان کو آزاد ہوتے دیکھا ۔ملک کی تقسیم اور تقسیم کے بعد پھوٹ پڑنے والے فسادات دیکھے ، گاندھی جی کو دھلی کے برلا ھائوس میں یہ کھتے سنا کہ ہندو اور مسلمان میری دو آنکھیں ہیں۔

کلدیپ نیّرگوبند بلّبھ پنت اور لال بھادر شاستری کے پریس سکریٹری کے علاوہ برطانیہ میں ہندوستان کے سفیر اور راجیہ سبھا کے ممبر رہے ۔انسان دوستی اور سیکولرزم پر ایمان رکھنے والے کلدیپ نیّر اردو کے عاشق ہیں۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز اردو اخبار 'انجام' سے کیا تھا۔ ان کا یہ جملہ بھت مشھور ہے کہ میری صحافتی زندگی کا آغاز ھی انجام سے ھوا۔ انکا مستقل کالم انگریزی میں بیٹوین دی لائینس اور اردو میں بین السطور کے نام سے شائع ھوتا ہے۔ انکا یہ کالم بیک وقت چودہ زبانوں میں شائع ھوتا ہے اور اس کی اشاعت کو پچاس سال پورے ھو چکے ھیں۔ آج بھی بیحد چاق چوبند، باخبر کلدیپ نیّر مستقل لکھ رہے ھیں۔جواھر لال نھرو یو نی ورسٹی، میں ماس میڈیا کے استاد ڈاکٹر شفیع ایوب نے اردو دنیا کے لیے جناب کلدیپ نیّر سے تفصیلی گفتگو کی۔ جس کے اقتباسات پیش خدمت ھیں (ادارہ)

شفیع ایوب: نیرصاحب سب سے پہلے ہم آپ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں جاننا چاہیں گے اس تعلق سے کچھ فرمائیں:

کلدیپ نیر: میری پیدائش 14 اگست 1924 کو سیالکوٹ میں ہوئی۔ میرے والد ڈاکٹر گروبخش سنگھ پیشے سے ڈاکٹر تھے۔ والدہ پورن دیوی گھریلو خاتون تھیں۔ میری ایک بہن اور چار بھائی تھے۔ سب سے چھوٹا بھائی سندھو بچپن میں ہی مالک حقیقی سے جا ملا۔ تقسیم وطن کے وقت میری بہن جمشید پور میں رہ رہی تھی۔ میری ماں سکھ تھیں اور والد ہندو۔ ان دنوں ہندوؤں اور سکھوں میں شادی بیاہ کا خوب رواج تھا۔ میرے والد کا شمار سیالکوٹ کے معزز لوگوں میں ہوتا تھا۔ میری ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں اور پھر اعلی تعلیم لاہور کے فارمن کرشچین کالج اور لا کالج میں ہوئی۔

ش الف: سیالکوٹ سے ہجرت کر کے دہلی کب آئے؟

کلدیپ نیر: میں 13 ستمبر 1947 کو دہلی پہنچا۔ سیالکوٹ سے دہلی تک راستے میں ہزاروں انسانی لاشیں دیکھتا ہوا۔ ہر طرف افراتفری کا عالم۔ انسان، انسان نہیں درندہ بن چکا تھا۔ میں اکیلے ہی کسی طرح دہلی پہنچا تھا۔ 120 روپے کی کل پونجی کے ساتھ، جو سیالکوٹ سے چلتے وقت میری ماں نے مجھے دیے تھے۔ بعد میں میرے ماں باپ اور دوسرے بھائی بھی کسی طرح جان بچا کر پہلے جالندھر اور پھر دہلی پہنچے۔ میں نے دہلی میں ماں کے دیے ان ایک سو بیس روپیوں سے اپنی نئی زندگی کا

آغاز کیا۔

ش الف: صحافت کی دنیا میں کیسے آئے؟

کلدیپ نیر: زندگی بھی عجیب تماشہ دکھاتی ہے۔ میں نے بی اے میں فارسی پڑھی تھی۔ اردو سے خوب واقف تھا۔ ان دنوں تعلیم اردو میں ہوا کرتی تھی۔ ایل ایل بی کیا کہ وکیل بنوں گا۔ سول سروسیز میں جانا چاہتا تھا، امتحان دیا، ناکام رہا۔ دہلی پہنچ کر نوکری کی تلاش میں تھا۔ پرانی دلّی میں ایک اردو پریس کو ملازم کی ضرورت تھی۔ میں نے درخواست دی۔ نوکری مل گئی اور اس طرح میری صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس اخبار کا نام انجام تھا۔ اسی لیے میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ میں نے اپنی صحافت کا آغاز انجام سے کیا۔

ش الف: پھر اردو سے انگریزی صحافت کی طرف کیسے رخ کیا؟

کلدیپ نیر: بھئی میں نے حسرت موہانی کے مشورے پر عمل کیا۔ ان دنوں مولانا حسرت موہانی بھی پرانی دلّی کے بلّیماران میں رہا کرتے تھے۔ ان سے اکثر ملاقات ہوتی۔ مولانا بیحد شفقت فرماتے تھے۔ مجھے کچھ شاعری کا بھی شوق تھا۔ ایک روز میں اپنی بیاض لے کر مولانا حسرت موہانی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اپنی شاعری بغرض اصلاح ان کو دکھائی۔ مولانا نے کہا یہ شاعری نہیں، تک بندی ہے۔ مولانا بولے کلدیپ میں تم کو دو نصیحت کرتا ہوں۔ شاعری ترک کر دو اور اردو کے بجائے انگریزی صحافت میں قسمت آزمانے کی کوشش کرو۔ میں نے مولانا کی دونوں نصیحت مان لی۔ شاعری ترک کر دی۔ اور انگریزی صحافت کی اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا چلا گیا۔ ان دنوں امریکہ جانا آسان تھا۔ وہاں میں نے صحافت میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔

ش الف: کس طرح کی شاعری کرتے تھے؟ اپنا کوئی شعر یاد ہے اب تک؟

کلدیپ نیر: جس سیالکوٹ نے علاّمہ اقبال اور فیض احمد فیض کو پیدا کیا اسی سیالکوٹ کی دھرتی پر یہ ناچیز بھی پیدا ہوا، پلا بڑھا۔ چند مصرعے جو ابھی تک یاد ہیں آپ بھی سن لیں:

انھیں دیکھ کر ہم عبادت کو بھولے
جو دیکھا انھیں تو عبادت بھی کر لی
خدایا اب تو بلا لو قرب میں
گناہوں سے ہم نے تو توبہ بھی کر لی

ش الف: آپ نے علاّمہ اقبال کو دیکھا تھا؟ ان کو کلام پڑھتے یا تقریر کرتے سنا تھا؟

کلدیپ نیر

نام: کلدیپ نیر (بچپن کا نام کلدیپ سنگھ)
پیدائش: 14 اگست 1924 سیالکوٹ (اب پاکستان)
تعلیم: بی اے آنرس (فارسی)، ایل ایل بی، ایم ایس سی (جرنلزم) امریکا
والدین: ڈاکٹر گروبخش سنگھ اور پورن دیوی
اہلیہ: محترمہ بھارتی نیر (جسٹس راجندر سچر کی ہمشیرہ)
اولادیں: دو بیٹے سدھیر اور راجیو
تصانیف: بیٹوین دی لائینس، دی کریٹیکل ایرس، ڈسٹنٹ نیبرس، انڈیا آفٹر نہرو، دی ججمنٹ، رپورٹ آن افغانستان وغیرہ
انعامات و اعزازات: بلدی گھاٹی ایوارڈ، فریڈم آف انفارمیشن ایوارڈ، عبدالسلام انٹرنیشنل اینڈ کناڈین ٹائمس ٹرسٹ ایوارڈ، لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن ایوارڈ، لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ ان جرنلزم وغیرہ

کلدیپ نیر: سیالکوٹ میں میرا جگری دوست شفقت مجھے ایک دن اقبال کے گھر لے گیا۔ گرمی کے دن تھے۔ اقبال باہر چارپائی پہ بیٹھے تھے۔ اونچی آواز میں کسی کو ڈانٹ رہے تھے۔ ہم دونوں ڈر کے واپس بھاگ آئے۔ بعد میں جب لاہور میں ڈاکٹر اقبال کو سنا اس وقت وہ شاعر مشرق علاّمہ اقبال بن کر لوگوں کے دلوں پہ راج کر رہے تھے۔ وہ اپنا کلام سناتے یا تقریر کرتے ان کی بلند آہنگی میں بڑی دل آویزی ہوتی تھی۔

ش الف: کچھ فیض احمد فیض کے بارے میں؟

کلدیپ نیر: فیض صاحب بڑے پیارے انسان تھے۔ ان سے بہت ملاقاتیں رہیں۔ پاکستان میں، یہاں دہلی میں، دوسرے ملکوں میں بھی۔ فیض صاحب نجی محفلوں میں بھی کم بولتے تھے۔ ان کی آنکھیں زیادہ بولتی تھیں۔ شام کا وقت بادہ نوشی کے نام ہوتا تھا۔ فیض جیسے لوگ کسی کے دشمن نہیں ہوتے، سب کے دوست ہوتے ہیں۔ جن سے نظریاتی اختلافات تھے ان سے بھی ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے فیض صاحب۔ فیض جتنے بڑے شاعر تھے اس سے بڑے انسان تھے۔

ش الف: دہلی میں اردو کے کن صحافیوں سے آپ کے تعلقات رہے؟

کلدیپ نیر: کئی اہم اور محترم نام ہیں۔ وہ اردو پہ برا وقت تھا۔ ایک پیاری زبان اپنے ہی ملک میں دربدری کا شکار ہوگئی۔ اس زمانے میں علی گڑھ پہ میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اسے سب نے پسند کیا۔ میں اسٹیٹس مین کا ایڈیٹر تھا۔ مولانا عبدالوحید صدّیقی میرے پاس آئے۔ بڑی شفقت سے ملے۔ میری حوصلہ افزائی کی۔ محمد مسلم صاحب تھے دعوت اخبار میں۔ ان سے بھی نیازمندانہ تعلقات تھے۔ بعد میں شاہد صدّیقی اور م افضل نے اردو صحافت کے میدان میں بڑا کام کیا۔

ش الف: ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کو آپ کس طرح یاد کرتے ہیں؟

کلدیپ نیر: مولانا آزاد 1945 میں لاہور آئے تھے۔ میں تب لا کالج میں تھا۔ میں نے انھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن میں ان کی سوجھ بوجھ اور ہمّت کی قدر کرتا تھا۔ جب فرقہ پرستی کی آندھی بڑے بڑے رہنماؤں کو اپنے ساتھ بہالے جارہی تھی تو وہ اپنی جگہ پر چٹّان کی طرح کھڑے رہے تھے۔ لمبے، اونچے اور تراشی ہوئی داڑھی والے آزاد نے چست اچکن اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ وہ واقعی کسی دانشور کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ سامعین میں ایسے مسلمانوں کی بھیڑ تھی جو جاننا چاہتے تھے کہ مسلمان ہوکر بھی وہ پاکستان کی مخالفت کیوں کر رہے تھے۔ ان کی خالص اردو سن کر میں کھل اٹھا۔ ان کی تقریر کیسی پر تاثیر تھی، اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب وہ ختم ہوئی تو لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

آزادی کے بعد جب مولانا آزاد ملک کے وزیر تعلیم بنے تب بھی میری ملاقات ہوتی رہی۔ آزادی کے بعد کے زمانے میں عام مسلمانوں کے تئیں غصّے کے باوجود ہندو مولانا آزاد کی عزت کرتے تھے۔ جب مولانا آزاد کا انتقال ہوا تو ان کے گھر کے باہر رات بھر غیر مسلموں کی لمبی قطار دیکھنے کو ملی۔ ملک کے اس عظیم سپوت کو خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں میں بھی شامل تھا۔ مولانا آزاد کی قبر کے لیے جواہر لال نہرو نے جامع مسجد کے پاس خود ایک جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ مولانا آزاد اپنے پیچھے کتابوں اور کاغذات کے بنڈل کے بنڈل چھوڑ گئے تھے۔ میں نے انھیں حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن کامیابی نہیں ملی۔ مولانا کا انتقال ہوا تو ان کے گھر میں نہ کوئی رقم تھی نہ ان کے بینک اکاؤنٹ میں کوئی رقم۔ صرف کتابوں اور کاغذات کے بنڈل تھے۔ اب سے کوئی چالیس سال پہلے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ کاغذات آزاد کے نجی سیکریٹری اجمل خان کے خاندان کے پاس ایک ٹرنک میں موجود تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی ان کاغذات تک پہنچ سکے اور انھیں ملکی وراثت کی طرح سنبھال کر رکھا

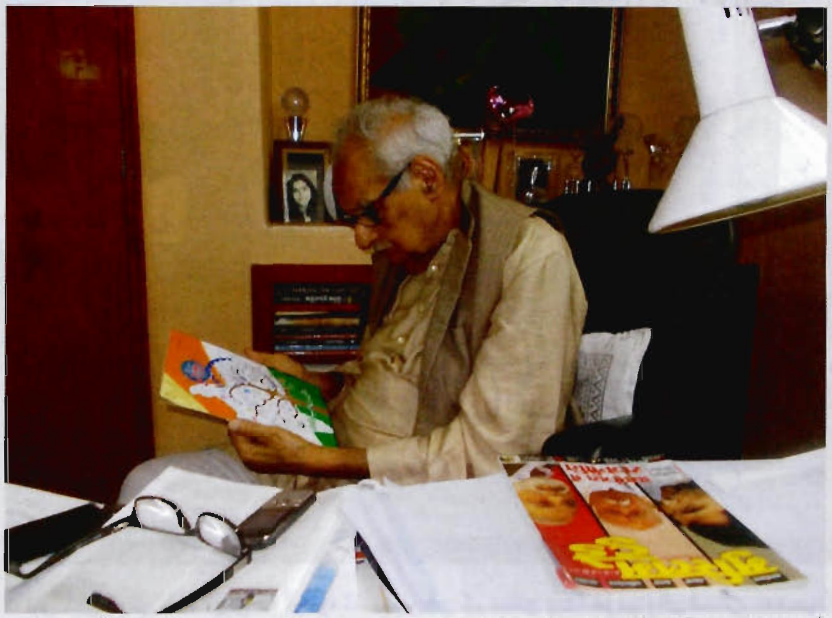

جا سکے۔

ش الف: کچھ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بھی فرمائیں۔

کلدیپ نیر: میری اہلیہ بھارتی کانگریس کے ایک بڑے لیڈر بھیم سین سچّر کی بیٹی اور لاہور میں میرے کالج کے دنوں کے دوست راجندر سچّر کی بہن ہیں۔ میری شادی کے کئی برس بعد راجندر نے بھی میری بہن راج سے شادی کی۔ راجندر نے حکومت ہند کے حکم پر بھارت میں مسلمانوں کے حالات کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کی تھی، جسے سچّر کمیٹی کی رپورٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ میرے دو بیٹے ہیں سدھیر اور راجیو۔ دونوں بہوؤں کے نام کویتا ہیں۔ کنیکا، مندرا اور کارتک میرے پوتے پوتیوں کے نام ہیں۔ سب خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔

ش الف: آپ کے مذہبی عقائد ؟

کلدیپ نیر: انسانیت میرا مذہب ہے۔ مذہبی رسوم کا پابند نہیں۔ سبھی مذاہب کا احترام کرتا ہوں۔ ہاں میری اہلیہ مذہبی رسومات میں یقین رکھتی ہیں۔ ملک کے ہر چھوٹے بڑے مندر میں اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹ کر لے جاتی رہی ہیں۔

ش الف: آپ نے گوبند بلّبھ پنت اور لال بہادر شاستری کے ساتھ بھی کام کیا ہے...

کلدیپ نیر: دونوں کا مزاج الگ تھا۔ پنت جی کا رعب ودبدبہ زیادہ تھا۔ ان کے ساتھ بطور پریس سیکریٹری کام کیا۔ وہ اپنی عوامی پہچان کو لے کر بے حد محتاط رہتے تھے۔ کسی اخبار میں ان کے بارے میں کچھ غلط چھپ جائے تو پریشان ہو جاتے تھے۔ ان دنوں وہ ملک کے وزیر داخلہ تھے۔ خود بہت محنت اور ایمانداری سے کام کرتے تھے اور اپنے اسٹاف سے بھی سخت کام لیتے تھے۔

لال بہادر شاستری بیحد نرم دل اور عاجزی و انکساری والے انسان تھے۔ ایمانداری اور عوامی زندگی میں شفافیت کے بڑے حمایتی۔ غیر ملکی دوردں میں ہوٹل کے کمرے میں اپنا کھانا خود پکاتے ہوئے میں نے انھیں دیکھا تھا۔ تاشقند میں پاکستان کے جنرل ایوب خان اور شاستری کے درمیان معاہدہ ہوا۔ میں اس وقت شاستری کے ساتھ تھا۔ جس رات لال بہادر شاستری کا انتقال ہوا میں اسی ہوٹل میں موجود تھا۔ اگلی صبح کی فلائٹ سے ہمیں وطن واپس آنا تھا۔ لیکن رات کے دو بجے دروازے پر دستک ہوئی اور روسی دربان نے بتایا کہ تمھارے وزیر اعظم کو کچھ ہو گیا ہے۔ میں بھاگتا ہوا شاستری جی کے کمرے میں پہنچا تو وہ اس دنیا سے جا چکے تھے۔ سامنے ٹیبل پر تہہ کر کے رکھے ترنگے پرچم سے میں نے شاستری جی کے جسد خاکی کو ڈھک دیا۔

ش الف: ہند پاک دوستی کے لیے آپ ہمیشہ کوشاں رہے۔ آپ کی کوششوں کا کیا نتیجہ نکلا؟

کلدیپ نیر: ہندوستان اور پاکستان کی دوستی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ان دونوں ملکوں کے رشتے بہتر رہیں اس کے لیے میں نے بھی اپنا رول ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم سب کچھ اہل سیاست کے حوالے نہیں کر سکتے۔ دونوں ملکوں کے عوام امن چاہتے ہیں۔ عوام دوستی اور بہتر رشتہ چاہتے ہیں۔ جنگ خود ایک مسئلہ ہے۔ دونوں ملک ایٹمی طاقت ہیں۔ جنگ دونوں ملکوں کو تباہ کر دے گی۔ دونوں طرف کچھ انتہا پسند لوگ ماحول خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں امن کی کوشش کو تیز کرنے کی ضرورت ہے۔

ش الف: آپ تو پاکستان اکثر جاتے رہے ہیں۔ وہاں آپ کے چاہنے والوں کی بڑی تعداد ہے۔ لوگوں کا کیا ردّ عمل ہوتا ہے؟

کلدیپ نیر: وہاں لوگوں کا پیار دیکھ کر میں سوچتا ہوں کہ آخر وہ کیا وجوہات تھیں کہ لوگ ایک دوسرے کے دشمن بن بیٹھے تھے۔ میں ہر سال 14 اور 15 اگست کی درمیانی شب میں واگھا بارڈر پہ جاتا ہوں۔ وہاں دونوں ملکوں کے لوگ میرے ساتھ مل کر موم بتّی جلا کر عہد کرتے ہیں کہ ہر حال میں امن قائم رکھا جائے گا۔ آج جو لوگ نفرت پھیلا رہے ہیں وہ نہیں جانتے کہ نفرت کی فصل بو رہے ہیں۔ وہ وطن سے غدّاری کر رہے ہیں۔ ہم نفرت کی فصل کاٹ چکے ہیں۔ خدارا اب امن کی بات کرو۔

ش الف: ہندوستان میں اردو کا مستقبل آپ کیسا دیکھتے ہیں؟

کلدیپ نیر: مجموعی صورت حال پہلے کے مقابلے بہتر ہے۔ شفیع ایوب آپ اور آپ کی نسل کے لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ 1947 کے بعد کے زمانے میں اردو پہ کتنا برا وقت پڑا تھا۔ یہ اس ملک کی زبان ہے۔ خوبصورت زبان۔ دہلی کے آس پاس پیدا ہوئی اور پلی بڑھی زبان۔ اردو والوں کو فخر ہونا چاہیے کہ وہ اردو والے ہیں۔ یہ تہذیب کی زبان ہے، محبت کی زبان ہے۔ ایک زمانے میں اس زبان کا رسم الخط تبدیل کرنے کی بات سامنے آئی تھی۔ اردو والوں نے اسے نامنظور کر دیا تھا۔ وہ حق بہ جانب تھے۔ رسم الخط کسی بھی زبان کی روح ہے۔ اب یہ قصّہ پرانا ہوا۔ اردو صحافت کی مجموعی صورت حال بھی پہلے سے بہتر ہے۔

ش الف: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی کارکردگی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

کلدیپ نیر: یہ ادارہ اردو کے فروغ کے لیے بہتر کام کر رہا ہے۔ خوبصورت دیدہ زیب رسالہ اردو دنیا نکالتے ہیں۔ کمپیوٹر کے حوالے سے کام کرنے کی ضرورت تھی جسے یہ ادارہ پورا کر رہا ہے۔ موجودہ ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ اکرام الدین نئی سوچ کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ اردو کو نئی تکنیک سے جوڑنے کی جو کوشش ہو رہی ہے اس کے دور رس نتائج برامد ہوں گے۔ قومی کونسل کے لیے میری نیک خواہشات۔

■

Dr. Shafi Ayyub, Center of Indian Languages
SLL & CS, JNU New Delhi - 67

محمد عارف اقبال

اردو کتابوں کی فروخت کا منظر نامہ

(ماضی سے حال تک)

اس میں کوئی شك نهیں كه اردو، تقسیم وطن كے ساتھ پیدا هونے والے لسانی تعصب كی آگ كے ایك بڑے دریاكو پار كرنے كے بعد هندوستان میں ایك بار پھر تهذیب و شرافت كی زبان اور مشتركه قدروں پر مشتمل هندوستانیت كی علامت كے طور پر قبول كی جانے لگی هے، اور وهی آج هم بیشتر هندوستانیوں كے لیے بول چال كی عام بهاشا بھی هے۔ لیكن بات جب بول چال سے آگے بڑھتی هے اور رسم الخط، تعلیم و تدریس اور نشرواشاعت كے میدانوں میں پهنچنے لگتی هے تو اردو كا دائره نه صرف یه كه سمٹتا جاتا هے بلكه آخر ی میدان یعنی پبلشنگ كے شعبے میں وه بنگلا، تمل ، ملیالم اور مراٹھی جیسی علاقائی زبانوں سے بھی پچھڑی هوئی دكھائی دینے لگتی هے۔منشی نول كشور جیسے پروفیشنل، دور اندیش اور زبان و ادب كے گلشن كی هر كیاری كو سینچنے والے عظیم طابع و ناشر كی رهنمائی میں كم و بیش دوسو برس پهلے اپنا طباعتی كاروبار شروع كرنے والی اردو زبان آج كاروباری دنیا كے بڑے اشاعت گھروں سے محروم هو چكی هے۔ اردو كتابوں كا بزنس زیاده تر مذهبی كتابوں كے پروڈكشن تك محدود هو كر ره گیا هے۔ سماج كے جن طبقوں كی مادری زبان اردو هے وه بھی اردو تعلیم كو فروغ دینے اور اردو كی كتابیں خریدنے میں دل چسپی نهیں لے رهے هیں۔ خاص طور سے اتر پردیش اور بهار میں ، جهاں اردو بولنے والے كافی بڑی تعداد میں رهتے هیں ، اردو كتابوں كی نشرو اشاعت كاحال بهت برا هے۔نجی شعبے كے وه پبلشنگ هاؤس جو اردو كی ادبی اور نصابی كتابوں كی اشاعت اور ماركیٹنگ كسی قدر كامیابی كے ساتھ كر رهے هیں اور كسی طرح اس مسابقتی دور میں اپنے وجود كو قائم ركھے هوئے هیں تعداد میں اتنے كم ره گئے هیں كه انهیں گننے كے لیے شاید ایك هاتھ كی دوانگلیاں بھی زیاده پڑجائیں۔ پینگوئن جیسے دنیا كے سب سے بڑے اشاعت گھروں میں شمار هونے والے ادارے نے جب اردو سے اپنا تعلق جوڑا تھا تو امید تھی كه اردو اخباروں كی طرح اردو كتابوں كی دنیا میں بھی خوش آئند تبدیلیاں آئیں گی جس سے اس بیمار صنعت كوایك صحت مند زندگی مل سكے گی۔ مگر افسوس، كاپی رائٹ كے احترام اور رائلٹی كی ادائیگی كے شفاف نظام جیسے جدید كمرشیل اصولوں كے ساتھ جڑے هوئے اس ادارے كو جلد هی اردوكتابوں كے بازار سے پیچھے هٹ جانا پڑا۔لیكن سب سے زیاده افسوس كی بات یه هے كه كسی كو اس كا افسوس نهیں هوا۔ ان حالات میں ضروری هوجاتا هے كه اردو كتابوں كی اشاعت و طباعت سے وابسته كاروبار اور اس كے سابق و موجوده منظر نامے كا جائزه لیا جائے اور هم سبھی غور كریں‌كه كاروباری دنیا كے بدلتے هوئے تقاضوں سے اردو كتابوں كے كاروباركو كس حد تك اور كس طرح هم آهنگ كیا جاسكتا هے اور كیسے اسے ایك نئی زندگی مل سكتی هے۔ یه ایك بڑا كام هے۔ كور اسٹوری كے ان چندصفحات كے ذریعے هم كسی مكمل اور جامع منظر كشی كا دعویٰ نهیں كر سكتے۔ پھر بھی یه چند مضامین ، یاران نكته داں كے لیے دعوتِ فكر نهیں بلكه دعوتِ سخن ثابت هوں گے اتنی امید ضروررکھتے هیں ۔

ادارہ

ملک میں اردو کتابوں کی اشاعت اور فروخت کے حوالے سے اگر گفتگو کی جائے تو یہ بات یقینی ہے کہ اردو زبان کی صورت حال بھی زیر بحث آئے گی۔ کیونکہ کتابوں کی طباعت و اشاعت جس زبان میں کی جارہی ہے، اس کے چاہنے والوں کے رجحان اور اس زبان میں تخلیق ہونے والی کتابوں کے مواد اور موضوعات سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ اردو کتابوں کی فروخت کے عصری منظرنامے کو دیکھنے سے قبل ماضی میں اس پیشے سے منسلک افراد اور اداروں کی کاوشوں، ان کی خدمات اور ترجیحات کا جاننا بھی ضروری ہوگا۔ یہ موضوع اردو کتابی صنعت (Urdu Book Industry) کے حوالے سے چونکہ بالواسطہ تعلق طباعت و اشاعت سے رکھتا ہے لہٰذا

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو کتابی صنعت کے پس منظر پر بھی مختصر روشنی ڈالی جائے۔

ہندوستان میں طباعت و اشاعت کی تاریخ تقریباً چار سو برسوں کو محیط ہے۔ اس تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دَور 1857 سے قبل، دوسرا دَور 1857 کے بعد کا ہے — اور تیسرا دَور شروع ہوتا ہے تقسیم ہند یا آزادی کے بعد سے۔ پریس قائم کرنے اور اخبارات کی اشاعت سے کتابوں کی طباعت و اشاعت کا گہرا تعلق ہے۔ گویا یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اردو کتابوں کی طباعت و اشاعت درحقیقت اردو صحافت کے بطن سے پیدا ہوئی۔ 1823 میں اخباروں کے لیے پریس ایکٹ کا نفاذ ہوا تو 1835 میں سرچارلس مٹکاف کے دَور میں آزاد چھاپا خانے کا قیام عمل میں آیا۔ مثال کے طور پر مطبع آگرہ کالج (1846) سے پہلے 'صدرالاخبار' کے نام سے ایک اردو اخبار جاری ہوا۔ بعد میں اس اخبار کا نام 'اخبارالحقائق و تعلیم الخلائق' رکھ دیا گیا۔ اسی مطبع سے 1851 میں اردو کتاب 'انشا' (مصنف چرن جی لال)، اردو نصاب (طبعیات پر مسٹر بڈلٹن کے لکچر کا مجموعہ)، سفینۃ الاولیا (داراشکوہ)، کہربائی (اردو میں برقی قوت پر ایک مقالہ) اور 'اردو قواعد' وغیرہ کتابیں شائع ہوئیں۔ دہلی کے حوض قاضی میں 1845 میں مطبع دارالسلام قائم ہوا جس کے مالک عنایت حسین تھے۔ اس مطبع سے پہلے ایک ہفتہ وار فارسی اخبار 'صادق الاخبار' کے نام سے نکلتا تھا۔ 1847 سے کتابیں بھی چھپنے لگیں۔ چند کتابوں کے نام اس طرح ہیں: قرآن حکیم، حمائل شریف، مظہر جمیل (انتخاب احادیث)، انشائے خلیفہ (فارسی رقعات)، گلستانِ سعدی، کریما، بنجارہ نامہ، تعلیم ابجد، یوسف زلیخا، بہارِ دانش (جہاں دارشاہ کی داستانِ عشق)، قوانین زراعت، رسالہ ردِ وہابیان، تشریح منصوری (طب)، تفسیر حسینی، برہانِ محکم وغیرہ۔ اس طرح کے مطبع اور مکتبے اس دَور کی دلّی ہی نہیں بلکہ ممبئی، کلکتہ، مدراس، لکھنؤ اور پنجاب، لاہور، راولپنڈی، کشمیر، گوجرانوالہ، ڈھاکہ، کراچی، ملتان کے علاوہ ہندوستان کے بے شمار شہروں میں قائم ہوئے۔ موجودہ ریاستوں کے اعتبار سے اترپردیش، بہار، حیدرآباد (دکن)، ہریانہ، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش وغیرہ کے متعدد شہروں میں قائم ہوئے۔ لیکن ہندوستان میں اردو طباعت و اشاعت کو منظم اور باوقار انداز سے علمی و ادبی ترقی کے بام عروج پر جس اشاعتی ادارے نے پہنچایا اس کا نام ہے مطبع نولکشور۔ ہندوستان کی اردو طباعت و اشاعت کی تاریخ میں 1857 کی بغاوت اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تباہی نے پریس کو بھی بری طرح متاثر کیا تھا۔ علم و ادب کے سرمائے خاکستر ہوگئے تھے۔ 1857 کی ناکام بغاوت کے بعد سماجی اور علمی و ادبی سطح پر دو تحریکیں اٹھیں۔ ایک تحریک سرسیّد احمد خاں (17 اکتوبر 1817 — 29 نومبر 1913) کی تھی جنھوں نے حالات کی نبض شناسی کرتے ہوئے علی گڑھ تحریک چلائی جس کے نتیجے میں بالآخر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ دوسری طرف منشی نولکشور (پ: 1836 — و: 19 فروری 1895) نے ہندوستان کے تمدنی ورثے اور ذہن و شعور کی بیداری کی حفاظت کا سامان کیا۔ انھوں نے بیش بہا علمی خزانوں کو 1858 میں نولکشور پریس قائم کرکے طباعت کے ذریعے زندہ جاوید بنادیا۔ نولکشور کا اولین مقصد اگرچہ ایک اخبار کا اجرا کرنا تھا جو 'اودھ اخبار' کے

OUDH UKHBAR
LUCKNOW
اودھ اخبار
1st January, 1875.

BRITISH LIBRARY

نام سے معروف ہوا۔ لیکن ان کے اشاعتی مقاصد میں کتابوں کی طباعت اور فروخت کا کام بھی شامل تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے منشی نولکشور نے پہلے چھوٹی چھوٹی درسی کتابیں اور سرکاری دفاتر کے کاغذات سے طباعت کی ابتدا کی۔ یہ کام خالصتاً تجارتی نقطۂ نظر سے شروع کیا گیا تھا لیکن انھوں نے اس پیشے سے دیانت دارانہ تعلق استوار کرکے فنِ طباعت اور اشاعت کی ترقی میں تاریخی کارنامہ انجام دیا۔ ایک اندازے کے مطابق منشی نولکشور نے اپنے انتقال (1895) تک یعنی تقریباً 37 سال کی مدت میں مختلف النوع موضوعات پر اردو، عربی، فارسی میں چار ہزار سے زائد کتابیں شائع کیں۔ منشی نولکشور پریس کی فہرست کتب جو 1896 تک شائع ہونے والی کتابوں پر مشتمل ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک ناشر کی حیثیت سے منشی نولکشور کا ویژن (Vision) اور علمی و ادبی مزاج کیا تھا۔ عہد حاضر کے اردو ناشرین کے تقریب فہم کے لیے منشی نولکشور کی شائع کردہ کتابوں کے چند موضوعات اس طرح ہیں: قرآن مجید، تفاسیر قرآن (عربی، اردو، فارسی)، کتب احادیث (عربی، اردو)، فقہ اور مستند اسلامی کتابوں کے اردو تراجم، فرہنگ و لغات (اردو، عربی، فارسی)، تصوف و اخلاق، تاریخ و سیرت، اوراد و وظائف، عملیات، علم نحو و صرف، سنسکرت کتابوں کے اردو تراجم، اردو کی نثری داستانیں: داستان امیر حمزہ (اول تا ششم)، مع طلسم ہوش ربا، داستان بوستانِ خیال، فسانہ آزاد، طب یونانی، طبی لغت، منظومات فارسی: کلیات دواوین شعرا، قصائد و مثنویات، شعراء فارسی و اردو کے تذکرے، عروض و قوافی، فارسی نثر زبان و ادب، گلستان و بوستان سعدی، ادب و انشا، قواعد اخلاق (فارسی)، نجوم، جفر، رمل، متفرق علوم و معلوماتِ عامہ، تواریخ، سیر و سوانح، تذکرے (فارسی، اردو)، مثنویات، قصص و افسانے، ناول، کہانیاں (اردو)، ابتدائی تعلیم کی درسی کتب، کتب قوانین (اردو)، علم موسیقی، فارسی اردو کتابوں کے ہندی تراجم۔ اسی طرح فارسی و اردو کتابوں کے انگریزی ترجمے وغیرہ۔

منشی نولکشور کے اس پبلشنگ کارنامے کو اگر عصری تناظر میں دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آج کا بڑے سے بڑا اردو ناشر ان کے پاسنگ بھی نہیں ہے۔ منشی نولکشور ایک بے دار مغز اور صاحبِ بصیرت انسان تھے۔ ان میں اعلیٰ انتظامی صلاحیت تھی۔ انھوں نے اپنا پریس قائم کرنے سے قبل لاہور کے مطبع کوہ نور میں ملازمت بھی کی تھی۔ انتہائی قلیل سرمایہ سے ایک کرایہ کے مکان میں ہینڈ پریس قائم کیا تھا۔ لیکن اپنی سوجھ بوجھ سے 1870 میں حضرت گنج (لکھنؤ) میں واقع کوٹھی غالب گنج خرید لی تھی۔ ان کے مطبع میں لیتھوگرافی کے شعبوں کے علاوہ شعبہ کتابت، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، شعبہ حصول و فرمائشات، شعبہ فروخت کتب، شعبہ ترسیل، شعبۂ اکاؤنٹسی، شعبۂ نشر و اشاعت (مع پبلسٹی)، شعبۂ مراسلت، شعبۂ مالیات، شعبۂ عمارات، شعبۂ ٹائپ فونڈری اور کتابوں کے ذخیرے کے لیے علیحدہ گودام وغیرہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ منشی نولکشور اپنے زمانے میں کس پائے کے ناشر تھے۔ انھوں نے مطبع نولکشور کے استحکام اور وسعت کے لیے مختلف شہروں میں شاخیں بھی قائم کی تھیں جن میں کانپور، لاہور، پٹیالہ، اجمیر کے علاوہ دہلی، پٹنہ، کلکتہ، الٰہ آباد اور کئی شہروں میں ایجنسیاں تھیں جہاں

مطبوعات فروخت کے لیے موجود رہتی تھیں۔ مطبع نولکشور کی ایک ایجنسی لندن (انگلینڈ) میں بھی قائم ہوگئی تھی جہاں حسب طلب کتابیں ارسال کی جاتی تھیں۔ جدید دنیا میں اردو کتابوں کی طباعت و فروخت کا یہی ماڈل مکتبہ تھا جس کے بعد کئی بڑے اشاعتی ادارے قائم ہوئے۔

1947 کی تقسیم وطن اور خوں ریز فسادات سے اردو کے جن معروف اشاعتی اداروں کو تباہی سے دوچار ہونا پڑا ان میں پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد کے دارالترجمہ عثمانیہ کو نذر آتش کردیا گیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے انجمن ترقی اردو ہند اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (قیام 1922) کو بھی فسادیوں نے آگ لگادی۔ آزادی کے بعد یہ دونوں مکتبے تو سنبھل گئے لیکن اول الذکر دارالترجمہ عثمانیہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ ایک زمانے میں پروگریس پبلشرز، ماسکو (قیام 1931) کے شعبہ اردو نے اشتراکی مفکرین اور روسی مصنفوں کی بے شمار کتابیں اردو میں منتقل کیں جن میں حیاتِ لینن سے لے کر روس کے عظیم شاعر پوشکن کی شعری تخلیقات، فیودور دوستوئفسکی کے ناول 'ایڈیٹ' اور کرائم اینڈ پنشمنٹ وغیرہ۔ لیوٹالسٹائی کی خودنوشت اور کہانیاں۔ میکسم گورکی، میخائل شولوخوف، رسول حمزہ توف، آئماتوف، ازبکستان کی شاعرہ زلفیہ کی تخلیقات کے علاوہ مارکس اور اینگلس کے مضامین کے مجموعے شائع کیے۔ اردو زبان و ادب میں اپنے وقت کے سوپر پاور سوویت روس کے نظریہ و پالیسی سے اختلاف کے باوجود اس کی جانب سے اردو میں شاید یہ سب سے بڑی ادبی کوشش تھی جس نے اردو سرمائے میں عالمی ادب کا بڑا اضافہ کیا۔ لیکن سوویت روس کے ٹوٹنے کے بعد اب یہ کتابیں قصہ پارینہ ہو چکی ہیں۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ کی علمی و ادبی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ اس ادارے کا مجلّہ 'معارف' 1914 سے اب بھی جاری ہے لیکن یہ مجلّہ اب اپنے محسنوں کی یادگار بن کر رہ گیا ہے۔ 1947 کے بعد یہ ادارہ شدید مالی مشکلات کے باوجود قائم رہا کیونکہ اس سے اس وقت کے بیشتر اہل علم و دانش کے ساتھ سیاسی رہنماؤں کو بھی لگاؤ رہا ہے۔ ان میں موتی لعل نہرو، جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، رفیع احمد قدوائی کے علاوہ اندرا گاندھی بھی شامل تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب 1947 کے بعد اس ادارے کی مالی حالت خراب ہوگئی تو جواہر لعل نہرو کے ایما پر مولانا ابوالکلام آزاد نے ساٹھ ہزار روپے کا عطیہ دیا تھا۔ دارالمصنفین نے سیرت النبیؐ، سیرۃ الصحابہ اور مسلم دانشوروں کے حوالے سے تحقیقی کتابیں شائع کیں۔ اس کے ساتھ ہی وہاں سے تاریخ اسلام، تاریخ دولت عثمانیہ، تاریخ اندلس اور دیگر علوم و فنون پر گراں قدر کتابیں شائع ہوئیں۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں برادرانِ وطن کی جانب سے جن اردو اشاعتی اداروں نے نمایاں خدمات انجام دیں ان میں جے ایس سنت سنگھ اینڈ سنز کا کتب خانہ اشاعت الاسلام، سلوچنا پرکاشن، اسٹار پبلی کیشنز، موڈرن پبلشنگ ہاؤس اور نند کشور وکرم کا اشاعتی ادارہ پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ تاہم یہ ادارے اب اردو کتابوں کی اشاعت اور فروخت سے تقریباً مایوس ہوتے جارہے ہیں۔ کتب خانہ اشاعت الاسلام کا قیام 1906 میں لاہور میں ہوا تھا۔ سردار سنت سنگھ سیکولر مزاج کے دور اندیش آدمی تھے۔ انھوں نے اسلامی اور ادبی کتابوں کے علاوہ مولوی عبدالحق کی تیار کردہ ڈکشنریاں وغیرہ شائع کیں۔ تقسیم وطن کے بعد اس ادارہ نے ہمت نہیں ہاری بلکہ بیشتر اردو پبلشرز نے دوسرے کاروبار کو ترجیح دی، ان کے بیٹے منوہر لال جی نے اسے قائم رکھا۔ 1963 میں منوہر لال جی کے فرزندوں نے اشاعت کے کام کو آگے بڑھایا۔ 1977 میں دینی و مذہبی کتب کی برآمد (Export) کا کام شروع کیا۔ اسے حکومت ہند کی جانب سے اسپیشل ایکسپورٹ ایوارڈ بھی دیا گیا۔ اس ادارے نے دیگر اردو کتابوں اور لغات کے علاوہ سنہری قرآن پاک، معریٰ و مترجم قرآن مجید و حمائل شریف شائع کیے۔ یہ ادارہ اب بھی قائم ہے مگر افسوس کہ اردو کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ گزشتہ دس برسوں سے موقوف ہے۔ اب یہ ادارہ صرف عربی و انگریزی کتابیں ہی ایکسپورٹ کرتا ہے۔ اسی طرح نئی دہلی کے سلوچنا پرکاشن نے ادب کے ساتھ سائنس کے موضوع پر بھی اہم کتابیں شائع کیں۔ یہ اشاعتی ادارہ بھی تقریباً معدوم ہو چکا ہے۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے اپنے قیام (ستمبر 1979) کے بعد اردو میں نثری و شعری تخلیقات کے علاوہ تحقیقی و تنقیدی کتابوں کی اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اردو کے مستند اور صائب الرائے ادیب و شاعر گوپال متل کے فرزند پریم گوپال متل اب پیرانہ سالی کے دور میں ہیں۔ اردو کا یہ اشاعتی ادارہ بھی ہچکیاں لے رہا ہے۔ ان کے صاحبزادے انگریزی اور ہندی کتابیں فروخت کررہے ہیں۔ نندکشور وکرم کا آخری شوق یعنی اردو میں ضخیم 'سالنامہ' کی اشاعت فی الحال برقرار ہے لیکن اب ان کے ادارہ کی اشاعتی سرگرمیاں تقریباً مفقود ہیں۔ اسٹار پبلی کیشنز اردو میں سستی پیپر بیک کتابوں کے حوالے سے معروف ادارہ تھا۔ اب اس کی بھی اردو اشاعتی سرگرمیاں کمزور پڑگئی ہیں۔ صرف ایکسپورٹ کے لیے اردو کی بعض چنندہ کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ ہند پاکٹ بکس اردو کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ کافی پہلے موقوف کرچکا ہے۔ 1954 میں اہلووالیہ بک ڈپو قائم ہوا۔ اس ادارے نے معروف مصنفین کے تین سو سے زائد ناول شائع کیے۔ کچھ برسوں سے اشاعت کا سلسلہ بند ہے تاہم اردو کتابوں کی سپلائی کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اس بک ڈپو کے مؤسس جانکی ناتھ اہلووالیہ کے بیٹے راکیش اہلووالیہ کے بقول اردو اور اردو کتابوں کا مستقبل تابناک تو ہے لیکن خود اردو سے وابستہ لوگوں نے اردو کتابوں کی فروخت کی راہیں مسدود کردی ہیں۔

اردو کتابوں کے سپلائر دو سو روپے کی کتاب آٹھ سو میں اور ساٹھ روپے کی کتاب ایک سو ساٹھ میں سپلائی کرتے ہیں۔ لائبریری سپلائی میں Transparency

ختم ہوتی جارہی ہے۔ معروف انگریزی اشاعتی ادارہ پنگوئن بکس انڈیا لمیٹڈ نے چند سال قبل اردو کتابوں کی اشاعت کا آغاز کیا۔ اردو میں پہلی کتاب افتخار گیلانی کی 'تہاڑ میں میرے شب و روز' شائع ہوئی۔ مزید چند کتابوں کی اشاعت کے بعد اس ادارے کو اردو کتابوں کی سست رفتار کھپت کا اندازہ ہوگیا۔ نصرت ظہیر کی 'نمی دانم' اور شمس الرحمٰن فاروقی کی 'کئی چاند تھے سرآسماں' کتاب کے چھپنے کے بعد اردو میں دوسری کوئی کتاب نہیں چھپی ہے کیونکہ اس کتاب کی غیر معمولی اہمیت کے باوجود دوسری طباعت کی نوبت نہیں آسکی۔ البتہ اس کے ہندی اور انگریزی ایڈیشن کی اشاعت اردو سے کہیں زیادہ حوصلہ افزا ہے۔ پنگوئن بکس کے نمائندہ مسٹر ونود کمار کے بقول اردو کتابوں کی مانگ بیرون ملک میں کہیں زیادہ ہے۔

ہندوستان میں اردو کتابوں کی فروخت کے موجودہ منظرنامے پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ فروخت سے جڑے مسائل میں اردو زبان سے خود اردو والوں کی بیزاری زیادہ نظر آتی ہے۔ اس تناظر میں اردو پبلشرز کو دو طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اول مذہبی طبقہ، دوم ادبی طبقہ۔

مذہبی طبقے میں زیادہ تر اردو پبلشرز پرائیویٹ سیکٹر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں چند نیم مذہبی اور نیم ادبی اردو پبلشرز بھی شامل ہیں۔ ادبی طبقے میں زیادہ تر سرکاری ادارے ہیں۔ مثلاً پبلی کیشنز ڈیویژن، نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، رامپور رضا لائبریری، انجمن ترقی اردو (ہند)، غالب انسٹی ٹیوٹ، اردو اکادمیاں، ساہتیہ اکادمی وغیرہ۔ اس ادبی طبقے میں قومی کونسل (NCPUL) کو چھوڑ کر تقریباً تمام ہی اشاعتی اداروں میں اردو کتابوں کی فروخت پر سنجیدہ کوشش کا کلیتاً فقدان نظر آتا ہے۔ اسباب سے قطع نظر یہ اشاعتی ادارے اردو کتابوں کی مانگ کے باوجود گاہکوں کو کتابیں فراہم کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ کم و بیش یہی صورت حال قومی اردو کونسل کے ساتھ بھی تھی لیکن اس نے اپنی پالیسی اور طریقہ کار میں تبدیلی کر کے اردو کتابوں کو اردو قارئین تک پہنچانے کا بہتر انتظام کیا ہے جن میں کتابوں کی موبائل سروس اور اردو کتاب میلے کا انعقاد خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ کتاب میلے کے لحاظ سے کسی حد تک NBT انڈیا اور ساہتیہ اکادمی کو بھی اس میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اردو کتابوں کی فروخت کے تعلق سے ان کی کوششیں حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ ایک جائزے کے مطابق اردو کتابوں کی فروخت میں درج ذیل نکات خاص طور سے قابل توجہ ہیں:

1. اردو زبان کا براہ راست تعلق روزگار سے منقطع ہوچکا ہے۔
2. اردو کتابوں میں تازہ مواد اور موضوعات کے تنوع کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔
3. ملک کے تعلیمی نصاب سے اردو زبان کا راست تعلق نہیں ہے۔
4. پرائمری سے سینئر سکنڈری سرکاری اسکولوں اور بیشتر پبلک اسکولوں میں اردو زبان کی تدریس کا نظم نہیں ہے۔
5. عصر حاضر کے سماجی اور تعلیمی و ادبی تقاضوں سے اردو ناشرین کی بے توجہی افسوس ناک ہے۔
6. کلاسیکی ادب اور عصری موضوعات پر دیگر زبانوں کے تراجم کا اردو زبان میں فقدان ہے۔

دار المصنفین، اعظم گڑھ

7. انگریزی اور ہندی زبانوں کے مقابلے میں اردو میں مسابقاتی (Competitive) کتابوں کی تعداد صفر کے برابر ہے۔
8. اردو میں اب تفریحی ادب کا مقام صفر کے درجے تک پہنچ گیا ہے۔ فکشن کے علاوہ تاریخی اور سماجی ادب کے مصنفین ناپید ہوتے جارہے ہیں۔ 1952 میں نکہت پبلی کیشنز، الٰہ آباد نے اردو دنیا کو ابن صفی (پ: اپریل 1928 — و: 26 جولائی 1980) جیسا عظیم مصنف دیا جن کے ایک ناول کی اشاعت ایک لاکھ سے تجاوز کرگئی تھی۔
9. اردو میں علمی، تحقیقی، فنی اور تکنیکی کتابوں کی اشاعت انتہائی محدود ہوگئی ہے۔ ملک میں عصر حاضر سے ہم آہنگ اردو کا کوئی معیاری لغت بھی موجود نہیں ہے۔
10. اردو پبلشرز کی شائع کردہ موجودہ علمی، تحقیقی و ادبی کتابیں موضوع اور فن کے لحاظ سے بین الاقوامی معیار پر پوری نہیں اترتیں۔
11. اردو میں بچوں کا ادب اپنی روایت سے اوپر نہیں اٹھ سکا ہے۔ اس ادب میں اب بھی جن بھوت کی کہانیاں زیادہ ملتی ہیں۔ بچوں کے لیے اردو میں انسائیکلو پیڈیائی کتابوں کی اشاعت صفر کے برابر ہے۔
12. ملک میں 30-40 سال قبل سماج کی سرپرستی میں قائم 90 فیصد ہزاروں چھوٹی بڑی اردو لائبریریاں تقریباً بند ہوچکی ہیں۔
13. اسکول سے یونیورسٹی کی سطح تک ہزاروں اساتذہ اردو کتابیں نہیں خریدتے اور نہ ہی طلبا کو اردو کتابیں خریدنے کی تاکید کرتے ہیں۔
14. ذاتی طور پر سامان تعیش پر ہزاروں اور لاکھوں صرف کرنے والے ملک کے بیشتر محبانِ اردو استطاعت رکھنے کے باوجود اپنے بجٹ میں مختلف موضوعات پر اردو کتابیں خریدنے کے لیے کوئی جگہ نہیں رکھتے۔
15. اردو کونسل/ اکادمیوں کی جانب سے اردو کے ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں کو کتاب کی اشاعت کے لیے دی جانے والی امداد پر شائع کردہ کتب عام طور پر مفت تقسیم ہوتی ہیں یا کچھ دیمک کی نذر ہوجاتی ہیں۔ چونکہ مصنف خود ہی ناشر ہوتا ہے لہٰذا ان کتابوں کی فروخت سے وہ معذور نظر آتا ہے۔ ان میں بعض کتب علمی و ادبی لحاظ سے غیر معیاری بھی ہوتی ہیں۔
16. اردو کتابوں کی تشہیر اور پبلسٹی کے لیے اردو پبلشرز کی جانب سے مؤثر اور متواتر کوششوں کا شدید فقدان ہے۔ اس میدان میں اردو کتابوں کے ٹریولنگ ایجنٹ بھی اب کام نہیں کررہے ہیں۔
17. ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ اردو زبان اب غیر اردو صوبوں اور علاقوں تک پہنچ چکی ہے۔ اردو پبلشروں کی جانب سے دور دراز علاقوں سے ملنے والے انفرادی اور چھوٹے آرڈرز کی تکمیل کم ہی کی جاتی ہے۔ چھوٹے آرڈر کو وہ عام طور پر نظر انداز کردیتے ہیں۔
18. اردو کتابی صنعت پر انفرادی طور پر شائع کردہ کچے پکے شعری مجموعوں کی اشاعت حاوی ہوگئی ہے۔ شاعری سے اوپر اٹھ کر نثری تخلیقات کا رجحان تقریباً ختم ہوچکا ہے۔ حالانکہ آزادی کے بعد 30-40 سال قبل تک نثری

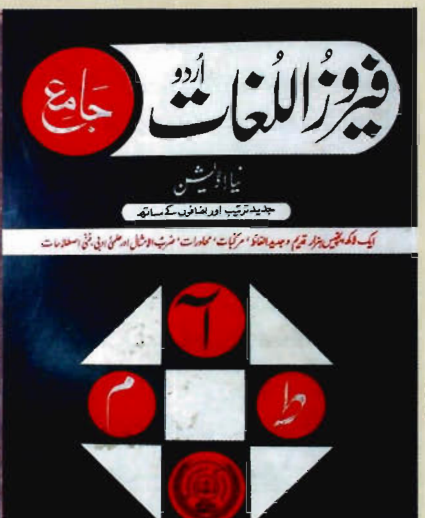

تخلیق کاروں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔

19. اردو کتابوں پر بعض اردو پبلشروں کے ذریعے ٹریڈ اور عام ڈسکاؤنٹ کی نامناسب پالیسی سے کتابوں کی عام فروخت میں اردو بک سیلرز کی دلچسپی کم ہوتی جارہی ہے۔ خاص طور سے درمیانہ درجے کے اور چھوٹے بک سیلرز ایک طرف قارئین کی کمی تو دوسری جانب خریداروں کی طرف سے زیادہ ڈسکاؤنٹ کے مطالبے سے خسارے سے دوچار ہونے لگے ہیں۔

20. نئے نظام تعلیم کی پروردہ نسل کی کثیر تعداد جن کا تعلق اردو گھرانے سے ہے، اردو نہ جاننے یا اردو سے واجبی واقفیت رکھنے کے سبب اردو کتابیں خریدنے سے معذور نظر آتی ہے۔

21. اردو پبلشرز اور بک سیلرز کا کوئی بھی فعال اور مؤثر ایسوسی ایشن موجود نہیں ہے۔ ایک ادارہ گزشتہ پندرہ برس قبل قائم بھی ہوا تو اردو والوں نے ہی اسے 'کوما' کی حالت میں پہنچادیا۔ کاش یہ ادارے اجارہ داری کے چنگل سے نکل کر اردو پبلشرز اور بک سیلرز کے مابین تعاون اور ارتباط کی کیفیت بحال کرنے میں مؤثر رول ادا کرنے لگے تو ملکی سطح پر اردو کتابی صنعت اپنا مقام بنا سکتی ہے۔

مذہبی طبقہ کے اردو پبلشرز

اردو سے غیر معمولی محبت کا دَم بھرنے والے مذہبی کتابوں کے پبلشرز کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اولاً مدارسِ اسلامیہ سے تعلق رکھنے والے ناشرین۔ ثانیاً عام مذہبی، اخلاقی و نظریاتی نوعیت کی کتابوں کے ناشرین۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ملک میں مدارسِ اسلامیہ کی تعلیمی زبان یا میڈیم اردو ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو یہاں زندہ نظر آتی ہے۔ یہ مدارس نہ صرف شمالی ہندوستان میں بلکہ مہاراشٹر، کرناٹک اور آندھرا پردیش کے علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان مدارس سے تعلق رکھنے والے اردو پبلشرز کی بڑی تعداد دیوبند سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ پبلشرز مدارس کے نصاب سے متعلق کتابوں کے علاوہ اردو میں تاریخ اسلام، قرآن مجید کی قدیم و جدید تفاسیر، احادیث سے متعلق کتب، فقہ، منطق، فتاویٰ وغیرہ کی سیکڑوں کتابیں شائع کرتے ہیں۔ ان اشاعتی اداروں سے اب کلاسیکی ادب اور تذکرے کے موضوعات پر بھی بعض کتابیں چھپنے لگی ہیں۔ لیکن دیوبند کے بیشتر اشاعتی اداروں میں آفسیٹ کے انقلاب کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اوریجنل اور تحقیقی کام کا شدید فقدان محسوس ہوتا ہے۔ ان کا کلیتاً انحصار قدیم نسخوں کی اشاعت یا پاکستان کے علما و دانشوروں کے ذریعے کیے گئے کاموں پر ہے۔ یہاں کے اشاعتی اداروں کا اپنا مخصوص نیٹ ورک ہے اور انھیں اپنی کتابوں کی نکاسی میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی۔ ان کی کتابوں میں عام طور پر قیمت فروخت درج نہیں ہوتی۔ بیشتر ناشرین کا طریقہ کار نرالا ہے۔ حسب موقع کتابوں کی قیمت متعین کرتے ہیں اور 70 سے 80 فیصد تک ڈسکاؤنٹ دیتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں دیگر مذہبی مسلکوں مثلاً اہل حدیث، اہل سنت والجماعت اور شیعہ مسلک کے اردو ناشرین کی کتابوں پر 40 سے 50 فیصد تک ڈسکاؤنٹ کا رواج ہے۔ اسی طرح مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ کی کتابوں پر بھی حد سے زیادہ ڈسکاؤنٹ نہیں دیا جاتا۔ لیکن دیوبند کے پبلشرز کے اس عمل سے ملک کے دوسرے اردو پبلشرز اور بک سیلرز کا کاروبار متاثر ہورہا ہے۔

عام مذہبی و نظریاتی طبقے سے تعلق رکھنے والے اردو ناشرین میں بیشتر کا عمومی رجحان قرآن مجید، احادیث، تاریخ اسلام، تاریخی ناول وغیرہ کی اشاعت پر مرکوز ہے۔ ان میں چند اردو کے ناشرین مذہبی اور نیم مذہبی کتابوں کے ساتھ ادبی کتابیں بھی شائع کرتے ہیں۔ ان میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، فرید بک ڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، الہدیٰ پبلی کیشنز دہلی، اسلامک بک سروس دہلی، الحسنات بکس پرائیویٹ لمیٹڈ، البلاغ پبلی کیشنز نئی دہلی، اریب پبلی کیشنز نئی دہلی، القلم پبلی کیشنز، بارہ مولہ کشمیر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مذہبی و نظریاتی اردو واشاعتی اداروں میں مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، مکتبہ الرسالہ نئی دہلی، رضوی کتاب گھر، مکتبہ الفہیم مئو، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، ایفا پبلی کیشنز نئی دہلی، قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز نئی دہلی، منشورات پبلی کیشنز نئی دہلی، احمدیہ مسلم جماعت نئی دہلی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان اشاعتی اداروں کو بھی اپنی کتابوں کے فروخت میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی۔

دلّی کے پرائیویٹ ادبی اردو پبلشرز میں تخلیق کار پبلشرز، عرشیہ پبلی کیشنز، ایم آر پبلی کیشنز، موڈرن پبلشنگ ہاؤس اور کلاسیکی پیپر بیک کے حوالے سے ایک نیا ادارہ عالمی میڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ قابل ذکر ہیں۔ علی گڑھ کے ایجوکیشنل بک ہاؤس کو بھی ان میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

اردو میں طبّی کتابوں کی اشاعت کے حوالے سے اعجاز پبلشنگ ہاؤس واحد اشاعتی ادارہ ہے۔ ہندوستان کی تقریباً 13 ریاستوں دلّی، اترپردیش، بہار، مدھیہ پردیش، مغربی بنگال، جموں وکشمیر، مہاراشٹر، کرناٹک، تمل ناڈو، گجرات، راجستھان، آندھرا پردیش اور اڑیسہ میں 500 سے زائد اردو پبلشرز اور چھوٹے بڑے اردو بک سیلرز موجود ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر بک سیلرز خالصتاً مذہبی کتابیں فروخت کرتے ہیں۔ ان میں بھی زیادہ تر قرآن مجید اور عام دینی و ابتدائی اردو نصاب کی کتابیں رکھتے ہیں۔ ان میں ادبی تحقیقی کتابیں اور ناولوں وغیرہ کے چند ہی بک سیلرز ہیں۔ ان ادبی بک سیلرز کے یہاں بھی دلّی کے معروف ادبی سرکاری اردو پبلشرز کی کتابیں نہیں پائی جاتیں۔ اس کی بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ سرکاری اردو پبلشرز اپنے اداروں کی کتابیں کریڈٹ پر فراہم نہیں کرتے اور ان اداروں کو اس کی فکر بھی نہیں ہوتی کہ سرکار کی سرپرستی میں چھپنے والی کتابیں ملک کی مختلف ریاستوں کے بک سیلرز کے پاس display کی جائیں تاکہ عام

قاری ان کتابوں سے متعارف ہو۔ اردو کے پرائیویٹ اردو پبلشرز کی لبرل پالیسی کے سبب ان کی کتابیں ہر جگہ نظر آتی ہیں لہٰذا فروخت بھی ہوتی ہیں۔

اردو کی مذہبی، نیم مذہبی و ادبی کتابوں کی مانگ بلاشبہ جموں وکشمیر میں سب سے زیادہ ہے۔ دوسرے نمبر پر مہاراشٹر ہے۔ اردو کتابی صنعت کے بارے میں معروف ادیب و محقق ڈاکٹر خلیق انجم 1982 میں لکھے اپنے ایک مضمون میں ایک دلچسپ حقیقت بیان کرتے ہیں کہ اردو فارسی کتابوں کی سب سے زیادہ کھپت پنجاب میں ہوتی تھی۔ جب 1857 میں غالب کی ''دستنبو'' شائع ہوئی تو تقریباً ایک سال بعد مطبع کے مالک اور غالب کے دوست وشاگرد منشی شیو نارائن آرام نے غالب کو خوش خبری دی کہ دستنبو کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا ہے۔ غالب نے فوراً آرام کو خط لکھ کر پوچھا کہ کتابیں کس علاقے میں فروخت ہوئیں اور پھر اپنا قیاس بتایا کہ پنجاب میں ہوئی ہوں گی۔ منشی شیو نارائن آرام نے جواب میں غالب کے اس قیاس کی تصدیق کی۔ ڈاکٹر خلیق انجم اس پر دوٹوک تبصرہ اس طرح کرتے ہیں:

''آدھا پنجاب پاکستان میں چلا گیا اور آدھا اردو سے منکر ہوگیا۔ پورے شمالی ہندوستان کی صوبائی حکومتیں اردو کی سرپرستی تو کیا کرتیں انھوں نے اس زبان کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کتابوں کی کہیں کھپت نہ رہی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو کی کتابیں چھپنا بند ہوگئیں۔ جاسوسی ناول اور سماجی اور تاریخی ناول ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوکر زندگی سے مفرور ذہنوں کی آسودگی کا سامان کرتے رہے۔ مذہبی کتابوں میں قرآن شریف کی فروخت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ البتہ یوسف زلیخا یا داستانِ یوسف جیسی مذہبی کتابیں دیوناگری رسم الخط میں چھپنے لگیں۔ چونکہ شاعری کی خاص مانگ رہی ہے اس لیے پچھلے تیس سال میں سب سے زیادہ شاعری کے مجموعے چھپے ہیں۔ ان میں پبلشروں نے کم اور شاعروں نے زیادہ مجموعے چھاپے ہیں۔ بڑی بدنصیبی یہ ہوئی کہ اعلیٰ درجے کی تحقیقی اور تنقیدی کتابیں چھاپنے والے ناشر نہیں رہے۔ جن محققین اور نقادوں میں مالی استطاعت تھی، انھوں نے اپنی کتابیں خود چھپوا کر دیمک کے لیے غذا فراہم کی۔ آزادی سے قبل ہر ممکن ٹیکنکل موضوع پر اردو میں کتاب چھپتی تھی۔ آزادی کے بعد یہ سلسلہ تقریباً ختم ہوگیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹیکنکل واقفیت کے لیے اردو والوں کو دوسری زبانیں سیکھنی پڑیں۔''

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم کا اردو کتابی صنعت پر تقریباً 32 سال قبل کا یہ تبصرہ کتنا دوررس اور حقیقت پر مبنی ہے۔

سوال اٹھتا ہے کہ اردو کتابوں کی فروخت کے موجودہ منظرنامہ میں ملک کے موجودہ اردو پبلشروں کا کیا رول ہے؟ صورت حال یہ ہے کہ اردو قارئین میں بتدریج انحطاط ہو رہا ہے اور تعلیمی اداروں اور اسکولوں کے لیے تیار شدہ نصابی اردو کتابیں بھی دستیاب نہیں ہو رہی ہیں۔ اس ضمن میں پبلشنگ ورلڈ سے تعلق رکھنے والے ایک ماہر و دانشور وشواناتھ نے ''ہندوستانی زبانوں کے اشاعتی اداروں'' کے موضوع پر لکھے اپنے ایک مضمون میں بتایا کہ مرکزی حکومت کے زیر انتظام اشاعتی ادارے مثلاً NCERT اور اسی طرح ریاستی حکومتوں کے پبلشنگ اداروں نے اسکول کی سطح کے ٹیکسٹ بک پر اجارہ داری (monopoly) قائم کر رکھی ہے جس کی وجہ سے پرائیویٹ پبلشرز اس منافع بخش کاروبار سے محروم ہیں۔ لہٰذا میک گراہل کے بزنس منیجر مسٹر سبرامنیم نے اپنے ایک مضمون میں مرکزی و ریاستی سرکاری پبلشنگ اداروں کو مشورہ دیا تھا کہ نصابی کتابوں کے مسودے تو وہ اپنی نگرانی میں تیار کرائیں لیکن یہ مسودے پرائیویٹ پبلشرز کے حوالے کردیے جائیں تاکہ ان کے ذریعے کتابوں کی اشاعت وقت پر ہو اور کتابوں کے بروقت distribution میں دشواری پیش نہ آئے۔

اس تناظر میں اگر اردو میں تعلیمی و نصابی کتابوں کی اشاعت اور فروخت کی طرف اردو ناشروں کی توجہ مبذول ہوجائے اور گزشتہ سطور میں دیے گئے 21 تجزیاتی نکات پر خصوصی توجہ صرف کی جائے تو اکیسویں صدی میں بھی اردو زبان کی بے مثال وسعت کے ساتھ اردو کتابوں کی ادبی و علمی توسیع و استحکام میں شاید زیادہ دشواری پیش نہ آئے۔ بشرطیکہ اس سلسلے میں اردو زبان وادب سے محبت کا دم بھرنے والے افراد اور قارئین اردو کے تئیں اپنی ذمے داریوں کو محسوس کرتے ہوئے زندگی کے ہر موڑ پر کلیدی کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہوجائیں۔ ساتھ ہی اردو پبلشرز اور مصنفین اور اردو بک سیلرز اور قارئین کے مابین اٹوٹ رشتہ استوار ہو۔

کتابوں کی فروخت کے موجودہ رجحان ساز دور میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ہندوستان کے تمام اردو پبلشرز کی ایک مکمل فہرست کتب (Book Directory) تیار کی جائے۔ اس ڈائرکٹری کو ہر سال update کیا جائے۔ اس کی اشاعت سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ مختلف مصنفوں کے ذریعے چھپنے والی کتابوں سے بھی اردو بک سیلرز اور قارئین واقف ہوجائیں گے۔ اس بک ڈائرکٹری سے عالمی سطح پر اردو دنیا استفادہ کرسکتی ہے۔ لیکن یہ کام ایک منظم منصوبہ بندی کا متقاضی ہے۔

اس مضمون کی تیاری میں جزوی طور پر درج ذیل کتابوں سے بھی مدد لی گئی

1. ہندوستانی پریس (1556 تا 1900) از نادر علی خاں، مطبوعہ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، 1990۔
2. ہندوستان میں چھاپہ خانہ، از اے کے پرولکر/علی ابن الحسین زیدی، 2002، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
3. سوانح منشی نول کشور، از سید امیر حسن نورانی، 1995، مطبوعہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔
4. روزنامہ قومی آواز، نئی دہلی اردو بک سیلرز اور پبلشرز نمبر، 1982، چیف ایڈیٹر: عشرت علی صدیقی، مرتب: اطہر عزیز، مطبوعہ قومی آواز، ہیرالڈ ہاؤس، نئی دہلی-1۔
5. Afro Asian Publishing: Contemporary Trends, Ed. By Narendra Kumar, S.K. Ghai, Pub. by Institute of Book Publishing, New Delhi - 16
6. International Publishing Today: Problems & Prospects, Ed. By O.P. Ghai, Narendra Kumar, 1984. Pub. by: The Bookman's Club, Delhi.

■

Mr. Arif Iqbal, 1739/3 (Basement), New Kohinoor Hotel, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi- 110002

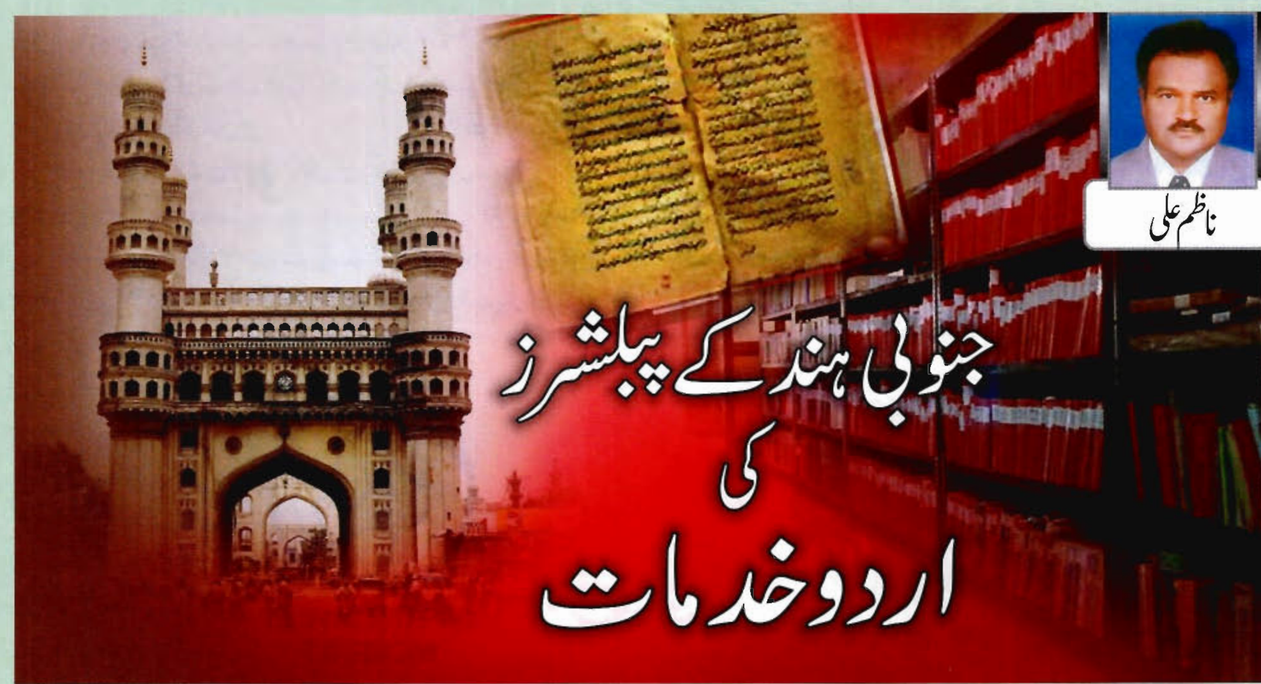

ناظم علی

جنوبی ہند کے پبلشرز کی اردو خدمات

اردو زبان و ادب کے فروغ و ترقی میں ادیبوں و شاعروں نے بہت اہم رول ادا کیا ہے اور اردو ادب کی نثری و شعری اصناف کے تخلیقی عمل کے ذریعے ادب کو پروان چڑھایا اور زبان کی بے پایاں خدمات انجام دیں۔ گٹن برگ نے چھاپہ خانے کی ایجاد کی تب سے ادب کی اشاعت میں تیزی اور بہتری پیدا ہوگئی۔ ادیب اور شاعروں کی ہمت کو پر لگ گئے ادب تخلیق کرنے میں سبقت لے گئے اور اعلیٰ سے اعلیٰ ادب تخلیق ہو کر عوام تک پہنچا۔ ان کے علاوہ زبان و ادب کے فروغ میں پبلشرز کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے معیاری اور کلاسیکی و جدید کتابوں کو شائع کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ اس مضمون میں صرف چند پبلشرز کی اردو خدمات کا اجمالاً ذکر کیا جارہا ہے کیونکہ اشاعت کی تفصیل یا کتب کی فہرست دینے کے لیے جگہ ناکافی ہوگی اس لیے اجمالاً تعارف پر اکتفا کیا گیا ہے۔

ذیل میں دکن کے چند اہم پبلیشرز کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور جو ادیب، نقاد، محقق، ماہر لسانیات، ادبی مورخ اور دکنی تہذیب و تمدن کے عاشق تھے انھوں نے دکنی ادب کے فروغ کے لیے ادارہ ادبیات اردو ایوان اردو قائم کیا۔ ایوان اردو کی جانب سے ماہ نامہ سب رس جنوری 1938 سے اجرا کیا جس میں اردو زبان و ادب خاص کر دکنی ادب کو ترجیح دی جاتی تھی اور دی جارہی ہے۔ انھوں نے جنوری 1938 ہی سے اردو زبان وادب پر مبنی کتابوں کی اشاعت کے لیے سب رس کتاب گھر قائم کیا۔ ان کی زندگی میں لگ بھگ 200 کتابیں شائع ہوئیں اور بعد میں 1970 تک ادبی، تاریخی، تعلیمی، مذہبی تصانیف شائع ہوتی رہیں۔ دکنی ادب پر مبنی کتابوں کو ترجیح دی جاتی رہی۔ بہ حیثیت مجموعی علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، بچوں کی، خواتین کی اور تعلیمی کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ اس ادارہ سے شائع کردہ کتابیں ادبی ماحول میں بہت معروف و مقبول ہوئیں۔ اور بعض ادبی دانشوروں نے اس سے استفادہ کیا۔

پروفیسر سید محمد سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد جو اردو زبان کے مورخ، محقق اور ادیب و نقاد کہلاتے ہیں۔ انھوں نے اردو کتابوں کی اشاعت کے لیے Allied Publisher's ' 1958 میں قائم کیا۔ اس کے ساتھ انھوں نے اعجاز پرنٹنگ پریس قائم کیا۔ اس ادارے کی جانب سے زبان و ادب کی معیاری کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ بعض کتابیں ادبی ماحول میں بہت

شہرت پا چکی ہیں جیسے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی معراج العاشقین وغیرہ۔ پروفیسر سید محمد کے انتقال کے بعد اشاعت کا سلسلہ بند ہو گیا ہے۔

جناب عابد علی خان مدیر روزنامہ سیاست نے سیاست پبلی کیشن قائم کیا۔ اس ادارے کی جانب سے ادبی، علمی اور مذہبی کتابیں شائع کی گئیں اور حیدرآبادی تہذیب وثقافت کے فروغ و ارتقاء میں ان کتابوں کا اہم رول رہا ہے۔ زاہد علی خان مدیر روزنامہ سیاست کی سرپرستی میں مرقع حیدرآباد، مطبخ حیدرآباد، عکس حیدآباد وغیرہ شائع ہو کر شہرت حاصل کیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال اردو زبان و ادب کے محقق، ادیب، نقاد اور دانشور کہلاتے ہیں وہ ماہ نامہ شگوفہ کی ادارت انجام دے رہے ہیں۔ آپ نے طنزیہ و مزاحیہ ادب کو فروغ و تقویت عطا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی بلکہ اس کے لیے پیدا ہوئے اور وقف ہو گئے اس کے علاوہ انھوں نے اردو کتابوں کی اشاعت کے لیے 1979 میں شگوفہ پبلی کیشن قائم کیا۔ اس ادارے کے تحت ادبی،

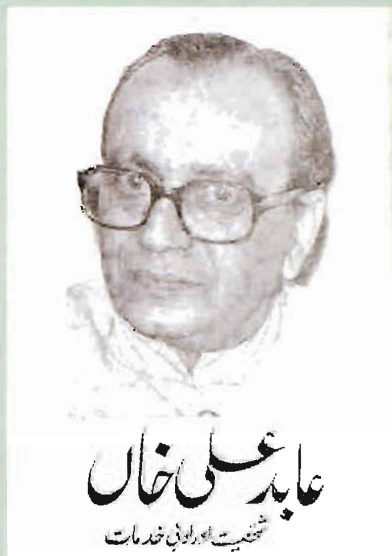

علمی، تعلیمی، طنزیہ و مزاحیہ اور سنجیدہ کتابوں کو بغیر کسی منافع کے شائع کیا اور مصنفین کی ہمت افزائی کی۔ شگوفہ پبلی کیشن کی جانب سے کئی معیاری کتابیں شائع اور مقبول ہوئیں۔

جناب قاسم خان نے اپنے مرشد کے نام سے منسوب کر کے 1954 میں حسامی پبلی کیشن حیدرآباد قائم کیا۔ اس ادارے کا سیلس کاونٹر پتھر گٹی حیدرآباد میں واقع ہے اس ادارے کی بیشمار مطبوعات ہیں۔ اردو کے سرکردہ ادیبوں وشاعروں کی تخلیقات شائع کیں۔ ساحر، خمار وغیرہ کے شعری مجموعے بھی شائع کیے۔ تلگو زبان میں قرآن مجید شائع کیا۔ اس ادارے نے ادبی، تنقیدی، تحقیقی، تعلیمی اور مذہبی کتابیں شائع کی ہیں اور آج یہ سلسلہ موقوف ہو گیا ہے۔

اردو کے شاعر و ادیب اور مدیر گونج جناب جمیل نظام آبادی جو شاعر گر بھی ہیں، نے ادارہ گونج نظام آباد فروری 1973 میں قائم کیا اور اس کے تحت رسالہ گونج کا اجراعمل میں آیا اور ادارہ گونج اپنی سرگرمیوں کے دائرے کو وسیع کرتے ہوئے ایک اشاعتی شعبہ گونج پبلی کیشن 1993 میں قائم کیا اور اس کا سارا اشاعتی کام غیر تجارتی بنیادوں پر کیا جاتا رہا ہے۔ اب تک 75 کتابیں شائع کی ہیں۔ اس ادارے کی جانب سے دکن کے 155 قلمکاروں کی تصاویر پر مشتمل رنگین ادبی البم شائع ہوا ہے۔

ہماری منزل پبلی کیشنز کو اردو کے معروف شاعر و ادیب جناب شفیع اقبال نے جولائی 1993 میں قائم کیا۔ تادم تحریر اس کی 11 کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ شفیع اقبال پرواز دکن کے مدیر ہیں اور ہماری منزل پبلی کیشنز سے معیاری کتابیں شائع ہوتی ہیں۔

اردو زبان و ادب کے شاعر و ادیب و نقاد جناب نادر المسدوسی نے المسدوس پبلی کیشنز حیدرآباد سے قبل اپنے والد بزرگوار مولوی علی المسدوسی جو ایک مدرس اور ممتاز نعت گو شاعر ہیں ان کے انتقال کے بعد ان کے نام سے 2000 میں علی المسدوسی ایجوکیشنل میموریل سوسائٹی قائم کی۔ اس ادارے کے زیر اہتمام اپنی کتابوں تفہیم الایمان 2000' عکس محبوب نگر ایک سو سالہ تاریخ اردو ادب' ضلع محبوب نگر 2005 اور فکر و آگہی 2006 کو منظر عام پر لائے لیکن 2007۔ وہ جناب نادر المسدوسی' المسدوسی پبلی کیشنز کو منظر عام لائے۔ اس طرح اس اشاعتی ادارے کے تحت اب تک 16 کتابیں شائع ہوئیں۔

اردو کے شاعر و فنکار اطیب اعجاز نے 2000 میں اطیب پبلشنگ ہاوز قائم کیا اور ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے علاوہ بیرون ملک مقیم قلم کاروں کی کتابیں شائع کرتے ہیں۔ کئی ایک کتابیں مشہور و مقبول ہوئیں۔

نصاب پبلشرز 2005 میں ایک خاتون نے قائم کیا۔ (نام در پردہ)۔ نصاب پبلشرز حیدرآباد نے اعلیٰ تعلیم کی اردو زبان میں کتابوں کی عدم موجودگی کو دیکھتے ہوئے اردو زبان میں نصابی کتابوں کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا ہے اور ڈگری، پوسٹ گریجویٹ سطح کے نصابی تعلیمی کتابوں کے علاوہ اردو زبان و ادب، عربی ادب و موضوعاتی کتابیں شائع کی ہیں۔ یہ ادارے اردو ذریعہ تعلیم کے طلبہ

اہم ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اس کی جانب سے اب تک 20 کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

ھدی پبلی کیشنز حیدرآباد کو جناب سید عبدالباسط شکیل نے جنوری 2002 میں قائم کیا۔ یہ ادارہ دینی و عصری موضوعات نیز صحت، طب، نفسیات، پرسنالٹی ڈیولپمنٹ، سائنس اور ادب وغیرہ پر اپنی مطبوعات پیش کر رہا ہے۔ کئی اسلامی و غیر اسلامی' ادبی کتابوں کا منبع و مرکز بن گیا ہے۔ طلبہ کی اہم ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کر رہا ہے۔

اردو کے شاعر و ادیب صدیق احمد قیسی قمر نگری نے بزم اردو کرنول پبلشرز 2013 میں قائم کیا۔ اب تک 5 کتابیں شائع کی ہیں۔ اس ادارہ کے تحت ادبی، غیر ادبی، مذہبی مضامین پر مبنی کتابیں شائع ہوئیں۔

علیم صبا نویدی اردو کے معروف شاعر و نقاد نے ٹاملناڈو اردو پبلی کیشنز (مدراس) نے 1967 میں قائم کیا۔ اس کی جانب سے مشاعرہ اور ادبی اجلاس منعقد کرتے تھے۔ اب تک لگ بھگ 300 کتابیں شائع کیں۔

نثار احمد کلیم مقبول شاعر و ادیب نے 1970 میں ایچ کے اے میموریل چیری ٹیبل ٹرسٹ قائم کیا۔ اس کے تحت ادبی، مذہبی، تعلیمی کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ اب تک 20 کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

اردو کے مشہور شاعر و نقاد و صحافی اسعد ثنائی نے 2003 میں الانصار پبلی کیشنز قائم کیا۔ اس کے تحت علمی، ادبی، مذہبی، تعلیمی، تحقیقی، تنقیدی، مزاحیہ مضامین پر مبنی کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ اب تک 6 کتابیں شائع کی گئیں۔

■

Dr. Mohd Nazim Ali, Principal Govt Digree College, Mortar, Distt. Nizamabad (MS)

علیم صبانویدی

تمل ناڈو میں اردو کتابوں کی اشاعت

ماضی اور حال کے تناظر میں

ہندوستان میں طباعت کا آغاز ساحلی علاقوں مثلاً مغربی ساحل گوا، کوئیلان، کوچن، ٹراونکور، ممبئی اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور فورٹ سینٹ جارج کالج، مدراس میں ہوا اور ان علاقوں کو اولیت کا درجہ بھی حاصل ہے۔

ہندوستان میں پہلا چھاپہ خانہ 6 ستمبر 1556 میں گوا میں قائم ہوا جو عیسائی مسیحی ادب کے فروغ کے لیے قائم ہوا تھا۔ اس چھاپہ خانے سے پہلی کتاب پرتگالی زبان میں شائع ہوئی اور اس کتاب کے مصنف سینٹ زےویر (Saint xaveir) تھے۔

ڈاکٹر بمل کمار دت کی تحقیق کے مطابق مدراس میں پہلا چھاپہ خانہ ویپری (Vepery) (پروسوپاکم) مدراس میں قائم ہوا۔ یہ پریس (Diocesan Press) کے نام سے مشہور تھا۔ اس پریس سے پہلی کتاب کپتان ہنری ہیرس (Captain Henry Harris) کی ہندوستانی زبان کا تجزیہ اور اس کے قواعد ولغت (Analysis Grammar and Dictionary of Hindustani Language) 1791 میں شائع ہوئی اور اس کے بعد بہت سی اہم ترین کتابیں فورٹ سینٹ جارج کالج کی جانب سے اشاعت پذیر ہوئیں جن میں وسیط النحو (عربی زبان میں صرف ونحو کی ایک معیاری کتاب ہے) مصنف منشی ابراہیم بیجاپوری (مطبوعہ 1824) (اس کتاب کو ڈاکٹر مسعود حسین خان نے قدیم اردو کا آخری بڑا نثری کارنامہ قرار دیا ہے) 'ایضاح وانکشاف' مصنف سید امیر حیدر بلگرامی (مطبوعہ 1827) 'حکایات الجلیلہ اول' مصنف شمس الدین احمد (مطبوعہ 1836) 'حکایات الجلیلہ دوم' (مطبوعہ 1839) 'فرائض ارتفیہ' اور 'نقود الحساب' اسی پریس سے شائع ہوئے۔ اسی پریس سے 'اخلاق ہندی' کی پہلی جلد اور چہار درویش، 'اخوان الصفا' 'بکاولی' اور 'گلستان' بھی منظر ادب پر آئے۔ ان مطبوعہ کتابوں میں بہت سی کتابیں فورٹ سینٹ جارج کالج کے نصاب میں بھی شامل تھیں۔ تاریخی اعتبار سے شہر مدراس کا یہ پہلا مطبع تھا۔

جناب عتیق صدیقی نے اپنے مضمون 'ہندوستانی اخبار نویسی' میں مدراس کے اس چھاپہ خانے کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب شمالی ہند میں اردو کے چھاپہ خانے کھولے جارہے تھے اور اردو کے اخبارات کے اجرا کا دور بھی شروع ہوا تھا۔

مدراس میں اردو زبان کی طباعت کا ابتدائی دور ٹائپ شدہ حروف سے ہوا۔ 1836 میں مدراس ہی میں لیتھوگرافی کا استعمال شروع ہوا اور مطبع کرشن راج سرکاری مطبع کی حیثیت سے قائم ہوا۔ اس مطبع میں 1844 میں شیریں سخن خان راقم کی میزان الاشعار 1845 میں 'رسالۂ اعظم الصناعۂ' قاضی بدرالدولہ کی 'فوائد بدریہ' اور 'گلزار ہدایت' 1847 میں اور نواب غوث خان اعظم کے دو تاریخ ساز تذکرے 'گلزار اعظم' اور 'صبح وطن' شائع ہوئے۔

ان کتابوں کی اشاعت دو چار سال پہلے اسی اشاعتی ادارے سے ہوئی اردو کا پہلا اخبار 'جامع الاخبار' بھی 1841 میں شائع ہوا تھا۔

فورٹ سینٹ جارج کالج کے شعبۂ تصنیف وتالیف میں ہندوستانی، دکھنی، عربی، فارسی، سنسکرت اور ٹمل زبان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ اس شعبے میں نہ صرف اردو کتابوں کی تالیفات بلکہ ادبی تصانیف کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات پر بھی دکھنی زبان میں کتابیں لکھی گئیں اور یہ کتابیں فورٹ سینٹ جارج کے اپنے پریس میں چھپی ہیں۔ آگے چل کر اس مطبع سے کنڑ اور ملیالم زبانوں کی کتابیں شائع ہوتی رہیں۔

ایک جگہ منشی شمس الدین احمد لکھتے ہیں:

''چرچہ ہر ایک علم کا یہاں تک بڑھا کہ بلدۂ مدراس مخزن ومعدن سب علوم کا بن گیا ہے۔''

(مطبوعہ فورٹ سینٹ جارج کالج ص7 ہفت روزہ 'ہماری زبان' علی گڑھ 8 ستمبر 1970)

1012 میں شہر مدراس میں فورٹ سینٹ جارج قائم ہوا تھا۔ اس کالج کا مقصد ہندوستانی زبان وادب کی خدمات تھا۔ اس کالج میں بہت سے اہم مخطوطات مثلاً شیخ عین الدین کے مذہبی رسالے 'احکام ومسائل'، 'شمس العشاق' (قلمی مخطوطات) اشاعت کے محتاج تھے۔ ولیم ٹیلر (William Tailer) نے فورٹ سینٹ جارج گزٹ پریس قائم کیا اور اس پریس سے تصنیفات اور تالیفات کا اشاعتی کام شروع ہوا۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کا بیان ہے کہ

''ایسٹ انڈیا کمپنی نے جنوبی ہند کی زبانوں میں اردو کی اس قدیم شکل کو 'دکنی' کا نام دے کر اس کی توسیع

واشاعت میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ جہاں کلکتہ میں 'ہندوستانی' میں کتابیں تیار کی جارہی تھیں وہیں مدراس میں اردو کی قدیم زبان 'دکنی' کا پرچار ہورہا تھا۔''

(مقدمات شعروزبان ص 202 مطبوعہ حیدرآباد 1966)

1848 میں مطبع 'اعظم الاخبار' قائم ہوا اور اس مطبع سے 'اعظم الاخبار' جاری ہوا۔ اس اخبار اور مطبع نے اردو زبان وادب کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ اس مطبع کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ڈاکٹر ایڈورڈ بالفور کی 'گلدستۂ سخن' 1851 میں شائع کی۔ اس کتاب کے بعد بہت سی اہم کتابوں کے دوسرے ایڈیشن شائع ہوئے جن میں 'فوائد بدریہ' مصنف قاضی بدرالدولہ، 'اخلاقِ ہندی' اور 'چہار درویش' قابلِ ذکر ہیں۔

'مطبع تعلیم الاخبار' بھی شہر مدراس کا قدیم مطبع تھا۔ اس کی جانب سے 'تعلیم الاخبار' جاری ہوا۔ گارسان دتاسی کا بیان ہے کہ انھوں نے اس اخبار کے کئی شمارے دیکھے تھے جس کا اخبار معیاری بہت اونچا تھا۔''

یہاں چند مندرجۂ ذیل مطابع کے نام اور سنین دیے جارہے ہیں۔

(1) مطبع اسلامیہ (قائم کردہ 1854)
(2) مطبع غوثیہ (قائم کردہ 1854)
(3) مطبع احمدی (قائم کردہ 1845)
(4) مطبع شرفیہ (قائم کردہ 1854)
(5) مطبع خورشید (قائم کردہ 1854)
(6) مطبع فخرالاخبار (قائم کردہ 1847)
(7) مطبع عزیزیہ (قائم کردہ 1854)
(8) مطبع اکبری (قائم کردہ 1840)
(9) مطبع رحمانیہ (قائم کردہ 1854)

ان مندرجۂ بالا مطابع سے نہ صرف اردو کے روز نامے ہفت روزہ، شائع ہوتے تھے بلکہ اس دور کے شعرا کے شعری مجموعے اور علمائے دین کی دینی کتابیں منظر عام پر آئی تھیں۔ بالخصوص 'مطبع غوثیہ' سے روز نامہ 'امیر الاخبار' بالالتزام شائع ہوتا رہا۔ مطبع خورشیدیہ سے ایک اہم معرکۃ الآرا کتاب 'ہندوستانی سیول کورٹ' مترجم سید علی شاہ 1854 میں شائع ہوئی جس کی شہرتیں دور دور تک پہنچیں۔

مندرجۂ بالا مطابع میں جو اخبارات چھپتے تھے ان کی فہرست بھی درج ذیل ہے۔

1. آفتاب عالم تاب 1849 (بحوالہ انیسویں صدی میں مدراس کے اردو اخبار ص 174۔ رسالۂ اردو 1941 مولانا امداد صابری کی اطلاع کے مطابق اس نام کا ایک

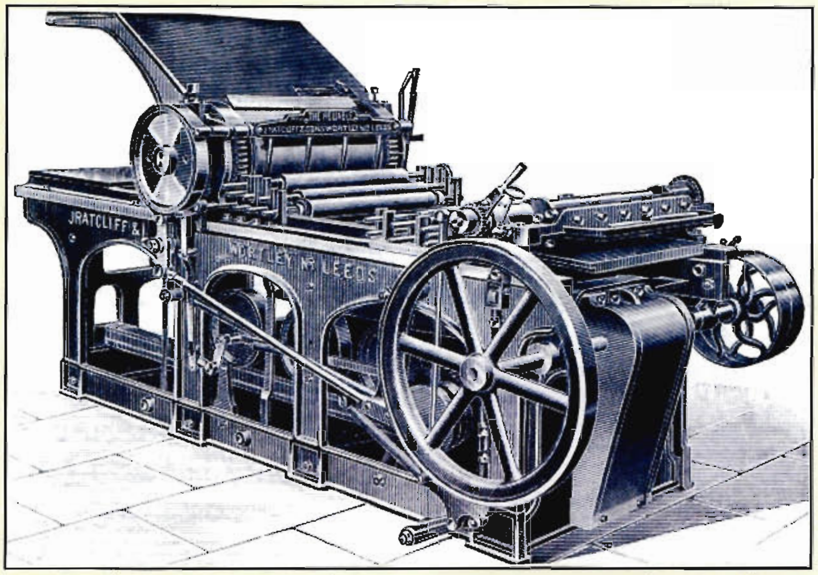

اردو اخبار کشمیری گیٹ آگرہ سے 1861 میں جاری ہوا جس میں بہادر شاہ ظفر کے حالات اور غالب کے خطوط جگہ پائے۔)

2. عمدۃ الاخبار (ہفت روزہ) 1849 (اس نام کا اخبار بریلی سے بھی شائع ہوتا تھا)
3. تعلیم الاخبار (ہفت روزہ) 1851،
4. صبح صادق (ہفت روزہ) 1855
5. طلسم حیرت (روزنامہ) 1856
6. مظہر الاخبار (ہفت روزہ) 1856
7. شمس الاخبار (ہفت روزہ) 1858
8. بزاعظم (روزنامہ 1854)

مولوی نصیر الدین ہاشمی کے اس اخبار کا ذکر 'مدراس میں اردو' کیا ہے۔

9. یادگار زمانہ (ماہنامہ) 1871
10. جریدہ روزگار (ہفت روزہ) 1875
11. عزیز الاخبار (ہفت روزہ) 1882
12. کرناٹک پنچ (روزنامہ 1884
13. جلوۂ سخن (ماہنامہ) 1887
14. مخزن دکن (ہفت روزہ) 1895
15. سورج (ماہنامہ) 1912
16. رسالۂ نور (خواتین کا پہلا اخبار)
17. ریاض الاخبار، ماہنامہ 1916 گارسان دتاسی نے اس اخبار کا ذکر اپنے خطبات میں کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے اس نام کا ایک اور اخبار بمبئی سے بھی نکلتا ہے۔

اسی دور کے آس پاس بہت سے اور مطابع قائم ہوئے جن میں یہاں کے ادبا اور شعرا کی کتابیں شائع ہوئیں۔ وہ حسبِ ذیل ہیں۔

مطبع شاہ الحمید۔ اس مطبع میں 1924 میں نواب عبدالرحمٰن شاطر مدراسی کی کتاب 'قصیدۂ اعجاز عشق' چھپی تھی۔ اس مطبع میں قرآن اور قرآنی تعلیمات کی کتابیں ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوئیں اور آج بھی ہورہی ہیں۔

مطبع نوری: اس پریس میں اردو کی قدیم ٹائپس سے کام لیا جارہا تھا اس پریس سے کئی ایک اہم کتابیں عالم شہود پر آئیں جن میں پروفیسر یوسف کوکن کی تاریخی دستاویز 'اردو فارسی اور عربی ان کرناٹک' اور عزیز الرحمٰن عزیز تمنائی کے اردو سانیٹ کا مجموعہ 'برگِ نوخیز' 1962 میں شائع ہوئے اس سانیٹ کے مجموعے کی اولین اشاعت کا سہرا عزیز تمنائی کے سر جاتا ہے۔ اس پریس سے مدراس یونیورسٹی کے بہت سارے قدیم مخطوطات پروفیسر یوسف کوکن اور منشی سید حمزہ حسین کی نگرانی میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد مولوی قاضی محمد کریم الدین کا شعری مجموعہ 'ریاض دلفریب' بھی شائع ہوا۔

☆ اردو گھر پریس: یہ پریس وشارم (شمالی آرکاٹ) میں جناب احمد باشاہ نے کالج اور اسکول کی اردو کی نصابی کتابوں کی اشاعت کے لیے قائم کیا۔ یہ اردو گھر پریس تقریباً تیس سالوں تک اردو کتابوں کا اشاعتی کام انجام دیتا رہا۔ اس پریس کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس سے کتاب 'وشارم میں اردو' اور شہر مدراس کے 'مخبر اعظم' نواب سی عبدالحکیم کی سوانحی اشاراتی کتاب مولف مولانا مولوی حافظ باقوی رائی چوٹی عالم ظہور پر آئی۔ ٹمل ناڈو میں نواب سی۔ عبدالحکیم کی شخصیت اور ان کے دینی علمی ادبی اور قومی کارنامے سنہری حروف میں لکھے جانے چاہیے۔

☆ شوکت الاسلام پریس یہ پریس ویلور میں 1946

میں قائم ہوا اس پریس نے بھی آرکاٹ ویلور اور وشارم کے شعرا کے شعری مجموعے اور یہاں کے ادبی دینی ماحول میں منعقد ہونے والے ادبی اور دینی اجلاس کی رپورٹیں کتابچوں کی صورت میں شائع ہوتی تھیں۔ 1950 میں یہ پریس بنگلور میں منتقل ہوگیا۔

☆ ناسی پریس: یہ پریس (1920 میں قائم ہوا۔ اس پریس سے مدراس کے مشہور شعرا کے شعری مجموعے شائع ہوئے۔ مولانا مولوی عبدالغفار مسکین کا 'دیوان مسکین' 1924 میں شائع ہوا۔

☆ جی ایس پریس (G.S.Press) اس پریس سے منشی محوی صدیقی کی ترتیب دی ہوئی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ جن میں 'دیوان اظفری' اور 'واقعات اظفری' مصنف مرزا ظہیر الدین علی بخت اظفری مدراس یونیورسٹی کی جانب سے شائع ہوئیں۔ حکیم عثمان سرور آرکاٹی کا شعری مجموعہ اور نواب غوث خان اعظم کا شعری مجموعہ بھی اسی پریس سے شائع ہوئے یہ تمام تر کتابیں آج نایاب ہیں۔

☆ شاہی الکٹرک پریس سے بھی بہت زیادہ شعری مجموعے شائع ہوئے۔ نواب تجمل حسین خان ایمان گوپاموی کے شعری مجموعے اور شمس العلما لسان الحکمت نواب عبدالرحمٰن خان شاطر مدراسی کا طویل قصیدہ 'اعجاز عشق' 1924 میں اور محمد شہاب الدین سلیم ویلوری کا نعتیہ کلام 'مداح نبیؐ' 1926 منظر عام پر آئے۔ مولانا مولوی ابوبکر نظمی کا شعری مجموعہ مرقومِ نظمی بھی اسی پریس سے شائع ہوا تھا۔

☆ مدینہ پریس: اس پریس سے ہزاروں کی تعداد میں علمی ادبی اور دینی کتابیں شائع ہوئیں جن میں چند مشہور کتابوں کے نام یہ ہیں۔

1. فقیر غوث خان عدم مدراسی کا شعری مجموعہ 'جوہر سخن' 1931 میں شائع ہوا۔
2. پروفیسر حسرت سہروردی کا 'تذکرہ شعرائے نظہر نگر' 1952 میں شائع ہوا۔ آج یہ دونوں کتابیں نایاب ہیں۔
3. جناب کاوش بدری کی مثنوی 'قبلہ نما' 1961 میں شائع ہوئی۔
4. جناب علیم صبانویدی اور حسن فیاض کا افسانوی مجموعہ 'روشنی کے کھنڈر' 1967 میں شائع ہوا۔
5. اس پریس سے مدراس یونیورسٹی کی نصابی کتابیں بھی بالالتزام شائع ہوتی رہیں۔
6. اس پریس سے ایک ہفت روزہ 'اتحاد' بھی شائع ہوا جس کے مدیران راز امتیاز اور اعجاز شاکری شامل تھے۔ یہ ہفت روزہ 1987 تک بھی جاری تھا۔ جس کے صفحات پر جو علمی ادبی جنگیں ہوئی وہ آج بھی مدراس کی علمی وصحافتی دنیا کا ایک روشن باب ہیں۔

☆ گوہر پریس سے ڈاکٹر سید صفی اللہ کا تحقیقی مقالہ 'ٹمل ناڈو میں اردو صحافت' اور 'بارہ افسانے' شائع ہوئے۔ شادیوں کے دعوت ناموں کی اشاعت کے سلسلے میں یہ پریس بے حد مشہور ہے۔ آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ مدینہ پریس بند ہوجانے کے بعد مدینہ پریس کی اشاعتی ذمے داریاں مالکِ گوہر پریس محمد غوث نے

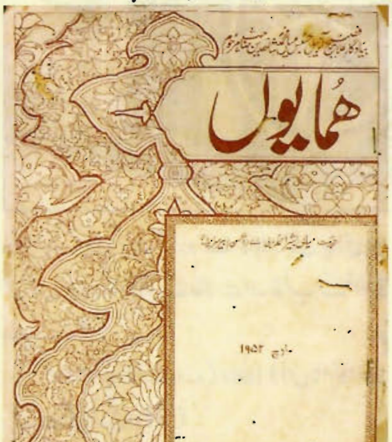

سنبھالی تھیں اور انھوں نے بہت سے اشاعتی کارنامے بھی انجام دیے تھے۔ مدینہ پریس اور گوہر پریس کا نام اور کام تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

☆ شالیمار پریس: اس پریس سے سو سے زیادہ دینی علمی اور ادبی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ چند اہم کتابوں کے نام حسبِ ذیل ہیں۔

1. علیم صبانویدی کا پہلا شعری مجموعہ 'طرح نو' 1974 میں شائع ہوا۔
2. فرحت کیفی کے ترائیلوں کا مجموعہ 'پتہ پتہ بوٹا بوٹا' 1974 میں شائع ہوا۔
3. پروفیسر حیدر علی حیدر کا شعری مجموعہ 'حاصل عمر' 1978 میں شائع ہوا۔
4. ڈاکٹر ذاکرہ غوث کا ترتیب دیا ہوا 'ڈاکٹر عبدالحق کے مکتوبات کا انتخاب 1980 میں شائع ہوا۔

اس پریس سے بہت سے سالنامے ماہنامہ اور پندرہ روزہ رسائل اور اخبارات بھی شائع ہوئے۔ مدرسۂ باقیات صالحات کے چند سالنامے بھی اسی پریس سے اشاعت پذیر ہوئے۔ اس پریس کے مالک چھوٹے یعقوب صاحب نے ایک ہفت روزہ 'فلم دیش' 1964 میں شائع کیا جس میں شکیل بدایونی، کرشن چندر، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی اور امجد حیدرآبادی کی تخلیقات بھی جگہ پاچکی تھیں۔ اس پرچے کے پس منظر میں کام کرنے والا مدیرانہ ذہن راز امتیاز کا تھا۔ دانش فرازی اور کاوش بدری کی شمولیت نے اس پرچے کے معیار کو نورعلی نور بنادیا تھا۔

مندرجہ بالا چھاپہ خانوں سے ہٹ کر مزید دوسرے چھاپہ خانوں نے اردو زبان وادب کی جو خدمات انجام دی ہیں۔ وہ یہ ہیں:

1. شاہی پریس	مالک سید عظمت اللہ
2. ہمدرد پریس	مالک سید محمود باشا
3. سورج پرنٹرس	مالک سید حبیب اللہ عرف انور باشا
4. عثمانی پریس	مالک سید غوث
5. کریمی پریس	مالک محمد اقبال
6. اختر پریس	مالک خلیل احمد خان
7. ہلال پریس	مالک عبدالجبار
8. مجسٹک پریس	(Majastic Press) مالک سید اشفاق حسین
9. اردو پریس	مالک سید عظمت اللہ
10. مجیدیہ پریس	مالک محمد محی الدین
11. عذرا پریس	مالک سید سلطان
12. کم مٹ پریس	مالک محبوب پاشا
13. شاکر پریس	مالک محمد حسین شاکر
14. J.M.Process	مالک جنید محمد سعید

مندرجہ بالا اشاعتی اداروں نے اردو زبان وادب کے جو اگا تار کام انجام دیے ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ ہمدرد پریس، عثمانی پریس، شاکر پریس، عذرا پریس، مجیدیہ پریس اور جے یم پراسس سے ٹمل ناڈو

الاصلاح

کے مشہور ومعروف شعرا کی شعری تخلیقات مثلاً عذرا پریس نے نواب محمد محمود کے شعری مجموعے، امیر النسا کی کتابیں، 'پاکستان کا سفر نامہ' اور 'بند کتاب' (افسانوں کا مجموعہ) مولانا رحیم احمد فاروقی کی تضمینوں کا مجموعہ منظر عام پر آئے۔ شاکر پریس نے مذہبی کتابیں چھاپنے کی مکمل ذمے داری اپنے سر لے لی تھی اور چناؤ کے موسم میں ہنگامی اشتہارات چھاپ کر سیاست دانوں کے نہ صرف مرغوب نظر ہوئے بلکہ معتوب بھی ہوئے۔ 1962 میں اسی پریس سے ہفت روزہ 'شاکر' کا بھی اجرا کیا۔ اس کے مدیرانہ حقوق مولانا مولوی سید عظمت اللہ سرمدی کو سونپ دیے تھے۔ مولانا نے بڑی دلجوئی اور دیانت داری سے دینی مضامین لکھے جس کی وجہ سے شاکر پریس کا نام شہر مدراس میں بے حد نمایاں ہوا۔ مجیدیہ پریس سے حضرت مختار بدری کے تروکورل کی ٹمل نظموں کا ترجمہ 'لفظ لفظ گہر'، 'الف سے ای تک'، 'میری دو بیٹیاں' اور نئی جہتیں شائع ہوئیں۔

جے یم پراسس سے بہت قلیل مدتوں میں دس ہزار سے زیادہ دینی علمی اور شعری کتابیں اشاعت پذیر ہوئیں۔ جن میں چند اہم کتابوں کا ذکر درجِ ذیل میں ہے۔

1. حسن فیاض کے شعری مجموعے 'انداز بیاں' (غزلوں کا مجموعہ) اور 'داستانِ فرات' (منقبتی مجموعہ) اور 'گلزارِ تخیل' (رباعیات کا مجموعہ)

2. علیم صبانویدی کی تحقیقاتی کتابیں

ٹمل ناڈو میں اردو، ٹمل ناڈو کے مشاہیر ادب، ٹمل ناڈو کے صاحب تصنیف علما، ٹمل ناڈو میں نعت گوئی، خواتین ٹمل ناڈو کی علمی وادبی خدمات، "نواب والا جاہ اور مولانا بحر العلوم فرنگی محلی، سفر لاسفر (افسانوی مجموعہ) 'نقش گیر'، "فکر بر' علیم صبانویدی کی غزلوں کے مجموعے 'سمت ساز' علیم کی منی نظمیں 'اردو شاعری میں نئے تجربے' 'اردو نظم کے سلسلے'، 'لمسِ اول'، 'جہانِ نورِ محمدیؐ' وغیرہ

3. حضرت مختار بدری کے ٹمل افسانوں کا ترجمہ 'اسلام الف سے ی تک' میری دو بیٹیاں'، 'مدراس میں مسلمان' 'اردو شاعری میں جانور'، "کوائف وحقائق'، 'اور فرمایا ربِ ذول جلال نے' گذشتہ چند سالوں میں منظر عام پر آئے ہیں۔

4. اکبر زاہد کا شعری مجموعہ 'مٹھی میں سورج'، 'عکسِ وانمباڑی'، 'نقوشِ اسلاف'، 'ایک نیزہ اونچا آسمان' (افسانوی مجموعہ) اور 'تاریخِ جامع دارالسلام' منظرِ عام پر آئے۔

5. منیر رشیدی کا شعری مجموعہ 'شبمنستان'

6. اسلامیہ کالج کا سالنامہ 'مشعل' سی عبدالحکیم کالج کا سالنامہ اور وانمباڑی دوماہنامے 'فروغ اردو' اور 'نشانِ منزل' شائع ہو رہے ہیں۔

7. عتیق جاذب کا شعری مجموعہ اور ٹمل ناڈو کے غزل گوشعرا کا شناخت نامہ (مرتب ڈاکٹر امتیاز) ابھی حال ہی میں منظر عام پر آئے ہیں۔

8. ڈاکٹر سجاد حسین کے ترتیب دیے ہوئے مضامین 'علیم صبانویدی کی تخلیقاتی کائنات' اور ڈاکٹر جمال کے شعری مجموعے 'جمالیات' ڈاکٹر عبیدالرحمٰن احساس کے مقالہ 'ٹمل ناڈو کی اردو انجمیں اور ادارے' اور سرمدی پبلی کیشنز کی جانب سے سجاد بخاری کی ترتیب دی ہوئی بہت ساری کتابیں منصۂ شہود پر آئیں۔

آج کے اشاعتی کارناموں میں جے یم پروسس کا ہم سر کوئی بھی نہیں ہے اور اشاعتی ادارے میں اردو زبان وادب اور قرآنی تعلیماتی کتابوں کو نئی توانائی، نئی روشنی اور نئی زندگی بخشی ہے۔

شہر وانمباڑی شمالی آرکاٹ میں

1. جاوید بک ڈپو اور جاوید پرنٹرس: اس پریس سے بچوں کے ادب پر کئی کتابیں جن میں نصابی کتابوں کے اردو گائیڈس اور ماہنامہ 'چراغِ اردو' آج بھی چھپ رہے ہیں۔ حکیم یعقوب اسلم کی کتابیں 'چہروں کی دیوار' (افسانے) 'دوندیوں کے پار' (غزلوں کا مجموعہ) رسولِ عربیؐ (نعتوں کا مجموعہ) شائع ہو چکے ہیں۔

بحیثیت کل جنوبی ہند میں بالخصوص مدراس کے اخباری مطبعوں میں مقامی اور قومی خبروں کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی خبریں بھی شائع ہوتی رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی غزلیں اور ان غزلوں پر لکھی ہوئی طرحی غزلیں سیف الدین لطیف آرکاٹی کی شائع ہوتی تھیں۔ اس اشاعتی سلسلے میں 'جامع الاخبار' اور 'اعظم الاخبار' نے بڑے جرأت مندانہ قدم اٹھائے تھے اور اس دور کی سیاسی حکمت عملی اور تعصّبانہ پالسیوں پر کڑ تنقیدی روشنی ڈالنے میں بڑی بے باکی سے کام لیا تھا۔

آج شہر ٹمل ناڈو میں جے یم پروسس جن نیک اور صالح محبتوں سے اردو زبان وادب کی خدمت انجام دے رہا ہے وہ یقیناً ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔ جس سے کوئی بھی مورخ چشم پوشی اور اغماض نہیں برت سکتا۔

■

Aleem Saba Navedi, 266, Tritlicane High Road, Sec Floor, Flat no. 16
Raice Mandi Street, Chennai-600005 (T.N.)

اردو زبان میں سائنسی، تکنیکی، حرفتی، پیشہ ورانہ اور اعلیٰ تعلیم کے مسائل

احتشام الحق

اردو زبان میں سائنسی، تکنیکی، حرفتی، پیشہ ورانہ اور اعلیٰ تعلیم پر کئی پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ اردو ہندوستان کی مقبول اور اہم زبانوں میں سے ایک ہے۔ ہندوستان کی بہت بڑی آبادی بلا لحاظ مذہب وعلاقہ اسے بولتی اور سمجھتی ہے۔ پاکستان کی تو خیر قومی زبان ہی ہے۔ دنیا کے دوسرے گوشوں حتیٰ کہ یورپین ممالک میں بھی اس زبان کے سمجھنے اور بولنے والے اچھی تعداد میں موجود ہیں۔ لیکن اس موضوع کی مناسبت سے سب سے اہم مسئلہ زبان بحیثیت ذریعہ تعلیم ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی زبان کے ذریعہ تعلیم ہونے کے لیے اس کا صرف سمجھا جانا اور بولا جانا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے رسم الخط (Script) اور علمی زبان کا جاننا بھی ضروری ہے اور کوئی زبان علمی زبان تب ہوگی جب اس کے اندر دنیا بھر کے مروجہ علوم وافکار کے مسائل وموضوعات کی ہر کیفیت کو اپنی زبان کے مزاج وروایات کے مطابق بیان کرنے کی قدرت موجود ہو۔

عام طور پر جو زبانیں علمی کہی جاتی ہیں ان میں علوم کی اشاعت میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔ یہ بھی قدرتی امر ہے کہ اگر کسی زبان میں علوم کی اشاعت کا تسلسل ٹوٹ جائے تو علوم کی ترقی کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ایک وقفہ کے بعد اس کے بیان پر عبور مشکل ترین امر ہو جاتا ہے اور وقفہ جتنا بڑھے گا مشکل اتنی زیادہ بڑھے گی۔

ماہرین کا خیال ہے کہ مؤثر تعلیم وہی ہوگی جس کا میڈیم مادری زبان ہو۔ چنانچہ ابتدا ہی سے دور رس اور گہری نظر رکھنے والے ہمارے اسلاف نے کوشش کی کہ ہماری زبان اردو کو اس لائق بنایا جائے کہ اس میں ہر طرح کے خیالات کا اظہار ہو سکے اور وہ تعلیم کا میڈیم بن سکے۔ اس سلسلے میں چند شخصیتوں اور چند اداروں کی ناقابل فراموش خدمات رہی ہیں۔ خاص طور پر دلی کالج جس میں سائنسی اور علمی مضامین کی تعلیم کا ذریعہ ہندوستانی تھا اور اس وقت ہندوستانی یہی اردو زبان تھی۔ اس ادارے میں ماسٹر رام چندر کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے جہاں بچوں کو اردو زبان کو میڈیم بنا کر تعلیم دی وہیں اپنے زیر ادارت نکلنے والے اخبار میں ایسے علمی اور سائنسی مضامین کی اشاعت کی جن سے ہماری زبان علمی اور سائنسی زبان کے اظہار کا ذریعہ بن سکے۔ اس کام کے لیے ورنا کلر سوسائٹی قائم کی گئی تھی اور منصوبے کے تحت اس میں سائنس اور دیگر علمی موضوعات کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ اس کے بعد کے زمانے میں علی گڑھ تحریک اور سرسید کی شخصیت ہے، جس نے اس ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور اپنے رفیقوں کے ساتھ خود بھی اس کام کو بخوبی انجام دیا۔ فورٹ ولیم کالج کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں لیکن وہاں محض زبان سے سروکار تھا۔ ان حضرات کی گراں قدر خدمات سے ہماری زبان میں اتنی طاقت آگئی کہ وہ اس وقت کی رائج علمی زبانوں کو بخوبی بیان کر سکے۔ ان کے بعد ایک اہم ادارہ جس نے اردو کو تعلیم کا میڈیم بنانے اور اسے کامیاب طور پر عملی جامہ پہنانے کی نیک خدمات انجام دی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ہے۔ اس ادارے میں دارالترجمہ کا ایک شعبہ ہی اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ دوسری زبانوں کے مفید علمی مضامین کو اردو کے قالب میں ڈھالا جا سکے۔ اس کا یہ شعبہ اردو کے فروغ میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔

ان لوگوں نے محسوس کیا کہ کوئی زبان جب تک وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہوگی تو زندہ نہیں رہ سکتی ہے اور کوئی زبان محض ادب اور شاعری کی بنیاد پر آگے نہیں بڑھتی ہے بلکہ اس کی بنیاد علمی ہوتی ہے۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ ادب؛ علمی زبان کو خیالات کے اظہار کے لیے جن ترسیلی قوتوں کی ضرورت ہے؛ ان کو سہل اور سریع الفہم بناتا ہے۔ اس میں ایسی لفظیات کا اضافہ کرتا ہے جو پیچیدہ خیالات کی ترسیل میں معاون ہوں اور ان کی کیفیات کا بخوبی اظہار ہو سکے۔ انھوں نے دیکھا کہ جو قومیں علمی بنیاد پر جتنی ترقی یافتہ ہیں ان کی زبان دوسری زبانوں پر اتنی ہی فوقیت رکھتی ہے۔ لیکن انگریز جو Devide and Rule کی پالیسی پر عمل کرتے تھے زبان کی بنیاد پر بھی ہندوستانیوں کے درمیان تفریق ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وجہ سے ہندوؤں کا رجحان سنسکرت کی طرف ہو گیا اور ہندی زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ دوسری طرف تقسیم کا سانحہ ہو گیا اور پاکستان کی زبان اردو ٹھہری۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان کی زبان ہندی ہوگئی۔ پھر یہ کہ اردو بولنے والی ایک بڑی آبادی پاکستان منتقل ہوگئی۔ اس طرح اردو میں جو علمی سرمایہ اور علمی دماغ تھا وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اردو رفتہ رفتہ زوال کا شکار ہوگئی اور زمانے کے تقاضوں سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا اور اس کی ارتقائی کڑی بکھر کر رہ گئی۔ اس طرح ایک علمی زبان میں ترسیل کی جو قوت درکار ہوتی ہے اس میں کمی آگئی۔

لیکن ہماری زبان کے علما نے اس فلسفے پر غور کیا اور اپنی زبان کو علمی اور سائنسی زبان سے جوڑنے کی پوری کوشش کرتے رہے۔ اس سلسلے میں موجودہ دور میں دو اداروں کی خدمات نہایت اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جس کا قیام 1996 میں عمل میں آیا۔ یہ ادارہ جہاں اپنے پرانے سرمائے کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے فروغ واشاعت کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا ہے وہیں اپنی زبان کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے سائنسی اور تکنیکی علوم کی کتابوں کو ترجمہ کرا کر شائع کر رہا ہے۔ ساتھ ہی اس نے اردو والوں کو تکنیکی تعلیم سے قریب لانے کے لیے کمپیوٹر کورس کا آغاز کیا ہے جو بڑی کامیابی سے ملک بھر میں فروغ پا رہا ہے۔ اس کے ساتھ حرفتی تعلیم سے اردو کو جوڑنے کے لیے ایک کورس اور لانے کی کوشش کر رہا ہے جس کے لیے موجودہ ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین کی اہم پیش رفت ہے۔ وہ خود بھی سائبر اسپیس اور اردو کے حوالے سے کام کرنے کے ساتھ ساتھ اردو ٹکنالوجی پر بھی کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت کے ذریعے 1998 میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ایک سنٹرل یونیورسٹی کی حیثیت سے قائم ہوئی جو روایتی اور فاصلاتی دونوں طرز پر اردو میڈیم میں کامیابی کے ساتھ تعلیم دے رہی ہے۔ اس یونیورسٹی میں سماجی اور روایتی علوم کے علاوہ پالی ٹیکنک کے چار برانچ، آئی ٹی آئی کے

تین برانچ، ڈگری سطح پر بی ایس سی، بی کام اور پیشہ ورانہ تعلیم میں بی ایڈ، ایم ایڈ، جرنلزم اور ماس کمیونی کیشن وغیرہ کے کورس اردو میڈیم میں موجود ہیں۔ ان کورسوں کا اردو آبادی کی طرف سے بھرپور استقبال بھی ہو رہا ہے۔

ذریعہ تعلیم کی زبان اور عام زبان میں قدرے فرق ہوتا ہے۔ ذریعہ تعلیم ایک علمی زبان ہوتی ہے جس میں ہر فن سے متعلق اپنی اصطلاحات ہوتی ہیں جو کسی بھی مضمون کو بڑی بڑی تشریحات سے بچاتی ہیں۔ وہ اصطلاحات اپنے فن کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جب دلی کالج، علی گڑھ تحریک اور جامعہ عثمانیہ نے اس ضمن میں پیش رفت کی تو اصطلاح سازی پر بھی بھرپور توجہ دی گئی۔ اس سلسلے میں عثمانیہ یونیورسٹی کی ناقابل فراموش خدمات رہی ہیں۔ اسی زمانے میں اصطلاح سازی کے لیے کامیاب اصول بھی بنائے گئے۔ الغرض کسی زبان کو علمی زبان بننے کے لیے جس ترسیلی صلاحیت کی ضرورت ہے اس میں اصطلاحات کی اہمیت مسلم ہے۔ بلاشبہ اردو میں یہ صلاحیت موجود رہی ہے۔ البتہ وقت کے ساتھ نہیں چلتے رہنے کی وجہ سے اس میں ایک خلا ضرور پیدا ہو گیا جس نے چند ایسے مسائل کو جنم دیا ہے کہ اگر ان کی جانب توجہ نہیں دی گئی تو امید بھر کامیابی نہیں مل سکتی ہے۔

موجودہ وقت میں جب کبھی اپنے یا غیر اردو زبان کی خوبیوں پر گفتگو کرتے ہیں تو صرف اس کے رومانی وصف کو بیان کرتے ہیں۔ اردو محبت اور شاعری کی زبان ہے۔ اردو دلوں پر محبت کرتی ہے اور کانوں میں رس گھولتی ہے۔ یہ غزل، قصیدہ اور مرثیہ (عاشقی، خوشامد اور نوحہ و ماتم) کی زبان ہے۔ ہندوستان کی کامیاب فلموں کا راز بھی اردو زبان کی چاشنی ہے۔ اردو زبان کے نغمات مسرور کر دیتے ہیں۔ یہ باتیں سننے میں بھلی لگتی ہیں اور ہم خوش ہو جاتے ہیں اور ان کے منفی پہلوؤں پر غور نہیں کرتے۔ لیکن قابل غور امر یہ ہے کہ کیا رومانی جذبات دائمی ہوتے ہیں؟ رومانیت ایک قسم کی جذباتیت ہے جو دیر تک قائم نہیں رہتی۔ یہ بات صحیح ہے کہ جس کی زبان میں مٹھاس ہوتی ہے وہ دلوں پر حکومت کرتا ہے لیکن ہمیں دلوں کے ساتھ ساتھ جہاں داری و جہاں بانی اور جہاں بینی کا کام بھی کرنا ہوگا جس میں صرف محبت کی زبان بہت دیر تک ہمارا ساتھ نہیں دے سکے گی۔ ہمیں صرف رقص وسرود کی نہیں علم وسائنس کی زبان بھی درکار ہوگی۔ ہماری زبان کی بدقسمتی یہ بھی رہی ہے کہ اس میں علوم کی اشاعت کا تسلسل بھی ٹوٹا ہے۔ ہماری شاعری اور ادب میں زبان کا ایسا تجربہ بھی اب نہیں ہو رہا ہے جو علوم کے پیچیدہ افکار وخیالات کے بیان پر قادر ہو سکے۔ حالانکہ پہلے اردو زبان میں علوم کے فارمولے بھی شعروں میں بیان کیے جاتے تھے۔

اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے میں ان سب کے علاوہ بہت سی مشکلات کا سامنا ہے۔ مثلاً آج لوگوں کا رجحان انگریزی میڈیم کی طرف ہے۔ اس لیے اردو مادری زبان رکھنے والے اردو کی تحریری اور علمی زبان سے نابلد رہ جاتے ہیں۔ دوسری طرف پرائمری اور مڈل سطح پر اردو میڈیم کے جو اسکول ہیں ان میں مناسب تعلیم نہیں ہونے کی وجہ سے عوام کا رجحان ادھر نہیں ہوتا ہے۔ اکثر ریاستوں میں اردو میڈیم اسکول موجود ہی نہیں ہیں۔ سیکنڈری سطح کے اسکول کا تو اور بھی فقدان ہے۔ پھر یہ کہ اردو میں نصاب کی کتابیں بھی دستیاب نہیں ہوتی ہیں۔ اس لیے جو طلبہ ایک زبان کے طور پر پرائمری، مڈل اور سکنڈری سطح پر کسی طور سے اردو پڑھتے بھی ہیں تو اس میں ان کی لیاقت بس واجبی سی ہوتی ہے۔ سیکنڈری کے بعد سینئر سیکنڈری سطح پر اس میں مزید کمی آجاتی ہے۔ ظاہر ہے ایسے بچے جب تکنیکی تعلیم میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنائیں گے تو یہاں پر زبان ان کی سمجھ سے بالاتر ہوگی۔ ایسے میں ان کی یہ تعلیم بھی متاثر ہوگی۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ موجودہ وقت میں دو اداروں نے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا ہے۔ اگر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو نظر میں رکھتے ہوئے اس موضوع پر بات کی جائے تو سب سے پہلے جو بات سامنے آتی ہے وہ مواد کی فراہمی کا ہے۔ نصاب کے مطابق اب بھی بازار میں اردو زبان میں کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ اس لیے جو کتابیں پڑھائی جارہی ہیں وہ انگریزی میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ طلبہ اس سطح پر اتنی لیاقت تو رکھتے نہیں ہیں کہ وہ بہ آسانی ترجمہ بھی کریں اور مواد کو بھی سمجھیں۔ ایسی صورت میں لیاقت بھی متاثر ہوگی اور امتحان میں نمبرات بھی نہیں آئیں گے۔ جو اساتذہ مامور کیے گئے ہیں گرچہ ان کے لیے اردو جاننے کی شرط رکھی گئی ہے لیکن خود ان کی تعلیم انگریزی یا دیگر کسی زبان میں ہوئی ہے اور سردست اردو میں تدریس کے لیے ان کی تربیت کا کوئی نظم بھی نہیں کیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ اردو سے ان کا تعلق بس ذریعہ اظہار کی حد تک ہے۔ وہ بھلا اردو میڈیم میں بخوبی کس طرح تدریس کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ جبکہ اب تو ایسے اساتذہ بھی بحال کیے گئے ہیں جن کا اردو زبان سے ایسا بھی تعلق نہیں ہے۔ خود یونیورسٹی کی پالیسی یہ ہے کہ بازار طلب کو نظر میں رکھتے ہوئے Terms کو انگریزی ہی میں پڑھایا جائے اور درمیان کی چیزیں اردو میں ہوں۔ ایسی زبان کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ نہ اردو ہوتی ہے نہ انگریزی۔ یہ صحیح ہے کہ زندہ زبان نئی ایجادوں کو قبول کرنے سے بھاگتی نہیں ہے لیکن ایک زندہ زبان نئی چیزوں کو اپنے رنگ میں ڈھال کر ہی اسے استعمال میں لاتی ہے۔ اس کے لیے اصطلاح سازی کی ضرورت ہے۔ ایک علمی زبان کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اصطلاح سازی کا کام ہمیشہ جاری رہے۔ تب ہی ایک زندہ زبان کی اپنی خصوصیتیں باقی رہ سکتی ہیں۔ ہمارے لیے ہندی زبان اس کا نمونہ ہے۔ وہ نئے الفاظ کو اپنی اصطلاح دے کر ہی استعمال کرتی ہے۔ خواہ وہ لفظ سنسکرت سے ماخوذ ہونے کی وجہ سے کتنا ہی ثقیل کیوں نہ ہو۔ ان دنوں دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ علمی موضوعات تو درکنار ادبی زبان میں بھی انگریزی الفاظ ہو بہو استعمال کیے جانے لگے ہیں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ اردو میں انجذابی صلاحیت ہے۔ اگر یوں ہی نئے الفاظ اپنی تمام تر خصوصیتوں کے ساتھ لیے جانے لگیں تو بہت جلد یہ زبان دوسری زبان میں ضم ہو کر رہ جائے گی۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے جب اس پیمانے پر اردو کو میڈیم بنایا ہے تو جامعہ عثمانیہ کے طرز پر اسے بھی شعبہ ترجمہ میں اصطلاح سازی پر توجہ دینی چاہیے اور لازمی طور پر ہر کیمپس میں دارالترجمہ کے تحت ایک فرد مامور کرنا چاہیے جو اصطلاح سازی کی خدمت انجام دے اور تدریس میں آنے والی ترجمہ کی پریشانیوں کو حل کرے۔ گرچہ اصطلاح سازی کا کام گروہی (Group work) ہے انفرادی نہیں۔

ایک دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مولانا آزاد قومی یونیورسٹی میں اس وقت تکنیکی تعلیم میں ڈپلوما سطح تک تعلیم جاری ہے۔ ظاہر ہے کہ طلبہ تکمیل کے بعد روزگار سے لگ جائیں گے ایسا ضروری تو نہیں ہے۔ ان میں بہت سے طلبہ ڈگری اور پی جی سطح تک بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اردو

ذریعہ تعلیم سے پڑھنے کے بعد کیا اس سطح پر ان کے ساتھ مسائل نہیں کھڑے ہوں گے۔ ابھی تو نچلی سطح پر کتابیں مفقود ہیں تو آگے کی سطح کا کیا کہنا۔ مستقبل قریب میں ان کے مواد کی دستیابی ممکن بھی نظر نہیں آتی ہے۔

پیشہ ورانہ تعلیم کے حوالہ سے بھی بات کی جائے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ آج صارفیت کا دور ہے۔ بازار میں اس کی کھپت ہے جو بازار کے لائق ہے۔ تعلیم اب بازار کے تقاضے اور ملازمت پر مبنی (Market Based & Job Oriented) ہے۔ بازار کی زبان عالمی طور پر انگریزی ہے۔ کیا اردو میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بازار میں ان کی کھپت دوسروں کی طرح ہوگی؟ یونیورسٹی نے اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر کورس کے ساتھ انگریزی کو بھی شامل کیا ہے۔ لیکن کیا عام طور پر طالب علم اس لائق ہوتے ہیں کہ وہ دو اور تین زبانوں میں بولنے کی مہارت (Communication Skill) پیدا کرسکیں؟ جب ان میں Communication کی کمی ہوگی تو صارفی مزاج بازار کیا انھیں قبول کرلے گا اور قبول کر بھی لے تو کیا ان کی اہمیت بھی دوسروں کی طرح ہی ہوگی؟ ہوسکتا ہے کہ ملازمت ملنے پر ذہین اور باصلاحیت طلبہ اپنی قابلیت ثابت کر لیں۔ لیکن ابتدا میں ہی اردو میڈیم ہونے کی وجہ سے ملازمت سے انکار ہوگا تو وہ اپنی قابلیت کا اظہار کہاں کریں گے؟ اور جب بازار میں اردو زبان میں تعلیم کی وجہ سے ملازمت میں امتیازی سلوک سہنا پڑا تو اس کے منفی اثرات ظاہر ہوں گے۔ آج جبکہ اعلی اور کم از کم پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل ایجوکیشن کا بنیادی مقصد ہی کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت کا حصول ہے تو کیونکر کوئی محض زبان کی وجہ سے یہ مواقع کھوئے گا۔

یہ ایک شبہ ہے۔ لیکن شبہے کی بنیاد پر اس سے منہ موڑا نہیں جاسکتا۔ ہاں یہ ضروری ہے جن طلبہ نے اس سے رشتہ جوڑا ہے ان کے والدین جن کی مادری زبان اردو ہے اور جن کی تہذیب اس سے وابستہ ہے وہ کوشش کریں کہ ان کے بچے بازار کے تقاضوں پر کھرے اتریں۔ کیوں کہ زمانے سے ہم آہنگ نہ ہوکر ان کی زبان مرجائے گی تو ان کی تہذیب بھی ان کے ہاتھوں سے جاتی رہے گی تب ان کا ہونا اور نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیوں کہ قومیں اپنی مخصوص تہذیب، مسلمات اور عقائد ہی سے پہچانی جاتی ہیں۔

مختصر یہ کہ اردو میں تکنیکی تعلیم دی جاسکتی ہے۔ اس راہ میں چند رکاوٹیں ضرور ہیں۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ابھی یہ عمل تشکیلی حالت میں ہے۔ آئندہ بھی اسی صورت میں کام جاری رہا ہے تو ان پر قابو پالیا جائے گا۔ اگر ابھی سے ہی شبہات اور مسائل کو دیکھتے ہوئے اس سے فرار اختیار کیا جانے لگے تو ہماری زبان کی ترقی نہیں ہوسکے گی۔

ان سب کے علاوہ ہمیں زبان کے فروغ کے لیے ایک ہدف مقرر کے اپنی زبان کو تحقیق و ایجادات کی سطح تک لے جانا ہوگا۔ جب ہم اپنی زبان میں نئی تحقیقات اور ایجادات لائیں گے تو دوسرے لوگ بھی ہماری زبان پڑھنے پر مجبور ہوں گے اور تبھی جاکر زبان کو بھی بقائے دوام حاصل ہوسکتا ہے۔ حالانکہ یہ مشکل بھی ہوگا اور دقت طلب بھی۔ خود آمادگی کی ضرورت بھی ہوگی اور ذہن سازی کی بھی۔

ہمیں اردو زبان میں علمی وسائنسی تحقیقات کو فروغ دینے کے لیے ہر چھوٹے بڑے شہر میں ایسے رائٹرز گلڈر کلب کی تشکیل کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے جہاں طلبہ

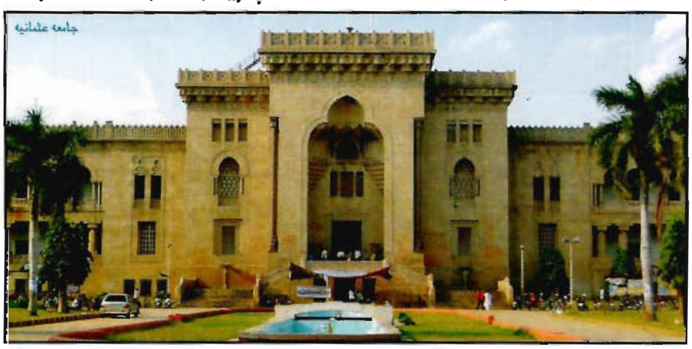

وطالبات، شوقین حضرات وخواتین اور دانشوران ماہانہ یا سہ ماہی طور پر بیٹھ کر ادب کے ساتھ علمی وسائنسی زبانوں پر ٹوٹی پھوٹی زبان میں ہی صحیح پرچے پیش کریں۔ جس طرح کہ ہر چھوٹے بڑے شہروں میں شعری نشستوں کا انعقاد ہوتا ہے۔ اس سے ہماری زبان میں لکھنے والوں میں تو اضافہ ہوگا ہی۔ انہی میں سے کوئی آئندہ سائنس اور دیگر علوم کا ماہر ہوگا تو اردو زبان میں کوئی علمی خدمت بھی انجام دینے کا حوصلہ رکھے گا۔ اس طرح کی نشستوں میں اگر ان میں ایک شخص ایسا ہو جو زبان کا ماہر ہو اور پرچے پیش کردینے کے بعد زبان کو صحیح کرنے کے قواعد کے نکات بتادے تو رفتہ رفتہ ان کی زبان بھی درست ہوجائے گی۔ انہی پرچوں میں اگر کسی کو اخبارات اور رسالوں میں جگہ مل گئی تو حوصلہ بلند ہوگا اور معیار لانے کی کوشش کرے گا۔

قابل توجہ امر یہ بھی ہے کہ ہندوستان بھر میں موجود اردو اکاڈمیوں کی جانب سے ہر سال سیکڑوں سیمینار منعقد کیے جاتے ہیں اور کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی تعاون دیا جاتا ہے لیکن ان میں بیشتر ادب سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس میں اکاڈمیوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے پاس سائنس وٹکنالوجی اور دیگر فکری علوم کے لیے منصوبے ہی موصول نہیں ہوتے۔

اس سلسلے میں اکاڈمیوں کی جانب سے یہ اقدام کیا جاسکتا ہے کہ 50 فیصد سائنسی وعلمی سیمیناروں کے انعقاد اور 50 فیصد سائنسی وعلمی کتابوں کی اشاعت کے لیے رقم مختص کردی جائے۔ ہر سال سائنس اور علوم کی اعلیٰ تحقیقات پر مبنی عمدہ کتابوں کا ترجمے شائع کرائے جائیں۔ ہر سال اردو میڈیم میں سائنس، ٹکنالوجی اور علوم کی اشاعت میں نمایاں کارکردگی انجام دینے والوں کو صوبائی اور مرکزی سطح کا کوئی اعلیٰ ایوارڈ دیا جائے۔

اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کی بھی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ عام طور اس طرح کے اسکول بے بسی و بدحالی کی منہ بولتی تصویر ہوتے ہیں اور ان کے بچوں کے چہرے سے مفلسی ٹپکتی ہوتی ہے۔ ان اسکولوں کے طلبہ وطالبات میں نصابی وہم نصابی سرگرمیاں مفقود ہوتی ہیں۔ قومی ریاستی وظیفوں میں ان پر خصوصی توجہ دی جانی چاہیے۔

اس وقت پری پرائمری تعلیم کے لیے سمعی بصری آلات استعمال کر کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو حروف تہجی، اعداد، Rhymes اور کہانیوں کے ذریعے ہلکی پھلکی اور بوجھ ڈالے بغیر تعلیم دی جارہی ہے۔ اردو زبان میں ایسے وسائل انکار کی حد تک محدود ہیں اور جو ویڈیوز ویب سائٹ پر ملتے ہیں وہ انتہائی ناقص ہوتے ہیں جبکہ دیگر زبانوں کے اتنے خوبصورت دلچسپ اور بہترین ہوتے ہیں کہ جی خوش ہوجاتا ہے اور بچہ ان سے راغب ہوتا ہے۔ انگریزی کے علاوہ عربی وفارسی میں بہت اچھی اچھی ویڈیو موجود ہے۔ اکاڈمیوں کو اس جانب بھی توجہ دینی چاہیے تاکہ بچوں کو دوسری زبانوں کی طرح نئی ٹکنالوجی کے ذریعے تعلیم دے کر اپنی مادری زبان سے وابستہ وپیوستہ رکھا جاسکے۔ یہ وقت کے تقاضے ہیں اور خود کو باقی رکھنے کے ان تقاضوں کو بھی پورا کرنا ہوگا۔

عام طور پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ برصغیر میں اردو ہماری مذہبی تعلیم اور تہذیب کی محافظ اور معلم ہے۔ ہمیں دینیات کی تعلیم کے لیے بھی ایسے تعلیمی ویڈیوز کی تیاری کی کوشش کرنی چاہیے۔ ■

Ehteshamul Haque, Faculty CABA MDTP Centre 1334, Darul Uloom Ahmadia Salafia, Darbhanga - 846001 (BIHAR)

دیوان حنان خان

احتجاج کی منفرد آواز
فیض

فیض کا شمار بیسویں صدی کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ان کا تعلق ترقی پسند مکتب فکر سے تھا۔ وہ نہ صرف نظریاتی اعتبار سے ترقی پسند تھے بلکہ عملی طور پر بھی انھوں نے اپنے ترقی پسند ہونے کا ثبوت دیا۔ایک شاعر،صحافی، ٹریڈ یونین لیڈر اور فوجی افسر کی حیثیت سے انھوں نے غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کے دکھ درد کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ ان کے مداوا کے لیے ہمیشہ کوشاں بھی رہے۔جس عہد میں انھوں نے شعر گوئی کی شروعات کی وہ ہندوستان کے ساتھ ساتھ پوری دنیا میں انقلابی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف آزادی کی جدوجہد پورے شدومد کے ساتھ جاری تھی۔مختلف افریقی ممالک میں بھی آزادی کی لہر چل رہی تھی۔پہلی عالمی جنگ گو کہ ختم ہو چکی تھی لیکن اس کے اثرات پوری دنیا میں نمایاں تھے۔دوسری عالمی جنگ کا خطرہ منڈلا رہا تھا۔ 1917 میں روس میں زار شاہی کا خاتمہ اور اشتراکی حکومت کا قیام اس دور کا ایک ایسا تاریخ ساز واقعہ تھا جس نے پوری دنیا کے کمزور اور غریب عوام کو ایک نیا جوش و جذبہ عطا کیا تھا اور وہ استعماری اور سامراجی قوتوں کے خلاف سینہ سپر ہو رہے تھے۔فیض نے بھی کہا تھا:

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

نظم 'بول' کے یہ اشعار دبے کچلے کمزور انسانوں کو صدیوں سے جاری ظلم واستحصال کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے اور اس کا خاتمہ کر دینے کی دعوت دیتے ہیں:

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر اک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

فیض احمد فیض کے یہ اشعار ان کی شاعری میں احتجاج کی نوعیت کو بخوبی واضح کرتے ہیں۔فیض کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے پوری دنیا کے مجبور ومظلوم اور کمزور انسانوں کے دکھ درد کو اپنا سمجھا اور زندگی بھر اس کے خلاف اپنے قلم کے ذریعے برسرِ پیکار رہے۔ وہ صرف اپنی زباں بندی کے خلاف احتجاج نہیں کرتے بلکہ جہاں بھی انسانی حقوق کی پامالی ہو رہی ہے یا عوامی آواز کو دبانے کی کوشش ہو رہی ہے،فیض اس کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔آزادی سے قبل کے دنوں میں جہاں انھوں نے انگریزی سامراج کی ظالمانہ اور استحصال پسندانہ پالیسیوں کو موضوع بنایا وہیں آزادی کے بعد خود اپنے لوگوں نے عوام پر جو ظلم و جبر کیا اس پر بھی کھل کر لکھا۔ان کی نظم 'صبح آزادی' اس کا بیّن ثبوت ہے۔فیض نے آزادی کے بعد ملک میں ہونے والے فسادات،قتل و خوں ریزی،عورتوں کی بے حرمتی، حکمرانوں کی بے حسی اور مغربی سامراجی طاقتوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بنے رہنے پر شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ان کی نظموں اور غزلوں میں مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کے مسائل و مصائب،سرمایہ داروں کے ہاتھوں ان کے استحصال، دولت مندوں کی عیش پسندی،

ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر۔

اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدوجہد چاہتے ہیں۔'' آگے لکھتے ہیں:

''حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک، اور اس جدوجہد میں حسب توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔'' (ابتدائیہ 'دست صبا')

انسانی زندگی کی اجتماعی جدوجہد اور اس میں حسب توفیق شرکت کا تقاضا ہی تھا کہ فیض نے عملی طور بھی ظلم وجبر اور استحصال کے خلاف جنگ میں نمایاں حصہ لیا اور حکمراں طبقے کی طرف سے معتوب قرار دیے گئے۔ ان کی زندگی کا خاصا وقت جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرا۔ لیکن وہ اس سے بد دل نہیں ہوئے بلکہ اور شدومد کے ساتھ حکومت کی عوام دشمن پالیسیوں کی مخالفت کی۔ جب انھیں راول پنڈی سازش کیس میں حکومت کا تختہ پلٹنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تو فیض نے وہ مشہور زمانہ غزل کہی جس کا یہ شعر زباں زد عام ہے:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

اس صورت حال پر فیض کے یہ دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے، عتاب، جرم سخن سے پہلے
نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خرد پہ دیوانہ پن سے پہلے

دوران اسیری فیض نے 'نثار میں تیری گلیوں کے...' جیسی شاہکار نظم لکھی جس میں ظلم و ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو گرفتار کیے جانے اور ظالموں، فسادیوں، سازش کرنے والوں اور مجرموں کو کھلی چھوٹ دینے پر چوٹ کی گئی ہے۔ نظم کے مندرجہ ذیل بند میں اس صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے:

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بست وکشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

پاکستان میں زیادہ تر فوجی آمریت کا غلبہ رہا ہے۔ عوام کی منتخب کردہ حکومتیں معزول ہوتی رہیں اور زمام اقتدار فوج کے ہاتھوں میں رہی۔ ایسے میں جمہوریت اور جمہوری اقدار کا قتل فطری تھا۔ بار بار ایمرجنسی کے نفاذ اور تحریر و تقریر پر پابندی پاکستانی عوام کا مقدر بنتی رہی۔ فیض نے

ماسکو میں فیض لینن پرائز حاصل کرتے ہوئے

سماج میں موجود عدم مساوات، سیاسی لیڈروں کی عیاری و مکاری، مارشل لا، زبان و بیان اور تحریر و تقریر پر پابندی، ملک کی ابتر صورت حال، سقوط بنگلہ دیش کے علاوہ بین الاقوامی مسائل مثلاً افریقی ممالک کی جدوجہد آزادی، فلسطینی عوام کی بے گھری وغیرہ پر بھی زبردست احتجاج ملتا ہے۔

اشفاق حسین فیض کی شاعری کے اس پہلو کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اپنے دیس کے علاوہ جہاں کہیں بھی کوئی عوامی تحریک اٹھی ہے یا آزادی کی کوئی جنگ لڑی گئی ہے، فیض کا قلم ہمیشہ ان کی حمایت میں اٹھا ہے۔ ایران کے طالب علموں کی جدوجہد ہو یا ویت نامی اور فلسطینی عوام کے حقوق آزادی کی جنگ ہو، فیض نے اپنی شاعری کے ذریعے ان سب کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس لیے ان کی شاعری آزادی اور امن کی شاعری ہے۔''

(مطالعہ فیض امریکہ و کینیڈا میں، ص 35)

فیض کی احتجاجی شاعری کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے خالد سہیل نے لکھا ہے کہ

''فیض کو جب انفرادی، اجتماعی اور تاریخی عوامل کا شعور حاصل ہوا اور اس پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ لاکھوں انسان ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں تو کسی بھی حساس انسان اور شاعر کی طرح اس کے دل میں بھی ظالموں کے خلاف غصے اور نفرت کا لاوا ابھرا اور اس کے اشعار میں بہنے لگا۔ اس نے استحصال کی چکی میں پسنے والے عوام کو نہ صرف عمل کی دعوت دی بلکہ جارحانہ عمل کی دعوت دی۔ اس نے جنگ کا اعلان کیا اور انقلاب لانے کے ترانے گانے شروع کیے:

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے
سر پھوٹیں گے خون بہے گا
خون میں غم بھی بہہ جائیں گے
ہم نہ رہیں غم بھی نہ رہے گا

(خالد سہیل: مضمون 'فیض شہر آزادی کا مسافر' مشمولہ 'مطالعہ فیض: امریکہ و کینیڈا میں' ص 128)

فیض دراصل شاعر انسانیت تھے۔ جب کبھی انسانیت پر ضرب پڑی، جب کبھی کسی کمزور پر طاقتور کا ہاتھ اٹھا، کسی مزدور کا استحصال ہوا، کسی کسان کو فاقہ کشی کا شکار ہونا پڑا یا کسی کی حق تلفی ہوئی، فیض کا دل مضطرب ہوا اور انھوں نے اس سماجی و سیاسی نظام کو بدلنے کے لیے اپنے اشعار کے ذریعے رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔ نظم 'رقیب سے' میں کہتے ہیں:

جب کبھی بیٹھ کے روتے ہیں وہ بیکس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

نظم موضوع سخن میں وہ سوال کرتے ہیں:

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟
یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا؟
کس لیے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے؟

فیض نے 'دست صبا' کے ابتدائیہ میں لکھا تھا:

''شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے، اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز

ہمیشہ اس کی مخالفت کی۔ خواہ ایوب خاں کا دور ہو یا یحییٰ خاں کا یا جنرل ضیاء الحق کا، ان کا قلم کبھی مصلحتوں کے تابع نہیں رہا۔ انھوں نے ہمیشہ عوامی جذبات و احساسات کی قدر پر زور دیا اور ناانصافیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ایوب خاں کے زمانے میں جب مارشل لا نافذ ہوا تو تمام مخالفین قید کر لیے گئے۔ اس زمانے میں فیض نے اپنی نظم 'یہاں سے شہر کو دیکھو' کہی۔ اس کے دو بند ملاحظہ کیجیے:

یہاں سے شہر کو دیکھو تو حلقہ در حلقہ
کھنچی ہے جیل کی صورت ہر ایک سمت فصیل
ہر ایک راہگزر گردش اسیراں ہے
نہ سنگ میل، نہ منزل، نہ مخلصی کی سبیل

جو کوئی تیز چلے رہ تو پوچھتا ہے سوال
کہ ٹوکنے کوئی للکار کیوں نہیں آئی
جو کوئی ہاتھ ہلائے تو وہم کو ہے سوال
کوئی چھنک کوئی جھنکار کیوں نہیں آئی

آمریت نے عوام پر جو ستم ڈھائے ان کی عکاسی 'لہو کا سراغ' اور 'ایک شہر آشوب کا آغاز' وغیرہ نظموں میں بھی کی گئی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوری حکومت کو ختم کر کے جنرل ضیاء الحق نے جب حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی تو فیض نے لکھا:

مرے دل مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم

'ظالم' اور 'ہم تو مجبور وفا ہیں' وغیرہ نظموں کا موضوع بھی یہی ہے۔

شاعر اس صورت حال سے نالاں ہے اور اس کے خاتمے کا آرزو مند ہے۔ اس لیے وہ عوام کو اٹھ کھڑے ہونے اور ظالموں کے تخت و تاج کو اچھالنے کا مشورہ دیتا ہے۔ ترانہ کے یہ چند اشعار اسی حقیقت کی غمازی کرتے ہیں:

اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں، اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
اے ظلم کے ماروں لب کھولو، چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اٹھے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے

فیض کی نظم 'کتے' ایک زبردست استعاراتی نظم ہے جس میں عوام کو اپنی پریشانیوں اور مصائب کے

بی بی سی کے ایک مشاعرے میں بائیں سے افتخار عارف، بلقیس دهلوی، شہرت بخاری، گوپی چند نارنگ، فیض اور زہرا نگاہ

خاتمے کے لیے بغاوت کا درس دیا گیا ہے۔ دیکھیے نظم کے آخری شعر میں فیض کس طرح اس مظلوم طبقے کو بیدار کر رہے ہیں:

کوئی ان کو احساس ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے

مغربی پاکستان کی فوج نے 1971 میں آزادی کا مطالبہ کرنے والے نہتے بنگلہ دیشیوں (اس وقت کا مشرقی پاکستان) کے ساتھ جس ظلم و بربریت کا سلوک کیا، وہ انسانیت کو شرمسار کرنے والا تھا۔ اس صورت حال پر فیض نے نظم 'ڈھاکہ سے واپسی پر' لکھی۔

اس نظم کے دو اشعار پیش ہیں:

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

فلسطینی عوام کی دربدری اور کرب ناک زندگی فیض کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے۔ انھوں نے فلسطینیوں کی حالت زار پر کئی نظمیں کہیں جن میں 'عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا'، 'فلسطینی بچے کے لیے لوری' اور 'فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے' اہم ہیں۔

فیض کی احتجاجی شاعری کی خوبی یہ ہے کہ اس میں چند مقامات کو چھوڑ کر کہیں بھی ان کا لب ولہجہ اونچا نہیں ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی ان کی نظموں کی اس خصوصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''فیض کی شاعری میں دل گرفتگی اور ملال کا عنصر طمانیت اور سرخوشی کے احساس پر غالب ہے۔ ایسا شاید اسی لیے ہے کہ فیض اجتماعی آشوب کی عکاسی کے باوجود، بنیادی طور پر تخلیقی تنہائی کے تجربے سے بالعموم کنارہ کش نہیں ہوتے۔ ان کا احتجاج بھی، جس کے واسطے سے وہ انسانوں کے ایک گروہ کی ترجمانی کرتے ہیں اور صرف اپنی ہستی کے پابند نہیں رہ جاتے، بڑی حد تک ایک زیر لب، بلکہ ایک خاموش احتجاج کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اونچی، کھلی ڈلی آواز میں بہت کم بات کرتے ہیں۔ جن نظموں میں ان کا آہنگ قدرے اونچا محسوس ہوتا ہے، مثال کے طور پر 'آجاؤ ایفریقہ' یا زندگی کے آخری دور کی نظم 'ہم دیکھیں گے، لازم ہے کہ ہم دیکھیں گے' تو اس نوع کی نظموں میں بھی اداسی کی ایک لہر جوشیلے جذبات کی ہم رکاب دکھائی دیتی ہے۔

نظم چاہے جتنی بلند آہنگ اور انقلابی ہو، آہستہ روی اور نرمی کا تاثر برقرار رہتا ہے۔ نعرہ نغمے میں ڈھل جاتا ہے اور برہمی سرگوشی بن جاتی ہے۔ (خیال کی مسافت، ص 412)

فیض کی احتجاجی شاعری کی سب سے بڑی خوبی ان کی رجائیت پسندی ہے۔ وہ حالات سے مغموم ضرور ہیں لیکن مایوس نہیں ہیں۔ وہ ظلم واستحصال کے خاتمے اور امن عالم کے قیام کے لیے عمر بھر کوشاں رہے اور کبھی حالات کے سامنے سپر نہیں ڈالا۔ فیض کو اس بات کا اطمینان ہے کہ انھوں نے مقدور بھر ناانصافی اور ظلم کے خاتمے کے لیے جدوجہد کی اور ایک ایسی صبح کا خواب دیکھا جس میں عدل و انصاف ہو، امن و مساوات ہو اور خوشی اور آسودگی ہو۔ انھیں اس کا افسوس نہیں کہ وہ یہ روشن صبح نہ دیکھ سکے۔ انھیں پوری امید تھی کہ آنے والی نسلیں یہ روشن صبح ضرور دیکھیں گی۔ انھی کے لفظوں میں:

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم

■

Dr. Deewan Hannan Khan, Associate Prof, Dept of Education in Languages, NCERT, New Delhi - 110017

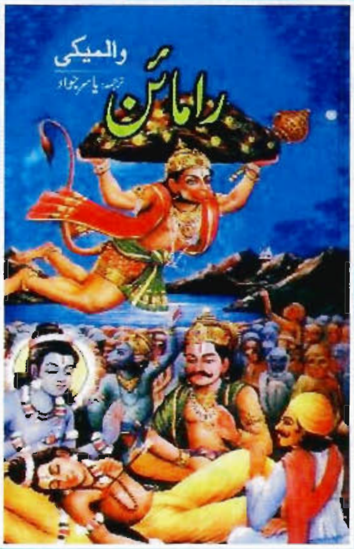

رامائن، مسلمان اور اردو

ثوبان سعید

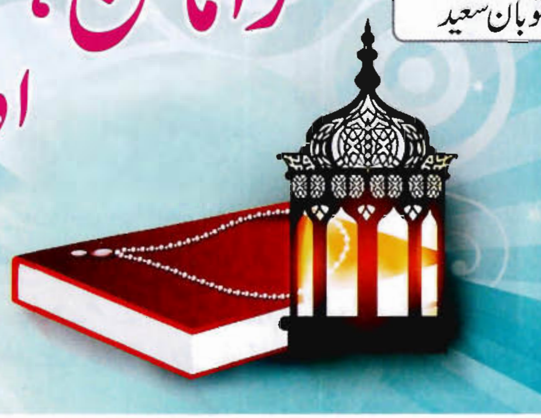

شری رام چندر جی کی ذات، ان کی نورانی اور فرض شناس شخصیت اور ان کے کردار کی عظمت و بلندی کے جونقوش رامائنوں اور رام کتھاؤں کی شکل میں ہندی زبان وادب کے ادیبوں، ہندو مذہب کے پیروکاروں اور عقیدت مندوں کے دل ودماغ پر ثبت ہیں انھی قدسی تصورات، پاکیزہ خیالات اور انھی عقیدت واحترام کا اظہار مسلم دانش وروں، ادیبوں اور شاعروں نے بھی اپنی تخلیقات میں کیا ہے۔ رام کتھا اور رام چندر جی سے عقیدت کے معاملے میں مسلمان دوسرے عقیدت مندوں سے ذرا بھی پیچھے نہیں ہیں، کمیت وکیفیت کا فرق اور تناسب یقینی طور سے مختلف ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے میرا ماننا ہے کہ اس کی پشت پر مذہبی عقیدت کے ساتھ ساتھ تہذیب وثقافت اور مخصوص فکری نقطۂ نظر کا بھی اہم کردار ہوسکتا ہے۔ بہر حال یہ ایک دوسرا موضوع ہے جو فی الحال ہمارے دائرے سے باہر بھی۔

جہاں تک ہندی زبان وادب کی بات ہے، تو اگر ہندی زبان وادب کی تاریخ سے ان ادیبوں اور شاعروں کے نام نکال دیے جائیں جو مذہبی طور سے مسلمان تھے تو یہ حقیقت بہت واضح اور روشن ہوکر سامنے آئے گی کہ ان ناموں کے بغیر ہندی کی فہرست ناتمامی کا شکار ہے اور یہ ادب کس قدر تہی دامن ہوگیا ہے۔ شری رام چندر جی کی جنم بھومی اجودھیا کی اودھی زبان میں لکھی گئی عظیم شاعر تلسی داس سے پہلے بھی تخلیقِ ادب کی ایک مضبوط، توانا اور قابل تعریف روایت رہی ہے، اور ان شاعروں میں بابا فرید، ملا داؤد، قطبن اور ملک محمد جائسی کے نام خصوصی طور سے قابل ذکر ہیں۔

رامائن اور مسلمان

قرآن مجید میں اس حقیقت کو بہت واضح طور سے بیان کیا گیا ہے کہ خدا نے اپنے انبیا و رسل دنیا کے ہر علاقے میں بھیجے جو وہاں کے لوگوں کو انھی کی زبان میں سیدھے راستے پر چلنے کی تلقین کرتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ مسلمانوں کا یہی عقیدہ اور مذہبی رواداری کا یہی تصور انھیں دوسرے مذاہب کے رہنماؤں، سنتوں اور نیک لوگوں کی عزت واحترام کے آداب سکھاتا ہے اور انھیں اس امر کی تعلیم دیتا ہے کہ مسلمان دوسرے مذاہب کے لیڈروں، رہنماؤں، صوفیوں اور پیشواؤں کا ذکر ادب اور عزت واحترام سے کریں۔ اسی مذہبی تعلیم، مذہبی رواداری اور مذاہبِ غیر کے پیشواؤں کی عزت وتوقیر کے جذبے کے تحت کبیر سے لے کر رس خان تک ایسے بہت سارے مسلم ادیب اور دانشور پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے رام، رحیم اور گووند میں فکری سطح پر کوئی فرق محسوس نہیں کیا، کوئی امتیاز روا نہیں رکھا۔ رام کی شان میں نظمیں اور قصیدے لکھ کر ان شاعروں کو اسی روحانی سکون، سکھ اور شانتی کا احساس ہوتا تھا جس سکون کا احساس کسی اسلامی شخصیت کی شان میں عقیدت کے پھول نچھاور کرکے انھیں ہوتا تھا۔ اس زاویے سے اگر ہم دیکھیں تو اس نتیجے تک بہ آسانی پہنچ سکتے ہیں کہ مسلم ادیبوں کا فکری رویہ دراصل تاریخی، مذہبی، سماجی اور تہذیبی سطح پر ایک سیکولر، غیر مذہبی، اخوت ومساوات، مذہبی رواداری، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کے تصورات سے تشکیل پاتا ہے۔

'ہری ہو ہری ہو ہری گتی میری' کا منتر پڑھنے والے سید مبارک، 'رام رحمان کہے مہی بھید نہ، مان نہ مان انو مان ہیے تے' اور 'سُبس بسو وہ دیش جہاں ہوت ہری بھجن نِت' جپنے والے سید نظام الدین، 'ہمارے ہری بِن اور نہ کوے' اور 'ہم تو رام مڈیا پائی' کے خالق شاہ برکت اللہ وغیرہ نے رام کے استعارے کی مدد سے قومی ایکتا، قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فکری تصورات کو ہی آگے بڑھایا ہے۔

مسلم ادیبوں اور شاعروں میں شری رام کی کتھا کی ابتدا ہندی ادب کے بنیاد گزار امیر خسرو کی کہہ مکرنیوں سے ہوتی ہے، خسرو نے اپنی کہہ مکرنیوں میں شری رام کی عظمت کے گیت ان الفاظ میں گائے:

تن من دھن کا وہ ہے مالک
وا نے دیا مرے گود میں بالک
وا سے نِکست جی کو کام
اے سکھی ساجن، نا سکھی رام

مشہور صوفی کبیر داس کے فرزند کمال بھی رام کی عظمت کے قائل ہیں:

رام کے نام سو کام ہرن بھیو
لکشمن نام سے لکش پایو

ایک اور صوفی شاعر رجب جی رام کی عقیدت میں یوں رطب اللسان ہیں:

جاتی پاتی کل سب گئے رام نام کے سنگ
رجّب لاگا لاہ جیوں، پارس کا پرسنگ

اکبر اعظم کے اتالیق بیرم خاں کے صاحب زادے اور تلسی داس کے ہم عصر عبد الرحیم خانِ خاناں نے تو رام

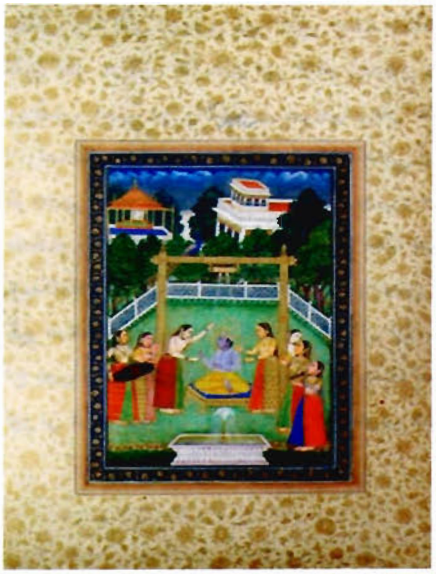

چرت مانس کو قرآن کے برابر کا درجہ دیا:

رام چرت مانس وِل سنتن جیوَن پران
ہندو آج کو وید سَم وَچن ہی پرکٹ قران

ایک اور صوفی شاعر دریا صاحب بھی رام سے اپنی عقیدت کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں:

آدی انت مرا ہے رام
اُن بِن اور سَکل بے کام

ان اشعار کے علاوہ عربی، فارسی، اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں بھی مسلم ادیبوں اور شاعروں نے رامائن اور رام کتھا کے تعلق سے اپنی فکر کی پرواز دکھلائی ہے۔ جناب رام لعل نابھوی نے اپنے ایک مضمون میں 27 ایسی رامائنوں کا ذکر کیا ہے جو عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں ترجمہ کی گئیں۔ اس فہرست کی روشنی میں دو رامائنیں عربی زبان میں، 13 / رامائنیں فارسی زبان میں، 9 / رامائنیں اردو میں، انگریزی، پنجابی اور ہریانوی میں ایک ایک رامائن کے ترجمے کیے گئے۔ رام کتھا کو فارسی زبان میں پیش کرنے کا سہرا کشمیر کے بادشاہ زین العابدین کے سر باندھا جاتا ہے۔ اکبر کے زمانے میں مشہور مورخ عبدالقادر بدایونی نے بالمیکی کی رامائن کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ رام کتھا کے سلسلے میں داراشکوہ کے اقوال، اور عہد جہاں گیری کے ملا مسیح کے اشعار آج بھی اپنی علامتی کیفیت اور عقیدت مندانہ لہجے کی بدولت سیتا کے تقدس اور ان کی پاکیزگی کے بے مثل استعارے ہیں:

تنش را پیرہن عریاں نہ دیدہ
چوں جاں اندر تن وتن جاں نہ دیدہ

مستقل ترجموں اور تصانیف کے علاوہ ایسے شعرائے کرام کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے جنھوں نے رامائن کے بعض حصوں اور ابواب یا ان کے مختلف مناظر کو سامنے رکھ کر نظمیں تخلیق کی ہیں۔ میں صرف ان شعرا کے نام گناتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔ ایسے شاعروں میں ابراہیم عادل شاہ، نظیر اکبر آبادی، اقبال، ظفر علی خاں، احسان دانش، ساغر نظامی، جاں نثار اختر، حالی، جوش، مجاز، تاباں، حرمت الاکرام، مظفر حنفی، سکندر علی وجد، علی جواد زیدی، اور نذیر بنارسی نے اپنے اپنے طور پر رام چندر جی کی شان میں مدحیہ نظمیں لکھیں اور ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

رام چرت مانس کے کسی ایک کانڈ، کسی ایک منظر یا کسی ایک باب کو سب سے پہلے انگریزی زبان میں منتقل کرنے کا سہرا فورٹ ولیم کالج کے استاد عدالت خاں کے سر بندھتا ہے۔ ڈاکٹر صفدر آہ نے ''تلسی داس اور رام چرت مانس'' نام سے ایک کتاب اردو زبان میں لکھی۔ مشہور صحافی شاعر مولانا ظفر علی خاں نے بھی رام، سیتا اور لکشمن کی تثلیث سے ہندستانی فکر وفن کے رشتے کو ان لفظوں میں ظاہر کیا اور عالمی سطح پر ہندوستان کی شناخت کو ان کی سحر انگیز شخصیتوں کا مرہونِ منت تسلیم کیا۔ مولانا نے لکھا:

نقشِ تہذیبِ ہنر اپنی نمایاں ہے اگر
تو وہ سیتا سے ہے، لچھمن سے ہے اور رام سے ہے

رام کی شان میں ساغر نظامی نے لکھا:

دن کا تیاگی، روح کا رسیا
خود راجا اور خود ہی پرجا
سب سے الفت کرنے والا
قول کا سچا، بات کا پکا

رام کتھا سے متعلق مسلم ادیبوں کو 'مانس سنگم' کے بین الاقوامی پلیٹ فارم پر لاکر تہذیبی اور ثقافتی طور سے انھیں قومی یک جہتی کی راہ کے سچے مسافروں کی حیثیت سے ان کی شناخت میں مدد کرنے کے لیے کان پور کے شری بدری نارائن نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اسی پلیٹ فارم سے گنگا جمنی تہذیب اور ہندو مسلم اتفاق واتحاد، مشترکہ تہذیب کے علم بردار نذیر بنارسی نے رام کے قدموں میں عقیدت کے پھول بچھائے ہیں جنھیں ہندوستانی سماج بہت دنوں تک فراموش نہ کر سکے گا۔

رامائن اور اردو

اردو زبان جس کی بنیاد ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی روایتوں پر استوار ہوئی ہے، جس کا مزاج ہی گنگا جمنی تہذیب کا حامل ہے اس میں رامائن اور رام کتھا سے متعلق ادب کی بھی کمی نہیں ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کا دامن رامائنی ادب سے بھی مالا مال ہے۔ ابھی تک اردو میں رامائنی ادب پر جو کام ہوئے ہیں، ان کا تفصیلی گوشوارہ تو تیار نہیں ہوسکا ہے لیکن رامائن کے جو ترجمے اردو زبان میں دستیاب ہیں ان کی تعداد جناب عطا خورشید کی تحقیق کے مطابق ڈھائی سو تک پہنچتی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہوسکتی ہے کہ سبھی تراجم ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے یکساں اہمیت کے حامل نہیں ہیں اور نہ ہی تمام ترجموں کو مقبولیت اور قبول عام کی سند حاصل ہوسکی لیکن جن تراجم نے قبول عام کی سند لی وادبی اور فنی خوبیوں کی دولت سے بھی مالا مال ہیں، ان میں سے بعض کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

رامائن کا غالباً پہلا اردو ترجمہ 1864 میں شائع ہوا۔ اس ترجمے کا ذکر گارساں دِتاسی نے اپنے سولھویں خطبے میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: لکھنؤ سے رامائن کا اردو ترجمہ شروع ہوا ہے۔ اس میں کئی تصاویر ہیں۔ یہ ترجمہ منشی جگن ناتھ سہائے خوشتر لکھنوی کا ہے۔ یہ ترجمہ اس قدر مقبول ہوا کہ 1924 تک اس ترجمے کے سولہ ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ خوشتر کی رامائن مثنوی کے انداز پر لکھی گئی ہے اور اس صنف کے ادبی تقاضوں کو امکان کی حد تک برتا گیا ہے مثلاً مثنوی کا آغاز حمدِ باری سے یوں ہوتا ہے:

خدایا نامے کو نام آوری دے
قلم میں جلوۂ بال وپری دے
مضامینِ ثنا میں تر زباں ہو
برنگِ ابرِ نیساں دُر فشاں ہو

جناب رام لعل نابھوی نے اپنے ایک مضمون میں 27 ایسی رامائنوں کا ذکر کیا ہے جو عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں ترجمہ کی گئیں۔ اس فہرست کی روشنی میں دو رامائنیں عربی زبان میں، 13/ رامائنیں فارسی زبان میں، 9/رامائنیں اردو میں، انگریزی، پنجابی اور ہریانوی میں ایک ایک رامائن کے ترجمے کیے گئے۔رام کتھا کو فارسی زبان میں پیش کرنے کا سہرا کشمیر کے بادشاہ زین العابدین کے سر باندھا جاتا ہے۔ اکبر کے زمانے میں مشہور مورخ عبدالقادر بدایونی نے بالمیکی کی رامائن کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ رام کتھا کے سلسلے میں داراشکوہ کے اقوال، اور عہدجہاں گیری کے ملا مسیح کے اشعار آج بھی اپنی علامتی کیفیت اور عقیدت مندانہ لہجے کی بدولت سیتا کے تقدس اور ان کی پاکیزگی کے بے مثل استعارے ہیں

گہر افشاں جو یوں میرا قلم ہے
سحابِ لطف کا تیرے کرم ہے

اب ان اشعار کے بعد مثنوی گلزارِ نسیم کے یہ اشعار دیکھیے:

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری
ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر
حمدِ حق و مدحتِ پیمبر

صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ ایک ہی مقام یعنی لکھنؤ میں لکھی گئیں دونوں مثنویاں تقریباً ایک ہی عہد میں لکھی گئی تھیں اور ان میں لفظ ومعنی اور تخیل کی کس قدر یکسانیت ہے۔ خوشتر کی مثنوی میں زبان وبیان کی وہی صفائی اور برجستگی موجود ہے جو اس زمانے کی لکھنوی مثنویوں کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھیں۔ البتہ اس کے بعد جو رامائنیں لکھی گئیں یا ترجمہ ہوکر شائع ہوئیں، ان میں فارسی لفظیات اور محاوروں کے بجاے ہندی کے ثقیل الفاظ کا استعمال دانستہ طور پر کیا گیا ہے۔ کہنے کو تو یہ فارسی رسم الخط میں ہیں لیکن ان کا انداز سنسکرت شعریات سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔ صرف منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی کا ترجمۂ بالمیکی رامائن ہے یہ مکمل طور سے نثر میں ہے اور اس میں لکھنؤ کی محاوراتی زبان استعمال کی گئی ہے، حالاں کہ لکھنوی زبان کی نزاکتوں اور اس کی مخصوص لفظیات کو برتنے کے پھیر میں کہیں کہیں تہذیب کا خون بھی ہوگیا ہے اور کرداروں کے تقدس اور قاری کے عقائد کو نظر انداز بھی کردیا گیا ہے۔ برخلاف اس ترجمے کے نورالحسن نقوی کا نثری ترجمہ سہل، رواں اور بہتر ہے۔

ان کے علاوہ چند منظوم تراجم اور بھی ملتے ہیں مثلاً شنکر دیال فرحت کا ترجمہ، بانکے بہاری بہار کی رامائن، منشی سورج نرائن مہر کی رامائن، رام جی مل کپور سنبھلی کا ترجمۂ رامائن؛ اس کے علاوہ وہبی کی رامائن جو حیدرآباد سے ڈاکٹر محی الدین زور کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ گورو نارائن کا ادھیاتم نارائن کا منظوم ترجمہ جو 1958 میں الہ آباد سے شائع ہوا یہ مسدس کی ہیئت میں ہے۔ پریم پال اشک کی منظوم رامائن جو 1961 میں شائع ہوئی تھی۔ یہاں صرف چند رامائنوں کا ذکر کیا گیا ہے ورنہ عطا خورشید نے اپنے ایک مضمون میں رامائنوں کی جو فہرست دی ہے وہ پچاس سے بھی متجاوز ہے اور ایسی رامائنوں کی تعداد چالیس سے بھی زیادہ ہے جو جزوی طور سے رامائن کے مناظر یا ابواب پر مشتمل ہیں۔

ان تراجم کے علاوہ وہ شعری تخلیقات بھی ہیں جو رامائن کے کسی منظر یا پہلو کو ذہن میں رکھ کر پیش کی گئی ہیں۔ اس طرح سے ہم انھیں بھی رامائنی ادب میں شامل کرسکتے ہیں، مثلاً تلوک چند محروم کی چند نظمیں: جشنِ چراغاں، دیپ مالا، چترکوٹ، بھرت اور رام چندر جی کی کھڑادیں وغیرہ؛ منور لکھنوی کی سیتا ہرن، تلسی داس کی رامائن، نوبت راے نظر کی رامائن سے ماخوذ نظم 'سیتا جی'، چکبست کی نظم 'رامائن کا ایک سین' سرور جہاں آبادی کی 'سیتا جی کی گریہ وزاری اور راجا دسرتھ کی بے قراری'۔ ان شاعروں کے علاوہ اردو شعرا کی ایک لمبی فہرست ہے جنھوں نے جذبات سے مغلوب ہوکر شری رام چندر جی کے قدموں میں عقیدت کے پھول نچھاور کیے ہیں یا ان کی شخصیت کی سحر انگیزی سے متاثر ہوکر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ حالی، اقبال، جوش اور مجاز کے علاوہ پنڈت دتا تریہ کیفی، میلا رام وفا، جگت موہن لال رواں، شاد عارفی وغیرہ اس فہرست میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔

مقالے کے آخری حصے میں میں چند ایسے تقابل پیش کرنے کی کوشش کروں گا جس سے یہ بات ثابت کی جاسکے کہ رام چندر جی کی شخصیت پر لکھی گئیں مثنویاں اور رامائنیں ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے آج بھی اپنے ہمدرد نقادوں اور قدر وقیمت کا صحیح اندازہ لگانے والوں کی راہ دیکھ رہی ہیں۔ پہلے بہار کی رامائن کے ابتدائی اشعار دیکھیں:

لکھوں تو وصفِ شاہِ ہفت اقلیم
وہ دسرتھ تھا صاحبِ اورنگ دیہیم
اودھ کے راج میں نامی تھا راجا
شہنشہ تھا سلاطینِ جہاں کا
بہارِ زندگی کا دیکھ تپ جھاڑ
ہوئے عیش وطرب سے دست بردار
خیال آیا کہ اب ہے وقتِ پیری
نہ زیبا سر پہ ہے تاجِ امیری

میر حسن نے بھی اپنی مثنوی کا آغاز بالکل اسی انداز میں کیا ہے:

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ
کہ تھا وہ شہنشاہِ گیتی پناہ
کئی بادشاہ اس کو دیتے تھے باج
خطا وختن سے وہ لیتا خراج
وزیروں کو اک روز اس نے بلا
جو کچھ دل کا احوال تھا، سو کہا
کہ میں کیا کروں گا یہ مال ومنال
فقیری کا ہے میرے دل کو خیال

شری رام جی سیتا کے سوئمبر میں شامل ہونے کی غرض سے دربار میں حاضر ہوتے ہیں اور دھنش اٹھانے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ گورو نارائن راجا جنک کے دربار میں رام کی آمد کا منظر اس طرح پیش کرتے ہیں:

جا کے نزدیک ابھی صرف اٹھائی تھی کماں
کھینچ کر زہ نہ جھکائی ، نہ چڑھائی تھی کماں
اس قدر شور ہوا گونج اٹھا سارا جہاں
ہفت اقلیم سے ہے چرخ پہ آیا طوفاں
جاگ اٹھے اپنی سمادھی سے جو تھے گوشہ نشیں
اپنے پیروں سے وہیں داب لی لچھمن نے زمیں

جب ہم یہ منظر پڑھتے یا سنتے ہیں تو ہمارے سامنے فوراً دبیر کے مرثیے کا وہ بند رقص کرنے لگتا ہے جو دبیر نے عباسِ علمدار کی شان میں کہے تھے:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا بدن زیرِ کفن کانپ رہا ہے
ہر قصرِ سلاطینِ زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بہ کف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

اس بات کو تسلیم کرلینے میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی کہ اگر چہ گورو نارائن مرزا دبیر کی بلندیِ فکر تک نہیں پہنچ

سکے تاہم ان کی یہ کوشش قابل تعریف ہے اور دوسری بات جو اس سے بھی زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ اس زمانے کی لکھی گئی تمام رامائنوں میں مثنوی اور مرثیے کی ساری خوبیاں موجود ہیں اور ان میں ان دونوں اصناف کا گہرا رنگ نظر آتا ہے۔ ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے۔ جب رام چندر جی اجودھیا سے رخصت ہو کر جنگل کی راہ لیتے ہیں تو ان کی روانگی کے منظر اور خلقِ خدا کی بے چینی و اضطراب کا نقشہ تلوک چند محروم نے اس طرح کھینچا ہے:

رخصت اجودھیا سے وہ جانِ جہاں ہوا
یا اتفاقِ تفرقۂ جسم وجاں ہوا
صحرا کو رام و لچھمن و سیتا جو چل پڑے
بے تاب ہو کے لوگ گھروں سے نکل پڑے
زار وقطار روتے ہوئے بے قرار سب
تھے پیچھے پیچھے رام کے با حالِ زار سب
کہتے تھے مر ہی جائیں گے اے پران ناتھ ہم
ہم کو نہ چھوڑ جائیے، جائیں گے ساتھ ہم

اب اس کو سامنے رکھتے ہوئے میر انیس کا ایک بند ملاحظہ کریں جب امام حسین مدینے سے رخصت ہو رہے ہیں:

فرزندِ پیمبر کا مدینے سے سفر ہے
سادات کی بستی کے اجڑنے کی خبر ہے
رخصت کے لیے لوگ چلے آتے ہیں باہم
ہر قلب حزیں ہے تو ہر اک چشم ہے پرنم
ایسا نہیں گھر کوئی کہ جس میں نہیں ماتم
غل ہے کہ چلا دل برِ مخدومۂ عالم
اجڑے گا مدینہ جو یہ گھر ہوئے گا خالی
بربادیِ یثرب کی بنا چرخ نے ڈالی

اسی طرح جنگ کے مناظر بھی مرثیوں کی یاد دلاتے ہیں، یہاں تک کہ منور لکھنوی نے اپنی رامائن کا اختتام بھی مرثیے کے انداز میں کیا ہے۔ منور لکھنوی کے اختتامیہ انداز کو سمجھنے سے پہلے جوش کے مرثیے کا ایک بند پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ صورت حال کی بہتر ترجمانی ہو سکے۔ جوش کا بند دیکھیں:

کچھ خبر بھی ہے محبانِ حسین دور بیں
موت ہے شبیریت کے دائرے میں انگبیں
زہر سے لبریز ہے جامِ حسین ابن علی
جان دینا ہے تو لو نامِ حسین ابنِ علی
رعبِ سلطانی کو ٹھکراؤ تو لو نامِ حسین
بولتے رن میں جو گھبراؤ تو لو نامِ حسین

پنڈت منور لکھنوی نے اپنی رامائن کا اختتام ان لفظوں میں کیا۔ اختتامیے میں وہ ہندوؤں سے مخاطب ہوتے ہوئے گویا ہیں:

ہندوؤ! رام کے اوتار کا منشا سمجھو
رام لیلا کو نہ کچھ کھیل تماشا سمجھو
رمز ہے رام چرتروں میں نہاں کیا سمجھو
ہے سمجھنے کا انھیں گر تمھیں دعوا سمجھو
رام کا راج نہ تھا، تھی یہ عمل داریِ فرض
رام اوتار سے لو درسِ پرستاریِ فرض

یہ بات کہی جا چکی ہے کہ رامائنی ادب پر اردو کی دو اصناف کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں، ان میں ایک مرثیہ ہے اور دوسری صنف مثنوی ہے۔ رامائنی ادب کی منظوم تخلیقات میں ہمیں اردو مثنویوں کی بڑی صاف اور واضح جھلکیاں نظر آتی ہیں، صرف ایک مثال سے میں اپنی بات ثابت کرنا چاہوں گا۔

سیتا ہرن کے بعد جب ان کی ڈھونڈ مچ گئی تو لکشمی نرائن جوہر بدایونی بڑے شاعرانہ انداز میں اس منظر کی تصویر کشی کرتے ہیں:

آنکھوں نے برائے گل افشانی
پلکوں سے گھروں کی خاک چھانی
ہر گوشے سے جانکی کو پوچھا
ہر ذرے کی وسعتوں میں ڈھونڈا
نرگس سے نظر ملا کے پوچھا
سوسن کو قسم دلا کے پوچھا
بلبل نے ہزار کی رسائی
نکہت نہ چمن کے ہاتھ آئی
غنچہ نہیں کوئی گل کھلاتا
پتا بھی نہیں پتا بتاتا

شاعری کا یہ حسن، رعایتِ لفظی کا یہ فن کارانہ استعمال، لفظی صنعتوں کی یہ جادوگری اس انداز کو مثنوی گلزارِ نسیم سے قریب تر کر دیتی ہے۔ جب بکاولی اپنے گم شدہ پھول کو تلاش کرتے ہوئے چمن میں پہنچتی ہے تو بکاولی کی بے چینی اور اضطراب اور اس کی سیماب پائی کو نسیم کے انداز میں دیکھیے:

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون؟
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون؟
نرگس! تو دکھا کدھر گیا گل
سوسن! تو بتا کدھر گیا گل
سنبل! مرا تازیانہ لانا
شمشاد! انھیں سولی پر چڑھانا
پتا بھی پتے کو جب نہ پایا
کہنے لگی کیا ہوا، خدایا!

ان چند مثالوں سے اور ان کے تقابلی مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں رامائنوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان رامائنوں کو کوئی لافانی اور عبقری شاعر نصیب نہیں ہوا۔ اگر میر حسن اور نسیم جیسے مثنوی گو اور جذبات نگار، یا میر انیس اور مرزا دبیر جیسے رزمیہ نگار اس ادب کو ملے ہوتے یا کم از کم چکبست ہی کو طویل زندگی مل گئی ہوتی تو رامائنی ادب کی تاریخ کی شکل ہی دوسری ہوتی۔ پھر بھی یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ فی الوقت اردو زبان میں رامائنی ادب کا جو ذخیرہ موجود ہے اور مسلم شاعروں اور ادیبوں کا جو تخلیقی سرمایہ ہمارے پاس ہے وہ اس زبان کی ہمہ گیری، اس کے سیکولر کردار اور مسلمانوں کی مذہبی رواداری اور رہنمایانِ غیر مذہب کے عزت و احترام کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ تاریخ کا یہ خوش گوار سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ٹائمز آف انڈیا کی ایک خبر کے مطابق شیونگری بنارس کی ایک جواں سال مسلم خاتون جن کا نام نازنین ہے اور انھوں نے زندگی کی محض 22 بہاریں ہی دیکھی ہیں وہ رامائن کا اردو زبان میں ترجمہ کر رہی ہیں۔ اخبار کی اطلاع کے مطابق انھوں نے سندر کانڈ تک اپنا کام مکمل بھی کر لیا ہے اور باقی کے حصے جلد مکمل ہو جانے کا امکان ہے۔ گویا ہم یوں بھی یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ادب کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوتا، اور عقیدت کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ عقیدت کا یہی آفاقی رنگ شاعر کو یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ:

اک ایک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
مری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

■

Dr. Sauban Sayeed, Associate. Professor (Urdu), Khwaja Moieenuddin Chishti, Arabi-Farsi University, Sitapur-Hardoi Bypass Road, Lucknow - 226020 (UP)

عاقل زیاد

عہد ساز شخصیت
حسرت موہانی

مولانا حسرت موہانی پر قلم اٹھانا کسی بھی طرح آسان کام نہیں ہے۔ان کے عہد طفلی سے لے کر عہد شباب اور پیری تک کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ مولانا حسرت موہانی عزم واستقلال کے وہ پیکر تھے کہ ایک بار کوئی ارادہ کرلیا تو اس سے وہ کسی طرح بھی مصالحت کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ذہانت ایسی کہ کوئی مسئلہ خواہ کتنا ہی پیچیدہ ہو، فیصلہ لینے میں وہ بالکل تامل سے کام نہیں لیتے۔معاملہ فہمی ایسی کہ حالات سمجھ کر اپنے ارادے کے آگے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ایسے دانشور کہ شاعری کیا اور صحافت کیا ہر دونوں جہات پر دنیائے اردو ادب میں اپنی انفرادیت پسندی کا پرچم بلند کردیا۔ظاہر ہے ایسی شخصیت پر قلم اٹھانا آسان کام نہیں ہے۔یہاں اس سچائی کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اب عقیدت کی جگہ عسکریت پسندی کا رجحان پیدا ہونے لگا ہے۔آج ہم یوم پیدائش ہو یا یوم وفات ایسے موقعوں پر چند جملے لکھ کر اپنی ذمے داری نبھانے پر اکتفا کرلیتے ہیں اور یہ امر بھی کسی انداز سے سچا خراج پیش کرنے سے مطابقت رکھتا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب مکتبوں میں مولوی صاحبان بڑی شخصیات خصوصاً عظیم مجاہد آزادی کے کارناموں اوران کی حصولیابیوں کو ازبر کرانا اپنا نصب العین سمجھتے تھے۔نئے زمانے کی انگریزی تعلیم نے اسلاف کے تمام تر کارناموں پر گویا پانی پھیر دیا اور ہمارے بچے ان کے کارناموں سے یکسر بے نیاز ہوگئے۔اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان میں تاریخ بدلی جارہی ہے اور حقائق حکایات میں تبدیل ہورہے ہیں۔معصوم ذہنوں کو نصاب سے کتنی نسبت رہی، یہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔انھیں من گڑھت کہانیاں سنائی جاتی ہیں جس کی وجہ سے ہماری نسل ہمارے اکابرین سے بے بہرہ ہورہی ہے اور ہمیں اس کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں۔چند نام نہاد اردو اسکولوں میں قومی تہواروں کے موقعوں پر بچے بمشکل ایک یا دو مسلم مجاہدین آزادی کا نام لے کر انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے نظر آتے ہیں۔ تعلیم کی طرف سے بے توجہی کا یہ عالم ہے کہ وہ دن دور نہیں جب ان بچے کھچے ناموں کو بھی ہمارے بچے جلد ہی بھول جائیں گے اور ہماری آئندہ نسل اسے بھی یاد نہ رکھ پائے گی کہ 'انقلاب زندہ باد' کا اصل میں خالق کون تھا۔

حسرت موہانی جنھیں علی گڑھ کے طلبا نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں داخلہ کے وقت 'خالہ اماں' کا لقب دیا تھا لیکن جلد ہی ان کی خداداد صلاحیت کا اعتراف کرکے انھیں حسرت موہانی کے نام سے پکارنے لگے۔ جیسے وہ خود چٹانی عزم کے حامل تھے ویسی ہی نشاط النسا نامی خاتون ان کی زوجیت میں آئیں، جنھیں احتراماً بیگم حسرت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔حسرت موہانی کو یاد کرتے ہوئے بیگم حسرت کو نظرانداز کردینا دراصل اخلاقی ناقدری تو ہوگی ہی قلمی بددیانتی بھی ہوگی، کیوں کہ شادی (1901) کے محض چند ہی برس گزرے تھے کہ 1908 میں پہلی بار گرفتار ہوکر جیل رسید کردیے گئے۔قید کے دوران انھیں ہر دوسرے دن ایک من گندم پیسنا ہوتا تھا لیکن کھانے کو مٹی ملے آنے کی روٹی ملتی تھی۔اس وقت بیگم حسرت نے انھیں بذریعہ خط یہ پیغام دیا، ذرا غور کیجیے:

''تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو۔میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا۔خبردار! تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو''۔

1916 میں دوسری گرفتاری دونوں ہی جانوں کے لیے جاں گسل ثابت ہوئی۔علی گڑھ اور فیض آباد کی دوری ایک طرف اور بیگم حسرت کی شوہر نوازی ایک طرف۔ جب حکومت وقت کے ذریعہ حسرت موہانی کو فیض آباد سے علی گڑھ جیل میں منتقل کیے جانے کی درخواست مسترد کردی گئی، چاروناچار بیگم حسرت بھکارن کی صورت اپنی چھوٹی سی بچی کا ہاتھ پکڑے برقعہ اوڑھے تنہا فیض آباد آتی جاتی تھیں۔یہ وہ زمانہ تھا جب کسی شریف خاتون کا گھر سے نکلنا ہندوستانی سماج میں بے حد معیوب سمجھا جاتا تھا۔ کیا ہندو اور کیا مسلمان پورے سماج میں پردے کی روایت یکساں طور پر لازم تھی۔بیگم حسرت نے ایسے وقت میں پردے کی روایت کو توڑ کر شوہرنوازی کی وہ مثال قائم کی کہ ہر کسی کے دل میں ان کا احترام گھر کرگیا۔آج ہر ذی علم اچھی طرح جانتا ہے کہ مولانا کی اسیری کے دوران بیگم حسرت نے درجنوں خطوط لکھے اور تمام خطوط میں عزم، استقلال اور قناعت کا پرجوش اظہار ہوا کرتا تھا۔ بیگم حسرت مولانا کے مزاج سے خوب واقف تھیں، وہ ایک جذباتی شخصیت کے مالک تھے۔قید کے دوران بیگم حسرت نہایت شائستہ لب ولہجہ کا استعمال کرتیں اور صبرو شکر کے ساتھ مولانا کو اپنے موقف پر قائم رہنے کے مشورے دیتی تھیں۔ایک خط کا اقتباس دیکھیے:

''.....اگر خدانخواستہ قید ہوئی اور خدانہ کرے خیال غالب یہی ہے، کیوں کہ تم اپنی دھن کے پکے ہو اور...''

موجودہ پس منظر میں بھی دیکھا جائے تو اس خط کی معنویت آج بھی ایک مہذب قوم کے لیے پیغام ہے کہ وہ واقعی ظلم سہتے ہیں لیکن کسی پر ظلم نہیں کرتے۔اتنا ہی نہیں بیگم نے وقتاً فوقتاً مولانا کی عدم موجودگی میں کانگریس کے مختلف جلسوں میں بہتر نمائندگی انجام دیتی رہیں اور ان جلسوں میں مولانا کی بہتر ترجمانی بھی کرتی رہیں۔ دسمبر 1922 میں کانگریس کے گیا اجلاس میں جب تحریک ترک موالات کے واپس لینے کا ایجنڈا پاس کیا گیا تو انہوں نے مولانا کی نیابت کرتے ہوئے اس کی پرزور مخالفت کی اور اپنی دوٹوک تقریر میں کہا کہ اگر ہندوستانی کونسلوں میں داخل ہونے لگیں تو ان لوگوں میں جو مکمل لوگ آزادی چاہتے ہیں، آزادی حاصل کرنے کی خواہش ختم ہوجائے گی۔حقیقت تو یہ ہے کہ نشاط النسا بیگم حسرت کی شخصیت کا احاطہ کرنا یہاں مشکل ہے۔تاہم وہ ایک ایسی مسلمان خاتون ہیں جو شادی کے بعد سے رہتی زندگی تک سیاسی، سماجی اور فکری سطح پر کئی ترجیحات کی حامل رہیں۔ جس طرح مورخین کرم چند گاندھی کے ساتھ کستوربا گاندھی کی رفاقت کو دیکھتے ہیں، اسی طرح حسرت موہانی اور بیگم حسرت کی جوڑی بھی بے مثال ہے۔

یہ سچ ہے کہ اوائل میں حسرت موہانی اردو ادیبوں اور نقادوں کے ہتھے چڑھ گئے اور اس کی وجہ سے کئی غلط فہمیاں عام ہوگئیں۔مگر ان سب سے الگ مطالعوں کی بنا پر اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مولانا کی سیاسی ابتدا کانگریس

کے نرم دل کی متوازی پالیسی سے ہوئی تھی۔ لیکن جلد ہی وہ اپنی افتادِ طبیعت کے سبب بال گنگا دھر تلک کے ہمنوا ہوگئے۔ ان کے رفقا میں کشن پرساد کول بھی شامل تھے جنھوں نے اپنے ایک تاثراتی مضمون میں اپنے دیرینہ تعلقات کا بڑے ہی کھلے دماغ سے ذکر کیا ہے۔ یہ مضمون ماہنامہ آجکل بابت اگست ستمبر 1981 کے خصوصی شمارہ میں چھپا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''مجھے ان کی ذات سے ایک قسم کا انس تھا کیوں کہ میں ان کے خلوص اور سچائی، کسرنفسی اور ایثار، دلیری اور جاں بازی، آزادی وبیباکی اور ان کی اولوالعزمی اور وطن پرستی کا دل سے قدردان تھا۔ میرے دل میں ان کی شخصیت کے لیے جگہ تھی اور طرفہ مضمون یہ کہ میرے ان کے سیاسی خیالات اور مسلک میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شروع سے ہی وہ تلک کے پیرو تھے اور میں گوکھلے کا معتقد۔''

مغموم نہ ہو خاطر حسرت کہ تلک تک
پیغام وفا باد سحر لے کے گئی ہے!!

بال گنگا دھر تلک کے انتقال پر حسرت کی ایک غزل مسلسل کے دو اور شعر نقل کیے جارہے ہیں:

اے تلک اے افتخار جذبۂ حب وطن
حق شناس وحق پسند وحق یقین وحق سخن
ناز تیری پیروی پر حسرت آزاد کو
اے تجھے قائم رکھے تادیر رب ذوالمنن

یقیناً وہ حصول آزادی میں مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے نظریات سے سو فیصد اتفاق نہیں کرتے تھے۔ ہر چند کہ مہاتما گاندھی کی قیادت سے انھیں کوئی عار نہیں تھا، تاہم سودیشی تحریک کے نظریات سے حسرت کا نظریہ ایک دم الگ تھا۔ وہ صرف برطانوی مصنوعات سے گریز کرنے والے فارمولے پر کام کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا صرف سوت کاتنے اور کھدر پہننے سے آزادی نہیں ملنے والی ہے۔ ان کی دلیل تھی کہ ہمارا دشمن برطانیہ ہے لہٰذا ہمیں صرف برطانوی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنا چاہیے۔ حسرت کرگھوں اور چرخوں سے بنے کپڑوں کے حق میں اس لیے نہیں تھے کہ محض کھادی کا اگر اتنے بڑے پیمانے پر استعمال ہوا تو ہندوستانی کپڑے کی ملوں کو بھاری نقصان پہنچے گا اور معاشی طور پر یہاں کے مزدور اور بھی کمزور ہوجائیں گے۔ حسرت موہانی نے جب جنوری 1920 میں کانپور میں سودیشی اسٹور کی ابتدا کی تو اس وقت ان کی مالی حالت ناگفتہ بہ تھی مگر جب ارادہ کرلیا تو کرلیا۔ انھوں نے بالآخر اس کی بنیاد ڈال ہی دی اور سودیشی اسٹور کا افتتاح بھی مہاتما گاندھی کے ہاتھوں ہی عمل میں آیا۔ بعض مورخین کا کہنا ہے سودیشی اسٹور کا افتتاح بانی ریشمی رومال تحریک حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے کیا تھا۔ خیر جو بھی ہو لیکن یہ سچ ہے کہ حسرت موہانی سودیشی اسٹور کی شاخیں ملک کے تمام حصوں میں قائم کرنے کے خواہشمند تھے اور ایسا نہ صرف ان کا خیال تھا بلکہ وہ اس کے لیے سرگرم عمل بھی رہے۔

1857 کے غدر کے اثرات سے اس وقت بھی مسلمان خوفزدہ تھے جس کی نمائندگی سرسید کررہے تھے۔ دراصل اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریزی حکومت غدر کے اسباب مسلمانوں کے سرمڈھ رہی تھی اور سرسید احمد خاں امت کے دامن کو اس الزام سے پاک کرنے کی جدوجہد میں پوری سرگرمی سے مصروف تھے۔ انھیں ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار کا بخوبی علم تھا، اس لیے ان کی کوشش تھی کہ ملک میں بہرحال مسلمانوں میں اقتصادی استحکام آئے، اور اس کے لیے ضروری تھا کہ ان میں تعلیمی پسماندگی دور ہو۔ غدر کے دوران ملک میں سب سے زیادہ نقصان بھی مسلمانوں کا ہی ہوا تھا۔ ہزاروں علما شہید کردیے گئے اور مسلمانوں کی املاک کی بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی تھی۔ مگر ان تمام حقائق کے باوجود حسرت کبھی سرسید کی پالیسیوں کے حق میں نہیں رہے، البتہ انھوں نے مسلمانوں کی پسماندگی کے سبب کبھی ان کی مخالفت بھی نہیں کی، بلکہ انھوں نے اپنے اخبار 'اردوئے معلّٰی' میں لکھا، اقتباس دیکھیے: ''ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ سرسید اپنے زمانے میں قوم کے مسلمہ رہنما تھے، اس وقت مسلمانوں کے حق میں انھوں نے جو کچھ کیا بہتر کیا۔ اگر انھوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیٰحدہ رکھنے کی نصیحت اس بنا پر کی کہ غدر کے بعد سرکار انگلیشیہ مسلمانوں سے بدگمان تھی اور ان کو بغاوت کا ملزم سمجھتی تھی تو بہت خوب کیا۔ اگر انھوں نے مسلمانوں کی توجہ تمام ملکی معاملات سے علیٰحدہ کرکے صرف اعلیٰ تعلیم کی جانب مائل کردی تو اور بھی خوب کیا،......''

بی اے کا ابھی رزلٹ نہیں آیا اور انھوں نے اردوئے معلّٰی 1902 سے نکالنا شروع کردیا۔ اس وقت عبدالحلیم شرر کے 'دلگداز' اور سرعبدالقادر کے 'مخزن' کا بڑا زور تھا۔ جب اپریل 1908 میں حسرت 30 سال کی عمر میں انگریزی سے ترجمہ شدہ 'مصر میں انگریزوں کی پالیسی' کے عنوان سے مضمون شائع کیا جس کے لیے صاحب مضمون کا بارہا ان سے نام پوچھا گیا لیکن انھوں نے نہیں بتایا تو حکومت سے بغاوت کے الزام میں انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ خیال رہے کہ بغاوت کے الزام میں مولانا حسرت موہانی کی ہندوستانی مجاہدین آزادی میں وہ پہلی شخصیت تھی جسے گرفتار کرکے جیل بھیجا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد تقریباً آٹھ سال بعد 1916 میں پہلی بار گرفتار کیے گئے تھے۔ حسرت کے اردوئے معلّٰی میں ادب، سیاست، ثقافت، سائنس، جغرافیہ، تاریخ اور لسانیاتی اصلاحات پر مبنی مضامین خصوصیت سے شائع ہوتے تھے۔ اردوئے معلّٰی کا مقام اپنی نوعیت اور انفرادیت کی بنا پر معاصر اخبارات میں سب سے نمایاں تھا۔ تذکرۃ الشعرا کے بعد انھوں نے 'مستقل' نامی اخبار بھی نکالا۔ ان کے زیرادارت اخباروں میں شاد عظیم آبادی، امداد امام اثر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حالی، علامہ شبلی، سجاد حیدر یلدرم، کشن پرساد کول وغیرہ کی تحریریں اکثر شائع ہوتی تھیں۔

آخرکار 13 مئی 1951 کو سید فضل الحسن ایک طویل علالت کے بعد لکھنؤ میں انتقال کرگئے۔ جس طرح انھوں نے ملک کی آزادی کے لیے ایک لمبی جدوجہد کی اسی طرح انھیں آخری وقت میں زندگی سے بھی ایک بڑی لڑائی لڑنی پڑی۔ انگریزوں کو تو انھوں نے شکست دے دی لیکن موت کو کس طرح شکست دے سکتے تھے کہ جس کے لیے قرآن کریم نے کہہ دیا کہ ہر نفس کو موت کا مزا چکھنا ہے۔ بچپن سے انھوں نے جو مزاج پایا تھا اگر زندگی اور موت میں انسانی اختیار کا ذرا بھی عمل دخل ہوتا تو یقیناً ملک الموت کو بھی چاروناچار واپس جانا ہوتا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی کتاب 'حسرت موہانی' کے 'حرف آغاز' میں لکھا ہے: ''......اس کے باوجود انھیں ہندوستانی سیاست میں وہ مقام نہیں مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس میں خود ان کا اپنا قصور تھا......'' ناچیز کو یہاں ان کے اس جملے پر اعتراض نہیں ہے، تاہم اس سے اتفاق بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ حسرت کی نفسیات کا مطالعہ کیا جائے تو ان کو اپنی آشفتہ طبیعت پر اختیار نہیں تھا۔ وہ کیسے بھی انگریزی حکومت کا خاتمہ چاہتے تھے اور اس کی وجہ سے جہاں امکانات زیادہ روشن نظر آئے۔ انھوں نے کانگریس کے بعد کمیونسٹ اور مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کی تو یقیناً اس عمل میں کسی منصوبہ بند ذہنیت کا کوئی دخل نہیں تھا۔ کشن پرساد کول کی حقیقت پسندی کا جائزہ لیں، جیسا کہ انھوں نے تحریر کیا ہے، وہ اپنی رفاقت کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''......لیکن 1925 کے بعد سے یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ سیاسی فضا جب مکدر ہوئی اور فرقہ وارانہ جوش نے زور پکڑا تو حسرت نے بھی پولٹیکل کروٹ بدلی اور مسلم لیگ میں شریک ہوگئے۔'' یہی سچائی ہے اور سچ تو بہرحال سچ ہے۔

کاٹ اجل کا سر پھر لکھ تاریخ اثر
مولانا حسرت موہانی خلدنشیں

□

Mr. Aquil Ziad Vill. Bahdura, Po.Hardia (Singhia), Dt. Samastipur - 848209 (BIHAR)

محمد مستمر

علی عباس حسینی کے کرداروں میں مشرقی نفسیات

علی عباس حسینی ابتدائی دور کے وہ افسانہ نگار ہیں جن کے ادبی کارناموں کا شمار اب اکیسویں صدی کے کلاسیکی ادب میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بہت سے افسانے قلمبند کیے ہیں۔ وہ اپنے ہم عصر فنکاروں میں انفرادیت کے حامل ہیں۔ ان کے افسانے نہ خالص رومان پرور ہیں اور نہ جنسیات جیسے موضوع کو محیط ہیں بلکہ وہ رومانی و جمالیاتی اور جنسی جذبے کے امتزاج سے اپنے افسانوں میں ایسی مشرقی نفسیات و مسائل کو بیان کرتے ہیں جو مقصدیت کے متقاضی ہیں۔ نیز یہ مسائل اور مقصدیت بدلتے ہوئے دور اور متاثر ہوتی ہوئی تہذیب وتمدن کا ترجمان ہوتی ہے۔ یہاں ہم علی عباس حسینی کے کچھ افسانوں کا تجزیہ پیش کریں گے تاکہ اندازہ ہوسکے کہ ان کا قلم مشرقی روایتوں، قدروں اور نفسیات کو کیسے محصور اور قاری کی شعوری سطح پر اپنے اثرات کیسے مرتسم کرتا ہے۔

'نئی ہمسائی' علی عباس حسینی کا افسانہ 1933 میں قاری کی نظروں سے گزرا۔ جوان کے افسانوی مجموعہ 'باسی پھول' میں شامل ہے۔ علی عباس حسینی کے افسانوں کی خصوصیت مشرقی قدروں اور روایتوں کی پاسداری ہے، یہ افسانہ بھی اسی مشرقی نفسیاتی ماحول، خیالات اور جذبات کے اردگرد بنا گیا ہے۔ حالانکہ افسانہ متضاد، غیر مطابقت اور تفاوت (Insimilarity & Disparity) جیسے عناصر، پہلوؤں اور زاویوں پر منحصر ہے۔ لیکن افسانے کا محور مشرقی اقدار جیسے نفسی پہلوؤں کی ترجمانی کرتا ہے۔ جس کو علی عباس حسینی نے اپنے فنی کمال سے دلچسپ بنادیا ہے۔

افسانے میں کہانی کار متکلم کے طور سے نمودار ہوا ہے۔ جو خالص مشرقی رسم و رواج، اسلامی طور طریقوں اور تہذیب و ثقافت کا پروردہ ہے۔ کہانی کار کا خالص مولویوں اور مفتیوں کا گھرانہ ہے۔ یہاں تک کہ مامائیں اور خادمائیں بھی صوم وصلوۃ اور شرع کی پابند ہیں۔ جس جگہ کہانی کار رہتا ہے وہاں پر ایک نئی ہمسائی آکر بس جاتی ہے، جس کا شوہر اشرف نام کا ایک اوباش قسم کا شخص ہے۔ نئی ہمسائی کے متعلق یہ علم ہوتا ہے کہ وہ ایک طوائف کی بیٹی ہے۔ یہیں سے کہانی کار کو فکر لاحق ہوجاتی ہے کہ نئی ہمسائی کا اثر ان کے گھر کے ماحول پر کسی طرح بھی نہ پڑے۔ چنانچہ وہ سب گھر والوں کو اس سے کنارہ کش رہنے اور قطعِ تعلق کی ہدایت کردیتا ہے۔ کہانی کار کے چار سال کا ایک بچہ ہے جس کا نام منیر ہے لیکن سبھی اسے پیار سے 'بھیا' کہتے ہیں۔ ویسے تو افسانہ متضاد خیالات اور متضاد ماحول و ثقافت پر منحصر ہے لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو بغیر 'بھیا' کے افسانہ آگے بڑھنے کا نام نہیں لیتا ہے اور یہ چار سالہ بچہ افسانے میں کڑی کا کام کرتا ہے اور ایک بات، ایک واقعہ، دوسری بات دوسرے واقعے سے 'بھیا' کے توسل سے ہی جڑتا جاتا اور آگے بڑھتا جاتا ہے اور ان باتوں اور واقعات کے مابین اس چار سالہ بچے کی نفسیاتِ طفلی سے متعلق بہت سے نفسی پہلو، جیسے مادرانہ الجھاؤ، انسیت، مانوسیت، تشویشِ علاحدگی (Sepration Anxiety) وغیرہ اوصاف اجاگر ہوتے جاتے ہیں۔ نیز افسانے میں یہ چار سالہ بچہ اہمیت کا حامل ہے جو اپنے وجود، طفلانہ حرکات اور اپنی معصوم نفسیات سے قاری کی توجہ کا مرکز بنتا جاتا ہے۔

علی عباس حسینی نے اس افسانے میں بھیا کے توسل سے ان پہلوؤں، نکات اور زاویوں پر فوکس کرانے کی سعی کی ہے جن کا تعلق راست اور براہِ راست مشرقی اقدار، روایتوں اور مشرقی نفسیات سے ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ہر پیشہ ور عورت کی ذہنیت غلاظت و کجروی سے بھری نہیں ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات جن کو ہم برا سمجھتے ہیں وہ ہماری سوچ کے برعکس نکلتے ہیں گو وہ پاک خیالات، جذبات اور اعلا اخلاقی قدروں کا مجسمہ ہوتے ہیں جیسا کہ اس افسانے میں کہانی کار نے نئی ہمسائی کو پیش کیا ہے۔

'باسی پھول' علی عباس حسینی کا افسانہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول 1918 میں شائع ہوکر منظر عام پر آیا اور دوسرا حصہ 1930 میں قارئین کی نظروں سے گزرا۔ دونوں افسانے علی عباس حسینی کی تخلیق ہیں۔ جو ان کے افسانوی مجموعہ 'باسی پھول' میں شامل ہیں۔ افسانے کا ہیرو رشید ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ کہانی کار متکلم کے طور سے خود نمودار ہوا ہے اور دوسرا کردار صابرہ کا ہے۔ یہ افسانہ مشرقی روایت کا امین، پاسدار اور نفسی تقاضوں (Psychic Importunity) و کیفیتوں کا ترجمان ہے۔ اس افسانے کی سب سے خاص خوبی یہ ہے کہ یہ جنسیات جیسے عناصر سے پاک ہے۔ افسانے میں علی عباس حسینی نے خالص نفسی کشمکش کو بیان کیا ہے اس نفسی کشمکش اور تقاضوں کو جس میں خالص پاک محبت کا عنصر تحلیل ہے۔

'بیوی' علی عباس حسینی کا افسانہ ہے جو 1929 میں منظرِ عام پر آیا، 'باسی پھول' افسانوی مجموعہ میں شامل ہے۔ یہ سلما نام کی ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس کا نکاح منور نام کے شخص سے ہوجاتا ہے لیکن وداعی نہیں ہوتی ہے۔ منور اعلا تعلیم کے لیے ولایت چلا جاتا ہے۔ جب وہ وہاں سے واپس آتا ہے تو اس کے خیالات بالکل بدل جاتے ہیں۔ وہ پوری طرح سے مغربی رنگ، کلچر اور تہذیب میں رنگ جاتا ہے۔ وہ شادی کو ایک قید سمجھتا ہے۔ اس کی نظر میں عورت وہ شے ہے جو فقط حظ، مسرت اور جنسی تسکین و خواہش کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ وہ اس رشتے سے انکار کردیتا ہے۔ سر پر ماں باپ کا سایہ نہیں رہتا۔ دور دراز کے رشتے میں بھی کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو منور کو سمجھاتا۔ سلما کے باپ نے بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہی ڈھاک کے تین پات۔ آخر کار جب سلما کے باپ اپنے داماد سے ہار جاتے ہیں تو وہ طلاق دلانے کا فیصلہ کرلیتے ہیں۔

علی عباس حسینی نے اپنے دیگر افسانوں کی طرح اس افسانے میں بھی مشرقی مزاج اور مشرقی نفسیات کی ترجمانی کی ہے۔ سلما میں وہ تمام اوصاف، خوبیاں اور نفسی پہلو موجود ہیں جو ایک ہندوستانی و اسلامی عورت میں موجود ہوتے ہیں۔ سلما ایک تعلیم یافتہ، شوہر پرست اور باحیا عورت ہے۔ وہ شوہر کو اپنا ناخدا مانتی ہے۔ اس کی نظر میں شوہر کا وہی مرتبہ ہے جسے اسلام نے بتایا ہے۔ ان تمام اوصاف کے ساتھ وہ نفس کش، ایثار و قربانی، غیرت و حمیت، ہمدردی بلکہ ہم گدازی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ صعوبتوں اور مشکلوں سے ٹکرانا اور حالات کا مقابلہ کرنا وہ بخوبی جانتی ہے۔ عزم و استقلال، صبر و تحمل اس کی شخصیت کا اٹوٹ حصہ ہے۔ چنانچہ جب سلما کو

باپ کے فیصلے کا علم ہوتا ہے تو وہ شرم وحیا اور سنسکار کی وجہ سے براہِ راست اپنے باپ سے نہیں کہتی بلکہ اپنی سہیلی کی ذریعے کہلواتی ہے کہ وہ طلاق کے بارے میں قطعی نہ سوچیں۔ جس سے میرا نکاح ہوگیا وہی میرے شوہر ہیں۔ میں ان کی لونڈی ہوں چاہے وہ مجھے پوچھیں یا نہ پوچھیں۔ میں ان کے نام پر بیٹھی رہوں گی۔ سیکڑوں رانڈے ساری عمر یوں ہی بسر کردیتی ہیں پھر میں ایسا کیوں نہیں کرسکتی۔ اگر طلاق کا پھر کسی نے نام لیا تو میں کچھ کھا کے سو رہوں گی۔ بالآخر باپ بیٹی کے سامنے مجبور ہوجاتا ہے اور ادھر منور میں رتی بھر بھی فرق نہیں آتا۔ وہ اپنی دنیا میں مست رہتا ہے۔

قدرت کی پکڑ کب انسان کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے کچھ پتا نہیں ہوتا۔ منور کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کا پورا بدن پھوٹ جاتا ہے۔ اچھے سے اچھے ڈاکٹر تعینات کیے جاتے ہیں۔ نرسیں خدمات کے لیے معمور ہوتی ہیں۔ لیکن جو خدمت بیوی کرسکتی ہے بھلا نرس اس کی جگہ کیسے لے سکتی ہے۔ بدن پر دانے نکلنے سے پورا بدن پھوڑا ہوجاتا ہے۔ چہرہ بری طرح مسخ ہوجاتا ہے۔ حتیٰ کہ آنکھوں کی بینائی بھی چلی جاتی ہے۔ سلما کو جیسے ہی منور کی حالتِ زار کے بارے میں پتا چلتا ہے وہ تمام بندھنوں کو توڑ کر اور شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر منور کی خدمت کے لیے چلی آتی ہے۔ باپ بیٹی کی ضد اور عزم کے آگے ہار جاتا ہے۔ اس لیے ساتھ میں ماں کو روانہ کر دیتا ہے۔ سلما دیکھتی ہے کہ منور ایک طرف بستر پر لیٹا ہوا ہے اور کوئی بھی اس کا پرسانِ حال نہیں ہے۔ سلما اپنے شوہر ڈاکٹر منور کی تیمارداری میں دن رات ایک کر دیتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکٹر منور تندرست ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر منور کو اپنی آنکھوں کے چلے جانے کا بہت دکھ ہوتا ہے اور وہ رو رو کر برا حال کر لیتا ہے۔ سلما منور کو اپنے متعلق کچھ نہیں بتاتی ہے لیکن جب ڈاکٹر منور کے صبر کا باندھ ٹوٹ جاتا ہے تو سلما اس کو تسلی دیتے ہوئے کہتی ہے ''خدا کو یوں ہی منظور تھا۔ اب اتنا رنج فضول ہے۔'' منور جیسے ہی پہلی دفعہ ایک نئی دلکش اور سریلی آواز سنتا ہے تو پوچھتا ہے کون؟ سلما رک رک کر اپنی خشک زبان سے جواب دیتی ہے۔ ''آپ کی لونڈی۔۔ سلما۔'' منور کی حیرت، استعجاب اور خجالت کی انتہا نہیں رہتی۔ وہ اپنے آپ میں حد درجہ شرمندہ ہوتا ہے اور اپنے ظلم، رویے اور برے برتاؤ کا اعتراف کرتا ہے تو سلما کا ردِعمل یوں ہوتا ہے ''آپ مالک ہیں آپ کو ہر طرح کا اختیار ہے۔'' اس جواب سے منور جواب نابینا ہوچکا تھا، کی آنکھوں پر سے تمام پردے ہٹ جاتے ہیں۔ وہ اپنے اندھے پن پر افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے ''ہائے تمھیں میں اب دیکھ نہیں سکتا!'' لیکن اخلاق، ایثار و قربان کی دیوی نہایت ہی شیریں اور نرم لہجے میں جواب دیتی ہے ''اب بھی آپ دیکھ سکتے ہیں۔ دل کی آنکھوں سے!'' لیکن منور کی روح، اس کا ضمیر یہ گوارا نہیں کرتا۔ وہ سلما سے کہتا ہے کہ تم مجھ سے طلاق لے لو اور کہتا ہے ''پہلے میں روحانی طور پر اندھا تھا، اب جسمانی حیثیت سے بھی ہوں۔ میں تمھیں اپنی لکڑی نہ بناؤں گا۔'' پھر وہ اپنی آنکھوں کی بات کرتا ہے تو سلما کی مثالی شخصیت (Typical Personality) اسے جواب دیتی ہے ''آپ آنکھوں کا کیوں بار بار ذکر کرتے ہیں پہلے بھی دو تھیں اور اب بھی دو ہیں۔'' نیز سلما منور کو ہر طرح کی دلیلوں سے، اپنے حسنِ اخلاق سے لاجواب کر دیتی ہے تو منور روتے اور مسکراتے ہوئے جذبات

سے مغلوب ہوکر کہتا ہے ''تو خدا سب کو ایسی ہی بیوی دے،'' اور بقول خود کہانی کار ''دو پھٹے ہوئے دل اس طرح مل گئے جیسے الٰہ باد کے قریب گنگا جمنا۔''

علی عباس حسینی نے اس افسانے میں سلما کو خالص مشرقی مجسمہ میں پیش کیا ہے۔ ایسا پیکر، ایسا مجسمہ، ایسی مثالی شخصیت جو اپنے اخلاقی کردار (Beheviour Moral) اور ضبطِ کردار (Behaviour Control) سے جارحانہ کردار (Beheviour Aggressive) پر فتح حاصل کر لیتی ہے اور ایک بھٹکے ہوئے انسان کو راہِ راست پر لے آتی ہے۔ ساتھ ہی علی عباس حسینی نے افسانے میں سلما کے توسل سے ایسے الفاظ ادا کرائے ہیں جو ہندوستانی خواتین کے لیے واقعی سبق آموز بھی ہیں اور مشعلِ راہ بھی۔ حقیقی مشرقی عورت کی نفسیات کو اپنے طرزِ بیان سے افسانے میں علی عباس حسینی نے کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

'طمانچہ' افسانے کے خالق علی عباس حسینی ہیں۔ یہ افسانہ ان کے افسانوی مجموعہ 'میلہ گھومنی' (1947) میں شامل ہے۔ یہ ان کا بہت مشہور افسانہ ہے۔ جو ایک افسانہ ہی نہیں بلکہ مشرقی و مغربی تہذیب کا ایک ایسا ترجمان ہے جہاں بیسویں صدی میں حسینی نے یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ مغرب کے منفی اثرات کس طرح انسانی زندگی کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ جیسا کہ علی عباس حسینی کا قلم مشرقی نفسیات کو اپنی زد میں لیتا ہے۔ یہ افسانہ بھی مشرقی و مغربی نفسیات کے تانے بانے سے تیار ایسا ہی افسانہ ہے۔ جس میں علی عباس حسینی نے اپنے زورِ قلم اور اسلوب نگارش سے افسانے کو تأثر انگیز بنا دیا ہے۔ دیگر افسانوں کی طرح اس افسانے کا میں لب لباب بھی مشرقی نفسیات ہے۔

علی عباس حسینی نے 'طمانچہ' افسانے کے ذریعے پورے مشرقی سماج کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ سعیدہ کا 'طمانچہ' صرف اس کی اپنی ماں کے منہ پر ہی نہیں بلکہ یہ پورے مشرقی سماج اور تہذیب کے منہ پر طمانچہ ہے۔ ساتھ ہی افسانہ نگار نے اس نفسیاتی زاویے پر روشنی ڈالنی چاہی کہ انسان کے نفسیاتی پہلو اور تقاضوں میں سب سے بڑا رول ماحول اور ماں کا ہوتا ہے۔ جس ماحول میں اس کی پروش ہوگی اور جس طرح کے سنسکار انسان کو اپنی ماں کی گود سے ملیں گے، اسی طرح کے عناصر اس کے آب و گل میں سرایت کر جائیں گے اور علی عباس حسینی نے اس پہلو پر بھی دھیان مرکوز کرانے کی سعی کی ہے کہ میاں بیوی میں خیالات و نظریات کا تصادم گھر کو تباہ و برباد کر دیتا ہے اور انسان مختلف قسم کے نفسی مرض میں مبتلا ہوکر اپنے کو ہلاک کر لیتا ہے۔ گو ہم کہہ سکتے ہیں کہ علی عباس حسینی کا یہ ایک کامیاب افسانہ ہے جو مشرقی و مغربی تہذیب کے مابین نفسیاتی تصادم کا آئینہ دار ہے جسے حسینی نے حسن و خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

علی عباس حسینی کے چند افسانوں کے تجزیے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ علی عباس حسینی نے اپنے افسانوں میں مشرقی سماج کے ان پہلوؤں اور زاویوں کو پیش کیا ہے جن پر مغربی تہذیب و تمدن اپنے اثرات مرتسم کر رہی تھی اور ہندستانی نسل کی نفسیات تیزی کے ساتھ مغربیت سے متاثر ہو رہی تھی لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ مغربیت کی خیرہ چشمی میں تباہی کے Twists بھی مضمر ہیں اور انھی تباہی کے Twists اور پہلوؤں کو علی عباس حسینی نے اپنے افسانوں میں بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چنانچہ آج ہم وہ تمام پہلو اور باتیں اکیسویں صدی میں بخوبی دیکھ رہے ہیں جس کا واضح عکس حسینی نے اپنے افسانوں میں سلیقہ سے برتنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس فن میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

■

Mohd. Mustmir Haryana Urdu Akademi,
IP-16, Secotor-14, Panchkula-134113

رہنما شیخ

ایک نغمہ گر شاعر
ساحرلدھیانوی

1947 میں ملک کی تقسیم، بڑے پیمانے پر تبادلۂ آبادی اور جانی و مالی تباہی کے جس قدر جیتے جاگتے نقوش اردو زبان وادب اور شعر وفن میں ملتے ہیں وہ کسی اور زبان و ادب میں نہیں ملتے۔

تبادلۂ آبادی کے عمل میں جن لوگوں کو اپنا گھر، اپنی مٹی، اپنا سماج اور اپنے رشتے ترک کرنے پڑے وہ سب زخم خوردہ تھے۔ اپنی مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی روایتوں کو سینے سے لگائے نئے افق اور نئی منزل کی تلاش میں پاکستان سے جو ادیب، شاعر اور فنکار ہجرت کر کے ہندوستان آئے ان میں ساحرلدھیانوی بھی تھے۔ زندگی کی نئی اور تازہ حقیقتوں اور سچائیوں سے سمجھوتا کرنے کی کوشش میں ساحرلدھیانوی نے زندگی کے ہر روپ کو بہت قریب سے دیکھا۔ انسانی رشتوں کی کشمکش، درد و کرب اور پیچیدگیوں کے وسیع تر تجربات سے گزر کر انھیں زندگی کی معراج حاصل ہوئی۔ حوادث اور حالات کی بھٹی میں جل کر کندن بن جانے کے اس عمل میں جو منزل ساحرلدھیانوی کو ملی اب اس سے آگے اور کوئی منزل ہی نہیں۔ آخر ساحر کو کہنا پڑا:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

جس طرح پھولوں کی خوشبو کی لطافت کو محسوس کیا جاسکتا ہے بیان نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح ساحرلدھیانوی کے فن کی لذت، لطافت، کیفیت، تازگی مشاہدات و تجربات کی گہرائی اور گیرائی اور ان کی شاعری میں عہد حاضر کی حقیقتوں اور سچائیوں کے ادراک و عرفان کو محسوس تو کر سکتے ہیں لیکن اس کا اظہار ہم خود نہیں کر سکتے۔ تفہیم فکر اور احساس کو زبان اور لفظ نہیں دے سکتے مگر اس میں ہم اپنا، سماج اور زندگی کا عکس واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

فلموں میں بحیثیت گیت نگار شامل ہونے کے بعد جو انھوں نے نظمیں اور گیت کہے ان میں حیرت ناک تسلسل ہے۔ ان کی ان تمام تخلیقات میں زندگی کی مربوط کہانی ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جس میں آنسو بھی ہیں اور قہقہے بھی، عبرت بھی ہے اور بشارت بھی۔ ساحرلدھیانوی اپنے فکر و قلم کی جنبش سے ذہن و دل کے دریچے کھولتے رہے ہیں۔

ساحرلدھیانوی کا کمالِ فن یہ ہے کہ اس نے مصرعوں اور شعروں میں نہایت شگفتہ انداز میں حکمت و دانائی کے راز کھولے ہیں۔ ان مصرعوں اور شعروں میں پوشیدہ بڑی بڑی داستانیں ہیں۔ ساحرلدھیانوی نے فکر و فن کی گہرائیوں میں اتر کر زندگی کا راز پایا ہے۔ زندگی، سماج اور زمانے کے رویوں، نیز کائنات کے گہرے مشاہدے کے بعد زندگی، سماج اور زمانے کے حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔

ساحرلدھیانوی کے فن کا جائزہ لیں تو اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کے منظرنامے ہیں۔ یہ منظرنامے ان کے مجموعۂ کلام تلخیاں میں تو کم مگر فلمی دنیا سے وابستہ ہونے کے بعد ساحرلدھیانوی کی شاعری میں زیادہ نظر آئیں گے۔ انھوں نے تصورات کو لمسی حسیت، لذت اور لفظوں کو تصویروں کا روپ دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

حسیں شبنم آلود پگڈنڈیوں سے
لپٹنے لگے سبز پیڑوں کے سائے
اجنبی باہوں کے حلقے میں لچکتی ہوں گی
تیرے مہکے ہوئے بالوں کی ادائیں اب تک
تمھارا جسم ہر اک لہر کے جھکولے سے
مری کھلی ہوئی باہوں میں جھول جاتا ہے
جوان رات کے سینے پہ دودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خوابِ مرمریں کی طرح
اگلے دن ہاتھ ہلاتے ہیں، پچھلی پیتیں یاد آتی ہیں

یہ منظرنگاری ساکت منظرنگاری نہیں بلکہ حرکت، رفتار اور عمل سے بھرپور تصاویریں ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ساحرلدھیانوی ایک مصور ہے، انسانی جذبات واحساسات کا مصور، انسانی سماج اور معاشرے کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو ان کے مشاہدے کی حد سے باہر ہو، یا انسانی فکر، تصور اور تفہیم کا کوئی رویہ، کوئی نکتہ ان کی گرفت سے دور ہو۔

ساحرلدھیانوی کی نظموں میں شعری ترتیب اور تشکیل کا تیکھا انداز ہے۔ ان کی نظموں میں نرم و نازک لہجہ، الفاظ کی حسین تراش، رنگینی و رعنائی، خوابوں میں ڈوبی ہوئی دل کش فضا اور رومانیت دیکھ کر لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ اختر شیرانی، مجاز لکھنوی، علی سردار جعفری، فیض احمد فیض اور جاں نثار اختر سے قریب ہیں اور ان کی شاعری پر ان شعرا کے تتبع کا گماں ہوتا ہے لیکن ساحرلدھیانوی کے ذاتی تجربے اس الزام کے آڑے آئے اور نفرت و بغاوت کا سیلابی نظریہ ان کے کام آیا اور، بہت جلد لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ مندرجہ بالا شعرا کی تقلید کرنے کے بجائے ان کے کلام پر ان کے ذاتی تجربوں اور غم و درد کی مہر ثبت ہے اور ان کا اپنا ایک منفرد رنگ ہے۔

یہ منفرد رنگ، خوبصورت لب ولہجہ، حیاتی تجسیم، نغمگی، لطیف تصویروں کی مرقع سازی سے عبارت ہے۔ سیاسی نظموں سے قطع نظر ان کی تمام نظمیں خوبصورت اور دل کش ہیں۔ خاص طور سے کبھی کبھی، مرے عہد کے حسینو، میرے گیت تمھارے ہیں، خوبصورت، فنکار، متاعِ غیر، شہکار، کسی کو اداس دیکھ کر اور پرچھائیاں اور کچھ فلمی گیت بھی ہیں جس میں ساحرلدھیانوی کی انفرادیت ابھری ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اردو شعر و فن میں ڈرامائی لمحوں کے تنہا شاعر ہیں۔ نظم کبھی کبھی کے یہ بند ملاحظہ ہوں:

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

کہ زندگی تری زلفوں کی نرم چھاؤں میں
گزرنے پاتی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی
یہ تیرگی جو مری زیست کا مقدر ہے
تری نظر کی شعاعوں میں کھو بھی سکتی تھی
مگر یہ ہو نہ سکا اور اب یہ عالم ہے
کہ تو نہیں، ترا غم، تیری جستجو بھی نہیں
گزر رہی ہے کچھ اس طرح زندگی، جیسے
اسے کسی کے سہاروں کی آرزو بھی نہیں
نہ کوئی جادہ، نہ منزل، نہ روشنی کا سراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
ان ہی خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھوکر
میں جانتا ہوں مری ہم نفس مگر یونہی

کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

جاں نثار اختر کے بعد ترقی پسند شعرا میں ساحر لدھیانوی ہی ایک ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری محاکات کا ایک اچھا نمونہ ہے اور غنائی اور بیانیہ کیفیات کی حامل ہے۔ 'پرچھائیاں' ساحر لدھیانوی کی ایک ایسی ہی نظم ہے۔ پوری نظم محاکات کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے اردو ادب کی بہترین نظمیں عام انسانوں کی سمجھ سے بہت بلند ہیں۔ لیکن ساحر لدھیانوی کی یہ نظم اپنی سادہ کہانی، نرم و نازک، خوبصورت الفاظ، رنگینی اور آسان بیان کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ وسیع حلقوں، تعلیم یافتہ اور ناخواندہ لوگوں تک پہنچی ہے۔ پھر بھی ہم بطور مثال اختر شیرانی کی نظم 'او دیس سے آنے والے بتا' کو پیش کر سکتے ہیں۔ پرچھائیاں کے کچھ بند ملاحظہ ہوں:

تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت کبھی یقیں کی طرح

تم آ رہی ہو زمانے کی آنکھ سے بچ کر
نظر جھکائے ہوئے اور بدن چرائے ہوئے
خود اپنے قدموں کی آہٹ سے جھینپتی، ڈرتی
خود اپنے سائے کی جنبش سے خوف کھائے ہوئے
تم آ رہی ہو سرِ شام بال بکھرائے
ہزار گونہ ملامت کا بار اٹھائے ہوئے
ہوس پرست نگاہوں کی چیرہ دستی سے
بدن کی جھینپتی عریانیاں چھپائے ہوئے
میں پھول ٹانک رہا ہوں تمھارے جوڑے میں
تمھاری آنکھ مسرت سے جھکتی جاتی ہے

نہ جانے آج میں کیا بات کہنے والا ہوں
زبان خشک ہے، آواز رکتی جاتی ہے

مرے پلنگ پہ بکھری ہوئی کتابوں کو
ادائے عجز و کرم سے اٹھا رہی ہو تم
سہاگ رات، جو ڈھولک پہ گائے جاتے ہیں
دبے سروں میں وہی گیت گا رہی ہو تم

تصورات کی چھائیاں ابھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت کبھی یقیں کی طرح

ساحر لدھیانوی ایک رومانی شاعر ہیں اور محبت ان کی زندگی اور شاعری ہے۔ عورت کی محبت سے شروع ہونے والی ان کی شاعری عورت پر ہی ختم ہوتی ہے۔ لیکن بار بار محبت میں ناکامی نے ان کے ذہن و دل پر اتنے زخم لگائے کہ زندگی کے دوسرے درد و غم پیچھے رہ گئے۔ محبت میں مسلسل ناکامی کے سبب ان کی شاعری میں جو تلخی درد و کرب اور زہر نظر آتا ہے وہ انھوں نے کسی سے مستعار نہیں لیا ہے بلکہ ان کی اپنی زندگی کی صدائے بازگشت ہے۔ اس تلخ حقیقت اور ناکامی کے باوجود انھیں اپنے چہرے پر اپنی محبوب کی جھکی ہوئی پلکوں کا سایہ نظر آتا ہے اور پھر وہ تڑپ کر پوچھتے ہیں۔ نظم متاعِ غیر کے یہ بند دیکھیے:

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گزر ہے کہ نہیں
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں

تو کسی اور کے دامن کی کلی ہے لیکن
میری راتیں تری خوشبو سے بسی رہتی ہیں
تو کہیں بھی ہو ترے پھول سے عارض کی قسم
تیری پلکیں مری آنکھوں پہ جھکی رہتی ہیں

میری درماندہ جوانی کی تمناؤں کے
مضمحل خواب کی تعبیر بتا دے مجھ کو
تیرے دامن میں گلستاں بھی ہیں، ویرانے بھی
میرا حاصل، مری تقدیر بتا دے مجھ کو

تخلیقی اظہار کی پابندی میں جدت اور آزادی کا رجحان اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اسلوب و ہیئت کی بات بے معنی ہوتی جا رہی ہے۔ اب تو صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ شاعر الفاظ کے خلاقانہ استعمال پر قدرت رکھتا ہے یا نہیں پھر وہ چاہے کسی بھی ہیئت کو استعمال کرے یا کسی بھی اسلوب کو اختیار کرے۔

ساحر لدھیانوی کی زیادہ تر نظمیں قطعہ بند صورت میں ہیں اور کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جس میں مصرعوں کی تعداد معین نہیں۔ کسی بند میں تین مصرع کسی میں چھ مصرع تو کسی میں آٹھ مصرع ہیں۔ بہر حال انھوں نے رنگ و نور، خوشبو اور نرم و نازک پیکروں سے اپنی نظموں کو سجایا ہے۔ ان کی دو نظمیں خوبصورت موڑ اور شاید کے کچھ بند ملاحظہ ہوں:

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

نہ میں تم سے کوئی امید رکھوں دلنوازی کی
نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے
نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں سے
نہ ظاہر ہو تمھاری کشمکش کا راز نظروں سے
تعارف روگ ہو جائے تو اس کو بھولنا بہتر
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا
وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اسے اک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

☆

میں نے شاید تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے

اجنبی سی ہو مگر غیر نہیں لگتی ہو
وہم سے بھی جو ہو نازک وہ یقیں لگتی ہو
ہائے یہ پھول سا چہرہ، یہ گھنیری پلکیں
میرے شعروں سے بھی تم مجھ کو حسیں لگتی ہو
دیکھ کر تم کو کسی رات کی یاد آتی ہے
ایک خاموش ملاقات کی یاد آتی ہے
ذہن میں حسن کی ٹھنڈک کا اثر جاگتا ہے
آنچ دیتی ہوئی برسات کی یاد آتی ہے

میں نے شاید تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

کہ زندگی تری زلفوں کی نرم چھاؤں میں
گزرنے پاتی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی
یہ تیرگی جو مری زیست کا مقدر ہے
تری نظر کی شعاعوں میں کھو بھی سکتی تھی
مگر یہ ہو نہ سکا اور اب یہ عالم ہے
کہ تو نہیں، ترا غم، تیری جستجو بھی نہیں
گزر رہی ہے کچھ اس طرح زندگی، جیسے
اسے کسی کے سہاروں کی آرزو بھی نہیں
نہ کوئی جادہ، نہ منزل، نہ روشنی کا سراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
ان ہی خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھوکر
میں جانتا ہوں مری ہم نفس مگر یونہی

کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

جاں نثار اختر کے بعد ترقی پسند شعرا میں ساحر لدھیانوی ہی ایک ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری محاکات کا ایک اچھا نمونہ ہے اور غنائی اور بیانیہ کیفیات کی حامل ہے۔ 'پرچھائیاں' ساحر لدھیانوی کی ایک ایسی ہی نظم ہے۔ پوری نظم محاکات کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے اردو ادب کی بہترین نظمیں عام انسانوں کی سمجھ سے بہت بلند ہیں۔ لیکن ساحر لدھیانوی کی یہ نظم اپنی سادہ کہانی، نرم و نازک، خوبصورت الفاظ، رنگینی اور آسان بیان کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ وسیع حلقوں، تعلیم یافتہ اور ناخواندہ لوگوں تک پہنچی ہے۔ پھر بھی ہم بطور مثال اختر شیرانی کی نظم 'او دیس سے آنے والے بتا' کو پیش کر سکتے ہیں۔ پرچھائیاں کے کچھ بند ملاحظہ ہوں:

تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت کبھی یقیں کی طرح

تم آرہی ہو زمانے کی آنکھ سے بچ کر
نظر جھکائے ہوئے اور بدن چرائے ہوئے
خود اپنے قدموں کی آہٹ سے جھینپتی، ڈرتی
خود اپنے سائے کی جنبش سے خوف کھائے ہوئے
تم آرہی ہو سرِ شام بال بکھرائے
ہزار گو نہ ملامت کا بار اٹھائے ہوئے
ہوس پرست نگاہوں کی چیرہ دستی سے
بدن کی جھینپتی عریانیاں چھپائے ہوئے
میں پھول ٹانک رہا ہوں تمھارے جوڑے میں
تمھاری آنکھ مسرت سے جھکتی جاتی ہے
نہ جانے آج میں کیا بات کہنے والا ہوں
زبان خشک ہے، آواز رکتی جاتی ہے

مرے پلنگ پہ بکھری ہوئی کتابوں کو
ادائے عجز و کرم سے اٹھا رہی ہو تم
سہاگ رات، جو ڈھولک پہ گائے جاتے ہیں
دبے سروں میں وہی گیت گا رہی ہو تم

تصورات کی چھائیاں ابھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت کبھی یقیں کی طرح

ساحر لدھیانوی ایک رومانی شاعر ہیں اور محبت ان کی زندگی اور شاعری ہے۔ عورت کی محبت سے شروع ہونے والی ان کی شاعری عورت پر ہی ختم ہوتی ہے۔ لیکن بار بار محبت میں ناکامی نے ان کے ذہن و دل پر اتنے زخم لگائے کہ زندگی کے دوسرے درد و غم پیچھے رہ گئے۔ محبت میں مسلسل ناکامی کے سبب ان کی شاعری میں جو تلخی درد و کرب اور زہر نظر آتا ہے وہ انھوں نے کسی سے مستعار نہیں لیا ہے بلکہ ان کی اپنی زندگی کی صدائے بازگشت ہے۔ اس تلخ حقیقت اور ناکامی کے باوجود انھیں اپنے چہرے پر اپنی محبوب کی جھکی ہوئی پلکوں کا سایہ نظر آتا ہے اور پھر وہ تڑپ کر پوچھتے ہیں۔ نظم متاعِ غیر کے یہ بند دیکھیے:

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گزر ہے کہ نہیں
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں

تو کسی اور کے دامن کی کلی ہے لیکن
میری راتیں تری خوشبو سے بسی رہتی ہیں
تو کہیں بھی ہو ترے پھول سے عارض کی قسم
تیری پلکیں مری آنکھوں پہ جھکی رہتی ہیں

میری درماندہ جوانی کی تمناؤں کے
مضمحل خواب کی تعبیر بتا دے مجھ کو
تیرے دامن میں گلستاں بھی ہیں، ویرانے بھی
میرا حاصل، مری تقدیر بتا دے مجھ کو

تخلیقی اظہار کی پابندی میں جدت اور آزادی کا رجحان اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اسلوب و ہیئت کی بات بے معنی ہوتی جارہی ہے۔ اب تو صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ شاعر الفاظ کے خلاقانہ استعمال پر قدرت رکھتا ہے یا نہیں پھر وہ چاہے کسی بھی ہیئت کو استعمال کرے یا کسی بھی اسلوب کو اختیار کرے۔

ساحر لدھیانوی کی زیادہ تر نظمیں قطعہ بند صورت میں ہیں اور کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جس میں مصرعوں کی تعداد معین نہیں۔ کسی بند میں تین مصرع کسی میں چھ مصرع تو کسی میں آٹھ مصرع ہیں۔ بہرحال انھوں نے رنگ و نور، خوشبو اور نرم و نازک پیکروں سے اپنی نظموں کو سجایا ہے۔ ان کی دو نظمیں خوبصورت موڑ اور شاید کے کچھ بند ملاحظہ ہوں:

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

نہ میں تم سے کوئی امید رکھوں دلنوازی کی
نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے
نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں سے
نہ ظاہر ہو تمھاری کشمکش کا راز نظروں سے
تعارف روگ ہوجائے تو اس کو بھولنا بہتر
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا
وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اسے اک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

☆

میں نے شاید تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے

اجنبی سی ہو مگر غیر نہیں لگتی ہو
وہم سے بھی جو ہو نازک وہ یقیں لگتی ہو
ہائے یہ پھول سا چہرہ، یہ گھنیری پلکیں
میرے شعروں سے بھی تم مجھ کو حسیں لگتی ہو
دیکھ کر تم کو کسی رات کی یاد آتی ہے
ایک خاموش ملاقات کی یاد آتی ہے
ذہن میں حسن کی ٹھنڈک کا اثر جاگتا ہے
آنچ دیتی ہوئی برسات کی یاد آتی ہے

میں نے شاید تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے

عبدالحق

پروفیسر محمود الٰہی ایک دبستان

خاکسار کی یہ خوش بختی ہے کہ ہر مرحلے پر مہربان اور قابلِ رشک اساتذہ کے سایۂ شفقت میں سیکھنے اور مطالعے کا موقع ملا۔ سرحدی ضلع کے حساس اندیشوں اور پرزور سیاسی مطالبات کی وجہ سے 1958 میں گورکھپور یونیورسٹی میں پڑھائی کا سلسلہ شروع ہوا۔ بی اے سالِ اوّل میں اردو کے تقریباً تیرہ طلبا نے داخلہ لیا۔ اس وقت تک نہ شعبہ تھا اور نہ استاد۔ غالباً اکتوبر نومبر میں مجنوں گورکھپوری کا تقرر ہوا۔ انتخاب میں دوسرا نام ڈاکٹر محمود الٰہی کا تھا۔ مجنوں صاحب کچھ ماہ ملازمت میں رہے۔ وہ ریڈر ہوکر علی گڑھ چلے گئے۔ ان کے بعد ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب باقاعدہ لکچرر کے طور پر اردو شعبے سے وابستہ ہوئے۔ یہ شاید جنوری فروری 1959 کا زمانہ تھا۔ ایک استاد، ایک کلرک اور ایک خادم پر شعبے کا مدار تھا۔ مسراجی کلرک اور رام بلاس شعبے کے مددگار تھے۔ وفاداری اور استواری کا حال دیکھیے کہ یہ تینوں تیس بتیس سال تک شعبے سے وابستہ رہے۔ استادِ محترم کی سبک دوشی کے بعد بھی رام بلاس شعبے کی خدمات سے منسلک رہے۔ مجنوں صاحب کے جسم وجسد سے اندیشہ رہتا کہ کہیں وہ چلنے میں پھسل نہ جائیں۔ ہاں چھڑی کے سہارے پر کسی قدر انھیں بھروسہ ضرور تھا۔ مگر علمی جلال اور آواز کی کڑک سے سبھی مرعوب رہتے۔ لب کشائی کی ہمت نہ ہوتی۔ انھیں پڑھانے کے علاوہ طلبا سے گفتگو پسند نہ تھی۔ ان کے جانے کے بعد ایک جواں سال، خوش مزاج، نرم گفتار اور درس کو درونِ دل اتارنے والے استاد سے سابقہ پڑا۔ شیروانی میں ملبوس، چوڑی مہری کا پاجامہ، لبوں پر پان کی سرخی، چمکتی آنکھیں، مسکراتا چہرہ، ہلکی سیاہ داڑھی، گفتگو میں نرمی، کشادہ پیشانی، خیال میں بشاشت نے تمام طلبا کو جاں دادۂ دوست بنالیا۔ مجنوں صاحب کی بزرگی کی ہیبت اور ہیئت شفیق و رفیق کی دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ وہ پابندی سے پڑھاتے ہی نہیں بلکہ پڑھنے لکھنے کا شوق بھی دلاتے۔ دھیرے دھیرے پوری یونیورسٹی میں ڈاکٹر زخمی کا ذکر عام ہونے لگا۔ بھیرو ناتھ جھا وائس چانسلر تھے۔ وہ بھی ڈاکٹر زخمی ہی کہتے سنے گئے۔ پتہ نہیں کہاں سے ان کی شاعری وجہ شناسائی بنی۔ گورکھپور آنے کے بعد کبھی ان کی زبان سے ان کا شعر نہ سنا گیا۔ ذکر آتا تو چہرے پر پشیمانی کے آثار نمایاں ہوتے۔ دو ایک سال بعد گول گھر میں محمد طٰہٰ صاحب کی دوکان پر ہندی گورکھپوری سے ملاقات ہوئی تو ڈاکٹر صاحب کے حسنِ سلوک کا جذبۂ احترام دیکھ کر حیرت ہوئی۔ دوسرے دن دریافت کیا تو بتایا کہ وہ میرے استاد ہیں۔ ان سے اصلاحِ سخن لی ہے۔ لیکن ہندی گورکھپوری کو یونیورسٹی کی محفل میں کبھی شعر کہتے نہیں سنا اور نہ موصوف نے ہی مشاعرے کی محفل منعقد کی۔ کئی سال بعد ڈاکٹر سلام سندیلوی کی آمد کے بعد کبھی کبھار شعبے کے کمرے تک شعر خوانی ہوئی۔ ڈاکٹر فضل الحق خوش گلو تھے۔ وہ دوسروں کی غزل ترنم سے سناتے، ڈاکٹر ناصر حسین نقوی ترنم اور تحت دونوں سے محروم تھے۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد شبلی کالج کے شعبے میں بطور لکچرر داخل ہوئے تو بزمِ شعر و نغمہ کا عہد شباب شروع ہوا۔ ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب کو یک گونہ گریز رہتا۔ کیونکہ وہ شعبے کو علمی فضا سے معمور دیکھنا چاہتے تھے۔

اردو کے خلاف محاذ کا مردانہ وار مقابلہ آسان نہ تھا مگر آفریں ہواس مرد کار کے استقلال کو کہ سب کچھ برداشت کرتے ہوئے کوہِ گراں بن کر کھڑے رہے۔ یونیورسٹی کے مجلسِ عاملہ میں اردو اور اردو والوں کے خلاف شورش برپا کرنے والے گورکھ ناتھ مندر کے مہنت ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتے۔ ان کے شر سے شعبے کی حفاظت معمولی بات نہ تھی، مگر یہ ان کی جرأت اور جنوں خیز بصیرت تھی کہ شعبے کی ترقی کی راہ میں حائل سنگِ گراں کو خارہ گدازی کی حکمتِ عملی سے موم کرتے رہے۔

ایم اے اور تحقیقی درجات کے لیے کوشاں تھے۔ ابھی ایم اے کی اجازت نہیں ملی تھی مگر پی ایچ ڈی میں ڈاکٹر فضل الحق کو بستی کے اسکول سے بلا کر داخلہ دلوایا۔ مسجدوں کے خطیب، خانقاہوں کے حجرہ نشیں، دفتروں کے ملازمین کو تلاش کر کے تحقیق طلبی کی تشویق دلائی۔ وہ صرف استاد ہی نہیں صاحب ادراک اور حکیم درس کے ساتھ دردوروں کے چارہ ساز بھی تھے۔ مجھے ضرورت مند جان کو یونیورسٹی کے کتب خانے میں جزوقتی ملازمت دلوائی۔ اردو کتابوں کی خریداری کے لیے ایک بڑی رقم فراہم کی۔ کتابوں کی خریداری اور جملہ معاملات میں لائبریری کا انتظامیہ بہت بدنام تھا۔ وائس چانسلر نے ڈاکٹر محمود الٰہی کو اعزازی لائبریرین مقرر کیا تو ڈاکٹر صاحب نے جان و دل کی بازی لگا دی اور آبروئے شیوۂ اہلِ نظر کو بحال کیا۔ دن رات کی مشقت کا یہ حال تھا کہ روزانہ چار کلاسیں بی اے سال اول و دوم یونیورسٹی اور نسواں کالج کے لیے وہ تن تنہا ذمے دار تھے۔ جواں سال بڑا بیٹا کشمکش حیات سے اسپتال میں نبرد آزما تھا۔ وہ بھی مفارقت کا دائمی داغ دے کر چل بسے، دل دوز صدمات کو انگیز کرنا امرِ محال تھا مگر فرض شناسی کے مطالبے دستک دیتے رہے۔ کتب خانہ، شعبے کے معاملات، اردو کے خلاف محاذ کا مردانہ وار مقابلہ آسان نہ تھا مگر آفریں ہو اس مرد کار کے استقلال کو کہ سب کچھ برداشت کرتے ہوئے کوہِ گراں بن کر کھڑے رہے۔ یونیورسٹی کے مجلس عاملہ میں اردو اور اردو والوں کے خلاف شورش برپا کرنے والے گورکھ ناتھ مندر کے مہنت ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتے۔ ان کے شر سے شعبے کی حفاظت معمولی بات نہ تھی، مگر یہ ان کی جرأت اور جنوں خیز بصیرت تھی کہ شعبے کی ترقی کی راہ میں حائل سنگ گراں کو خارہ گدازی کی حکمتِ عملی سے موم کرتے رہے۔ یہی نہیں وہ جادۂ تحقیق پر پابہ جولاں گامزن رہے۔ مجنوں صاحب نے اقبال کی رباعیوں پر اعتراضات کیے۔ ان کے جواب میں مضمون لکھنے کے لیے انھیں لکھنؤ کے کتب خانوں کی خاک بھی چھاننی پڑی۔ کیوں کہ گورکھپور میں کتابوں کی نایابی تھی۔ گرمیوں کی تعطیل میں جون پور کی خانقاہِ رشیدیہ میں خاک بسر بستوں کی ورق گردانی اور غبار آلودہ کتابوں کی صفائی بھی کرتے۔ ناچیز کبھی کبھی انھیں عرق آلود جبین و جسم دیکھ کر افسردہ خاطر ہوتا مگر انھیں سرما و گرما کا سر سے گزرنے کا احساس بھی نہ ہوتا اور مجھ کو کوفت ہوتی۔ وہ حجرہ نشینی کے مزے لیتے نہ برف نہ روشنی نہ پنکھا۔ اکثر بے آب و دانہ بھی گزر بسر کرنا پڑتا۔ اسی تیرہ و تار تنگ کوٹھری میں دنیا کا انمول پارۂ گہر بھی دستیاب ہوا۔ حافظ شیرازی سب سے قدیم دیوان کی دریافت ڈاکٹر محمود الٰہی کی علمی فتوحات کا گراں قدر سرنامۂ تحقیق ہے مگر خدمتِ علمی کے جذبے کی بے مثال انکساری دیکھیے کہ انھوں نے دیوان کو ڈاکٹر نذیر احمد کے حوالے کیا۔ انھیں اندیشہ گزرا کہ وہ اردو کے استاد اور تحقیق میں نو وارد ہیں شاید تدوین میں تشفی بخش حق ادا نہ ہو سکے۔ حالاں کہ یہ بڑی حقیقت ہے کہ معاصرین میں اردو اساتذہ کے درمیان عربی و فارسی میں انھیں بڑا عبور حاصل تھا۔ بہ قول غالب انھوں نے اپنے ہی خانوادے کے درس گاہ سے کسب نور کیا تھا۔ پروانہ چراغِ مزارِ خودیم ما عربی و فارسی کا باقاعدہ مطالعہ ان کے بڑے کام آیا۔ ڈاکٹر گیان چند جین لکھنؤ کی کانفرنس میں ایک جگہ لاہوری پڑھ رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اصلاح کی یہ لاہوری نہیں لاادری ہے گویا مصنف نے نام و نسب کے بارے میں لاعلمی کا اعتراف کیا ہے۔ مخطوطات میں کہیں کہیں اس لفظ سے سابقہ پڑتا ہے۔ اسی خانقاہ سے تذکرۂ شورش کے قدیم متن کا سراغ ملا جسے انھوں نے مرتب کر کے شائع کیا اور ناچیز کے نام معنون کیا یہ میرے لیے افتخار و اعزاز تھا کہ استاد نے حقیر شاگرد کے نام انتساب کرنے کی طرح ڈالی۔ غنی کشمیری کے شعر سے ان کی بے پناہ شفقت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

غنی روزِ سیاہِ پیر کنعاں راتما شا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

(پیرانہ سالی میں حضرت یعقوب کی تیرہ بختی کا تماشا قابلِ رحم ہے کہ ان کے نورِ چشم حضرت یوسف زلیخا کی آنکھوں کو روشنی بخشنے کا باعث بنے ہوئے ہیں)۔

ناچیز نے بھی اپنی ایک تالیف کو ایک عزیز شاگرد کے نام معنون کر کے استادِ گرامی کی روایت کو باقی رکھا ہے۔ ناچیز کے لیے دوسری سعادت بھی باعثِ شرف ہے کہ ان کے استاد پروفیسر محمد حسن صاحب نے اپنی ایک تصنیف 'آخری سلام' مطبوعہ 2002 کو ناچیز کے نام غالب کے حسبِ ذیل شعر کے ساتھ معنون کیا ہے:

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم قدرے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

دونوں کے درمیان بارہا بازانو و پیشانی کے احترام کے منظر و معمولات نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ہم جماعت تھے۔ سبھی پی ایچ ڈی کے ایک ساتھ رہ روانِ شوق کی آزمائش سے گزر رہے تھے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کا گزران مشکل ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے اپنے شاگرد ڈاکٹر محمود الٰہی کو حکم دیا کہ وہ اپنے وظیفے کی نصف رقم ڈاکٹر قمر رئیس کو دیا کریں۔ اس حکم کی تعمیل میں سر مو برابر بھی فرق نہ آیا۔ وہ علمی پیکر ایثار کے ساتھ بشری معاملات میں بھی ہر قربانی کے لیے پیش پیش رہتے۔ بیر بہادر سنگھ نے گورکھپور یونیورسٹی سے جغرافیہ میں ایم اے کیا تھا۔ جغرافیہ کے طالب علم کو اردو کے استاد سے دور کی نسبت یا تعلق نہ تھا مگر پوری فضا میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے محاسن خوشبو بن کر بکھر رہے تھے۔ اردو سے زیادہ دوسرے مضامین کے طلبا اپنے مسائل کی کامیابی کے لیے حاضر ہوتے۔ بیر بہادر سنگھ، سیاست کی بساط بدلنے پر صوبے کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ انھوں نے

موصوف اور جغرافیہ کے استاد ڈاکٹر چندر بدن تواری کو وائس چانسلر کی پیش کش کی۔ڈاکٹر تواری نے میرٹھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری قبول کرلی۔ ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب نے انکار کیا۔ وزیر اعلیٰ کی دوسری پیش کش اردو کی خدمت کی خاطر قبول کرلی۔ وہ اردو اکادمی کے چیئرمین ہوئے اور امیری میں فقیری کی مثالی قائم کی کئی باران کے ساتھ مجھے بھی مسافر خانے میں ٹھہرنا پڑا۔

در شاہنشاہی فقیری کردہَ ای

ہم جانتے ہیں کہ ان کی کارکردگی کی دوسری مثال دیکھنے میں نہ آسکی۔ خود ان کے استاد ڈاکٹر محمد حسن بھی وہ کام انجام نہ دے سکے۔ وہ اگرچہ علم و فضل کی دوراندیشی اور منصوبہ بندی میں کم نہ تھے۔ دہلی ان کی گزرگاہ عام تھی۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ان کے قدردان اور سرپرست تھے۔ پروفیسر کی تقرری کے وقت وہ کارشناس تھے۔ فاروقی صاحب کے مزاج میں وقت کی بڑی قیمت تھی۔ وہ ثانیے اور سیکنڈ کا حساب رکھتے اسی وجہ سے وہ ریل کے سفر سے گریز کرتے۔ گورکھپور جانے کی ریل کے سوا کوئی دوسری سبیل نہ تھی۔ مگر محمود الٰہی صاحب کے لیے وہ بہ خوشی آمادہ ہوئے۔ اس وقت تک تیز گام گاڑیاں یا چوڑی پٹریاں بھی نہ تھیں۔ مچھروں اور ملیریائی علاقے کا سفر فاروقی صاحب کے لیے صعوبتوں کی جگہ ایک عزیز کی عزت افزائی کے لے سرتاپا راحتِ جاں بن گیا تھا۔ اس سے قبل استاد کربل کتھا کے ایک مخطوطے کا تعارف کرا چکے تھے۔ اس زمانے میں مالک رام اور ڈاکٹر مختار الدین آرزو کے مرتبہ اور فاروقی صاحب کے شائع کردہ کربل کتھا پر علمی بحث کا در کھلا ہوا تھا۔ ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب ایک اور ادبی مباحثے میں پوری آب و تاب کے ساتھ شریک ہوئے۔ اقبال کا شعر:

محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

حرفِ شیریں کی شرح میں بڑے بزرگوں نے حصہ لیا۔ مگر موصوف نے سب سے بہتر اور موثر مقالہ قلم بند کیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جی بھر کر داد دی۔ وہ رشید صاحب کے بڑے نیاز مند تھے۔ ستر کے آس پاس مطبوعہ خطوط سے اس گہرے تعلق کی تصویب ہوتی ہے۔ وہ ڈاکٹر محمد حسن کے شاگرد رشید تھے۔ مگر ان کے بدخواہ کے منصوبے کی گرانٹ کو منظور کرنے میں یو جی سی کے دفتر میں ذرہ برابر بھی پس وپیش نہ کی۔ ان کی نظر میں اردو کا ہر استاد محترم اور معزز تھا۔ ان کے روابط میں کہیں کوئی کمی نہ دیکھی گئی۔ اردو اساتذہ میں چشمک آرائیاں بھی کم نہ تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کا حسنِ سلوک صلحِ کل کا تھا۔ اسی وجہ سے وہ سب کے لیے عزیز تھے۔ ستمبر 1961 میں شعبے کے جریدے 'افکار نو' کا دوسرا شمارہ شائع ہوا۔ اس میں پہلی بار کلام اقبال کے عربی تراجم پر پہلا مضمون انھوں نے ہی قلم بند کیا اس کا عنوان تھا 'کلام اقبال کا عربی میں منظوم ترجمہ' اس میں ڈاکٹر عبدالوہاب عزام کے تراجم پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی تھی۔ اقبال سے ان کو والہانہ وابستگی تھی۔ انھیں کے فیض سے اس ناچیز کو بھی اقبالیات سے شوق پیدا ہوا وہ پیرہن کے تار تار میں بوئے دوست بن کر حاصلِ حیات کا حصہ بن گیا۔ اگرچہ اقبال پر ان کی کوئی مستقل کتاب نہیں ہے مضامین و مقالات کی مدد سے ایک مجموعۂ مقالات ترتیب دیا جاسکتا ہے۔ اکادمی کی چیرمینی کے زمانے میں علامہ پر ایک مذاکرہ بھی منعقد کیا جو شائع بھی ہوا ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ 'بازیافت' ہے۔

ساتھ رہ روان شوق کی آزمائش سے گزر رہے تھے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کا گزران مشکل ہورہا تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے اپنے شاگرد ڈاکٹر محمود الٰہی کو حکم دیا کہ وہ اپنے وظیفے کی نصف رقم ڈاکٹر قمر رئیس کو دیا کریں۔ اس حکم کی تعمیل میں سرمو برابر بھی فرق نہ آیا۔

انارکلی ڈرامے پر شامل مضمون ناچیز کی نظر میں اب تک لکھا گیا سب سے اچھا اور فکرانگیز مضمون ہے۔ اسی طرح سرسید کی تحقیقات پر مضمون نقطۂ تحقیق کا حرفِ آغاز ہے۔ نکات الشعرا کے دوسرے قلمی نسخے کی دریافت اور متن کی بحالی بھی دل چسپ تحقیقی کوشش ہے۔ اسی طرح فسانۂ عجائب کے اہم اور بنیادی متن کی اشاعت سے انھوں نے نئی جہات کی دریابی کی۔ دیوانِ ناسخ، صحیفۂ محبت وغیرہ اہم دستاویزات کی دریافت بھی ان کی تحقیقی کاوشوں میں خوش گوار اضافے ہیں۔ 'فسانہ عجائب کا بنیادی متن' اور 'نکات الشعرا' (1973) ناچیز کی نگرانی میں دہلی کے جمال پریس سے شائع ہوئے۔ 'صحیفۂ محبت' 1964 میں شائع ہوا۔ ان کی سب سے مفید اور معتبر کتاب 'اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ' ہے جسے مکتبہ جامعہ دہلی نے 1973 میں پہلی بار شائع کیا تھا۔ یہ پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جس پر انھیں 1958 میں سند تفویض ہوئی تھی۔ یہی ان کی سب سے مشہور تصنیف ہے۔ یہ بات کسی حیرتِ فارابی سے کم نہیں ہے کہ بیشتر بزرگ اساتذہ کی طرح ڈاکٹر محمود الٰہی کا تحقیقی مقالہ ہی ان کی شہرت کا سبب بنا۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی 'ذوق سوانح اور انتقاد' کے لیے جانے پہچانے گئے۔ ڈاکٹر قمر رئیس 'پریم چند کا تنقیدی مطالعہ' کی بدولت شناخت قائم کرسکے بلکہ لکچررشپ، ریڈرشپ اور پروفیسر شپ کے لیے یہی کتاب معاون بنی۔ باقی تمام تصانیف طفیلی ہیں۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی مولانا ابوالکلام آزاد کی وجہ سے متعارف ہوئے۔ ان بزرگوں کے یہ مقالے ہی عمرِ رائگاں کے محصولات ہیں یہ کتابیں طالب علمی کے زمانے کی یادگار ہیں۔ پروفیسری کے عہد گل کی نہیں۔ اسے ہم ترقیِ معکوس سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔ اس ترقی معکوس میں بیش ازبیش اساتذہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ یہ درسیات کے فسانے بھی غریب ہیں کہ توفیق میں ترقی ہوتی رہی مگر علمی انحطاط میں اضافہ ہوتا رہا۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے 1965 میں 'اردو کا پہلا ناول خطِ تقدیر' شائع کرکے ایک نئی بحث کا آغاز کیا۔ فکشن کے فریب و حقیقت کا فسانہ حوالہ بنتا گیا۔ تذکرۂ شورش اور طبقاتِ شعرائے ہند (1983,1984) تذکرہ نگاری کی تاریخ میں اہم دریافت کہے جاسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے بکھرے ہوئے مضامین کی بڑی تعداد ہے۔ شکر ہے کہ ان کی بیٹی ڈاکٹر زیبا نے 'سفینۂ نقد' کے نام سے 2013 میں مضامین کا ایک دوسرا مجموعہ شائع کیا ہے۔ ابھی بھی بہت سے مضامین کسی مرد افگنِ علم کے منتظر ہیں۔ مرحوم کی کئی بیٹیاں اردو کی خدمت پر مامور ہیں۔ میراثِ پدر میں شہمیرِ علم انھیں حاصل ہے بازوؤں میں زورِ قلم پیدا ہوجائے تو ہر تحریر کو ترتیب و تحفظ حاصل ہوگا۔ ڈاکٹر زیبا وغیرہ بسیار کوش اور باذوق ہیں۔ امید ہے کہ ڈاکٹر محمود الٰہی کے اثاثے کو ضبطِ تحریر و اشاعت سے انھیں جاوداں زندگی حاصل ہوگی۔ الہلال کے ساتھ کلاسیکی متون کی اشاعت اور انتخاب ان کا ایک اہم کارنامہ ہے جس کے لیے اساتذہ و طلبا زیر بار اور لکھنؤ اردو اکادمی سرخ رو ہوتی رہے گی۔

ان کارگزاریوں سے قطعِ نظر ان کا بڑا کام یہ ہے کہ وہ اپنے تمام طلبا کی ترقیِ درجات کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے اور سوسو جتن کرکے رقیبِ روسیاہ سے بھی سفارش کرتے۔ خاکسار جو کچھ بھی حاصل کرسکا ان کی نوائے پرورش کا نتیجہ ہے۔ جغرافیہ میں داخلہ لینے کے بعد

اردو ایم اے میں داخلہ دلوایا۔ اقبال سے تعلق پیدا کیا۔ دہلی دانش گاہ میں تین ماہ کی جزوقتی ملازمت کے لیے ڈاکٹر محمد حسن صاحب کو سفارشی خط لکھا۔ دہلی میں داخل ہوا مگر عارضی نوکری نہ مل سکی کیوں کہ رخصت پر جانے والے نہ جاسکے۔ خواجہ احمد فاروقی مرحوم نے بے سروسامانی میں بھی وطن واپس جانے نہ دیا۔ کیوں کہ بھیجنے والے سے زیادہ بلانے والے کی عزتِ نفس صلیب و سادات کی آزمائش سے دوچار تھی۔ ان بزرگوں کی سرپرستی پر نازِ بیجا بھی وجہ تسلی و تسکین خاطر ہے۔ وہ کئی بار شعبے کی انتخابی مجلسوں میں شریک ہوئے۔ کئی لوگ لکچرر، ریڈر اور پروفیسر ہوئے۔ پروفیسری کے ایک انتخاب میں ان کے عزیز شاگرد پروفیسر محمد انصاراللہ نظر نہیں چاہتے تھے کہ شعبے کے معروف استاد ڈاکٹر عتیق اللہ کی ترقی ہو انھوں نے زلف کاکل اور گیسو کے فرق سے متعلق سوال پوچھ کر امیدوار کو ہراساں کیا۔ موصوف نے شعر پڑھا اور یہ بھی خیال نہ کیا کہ کمیٹی میں وائس چانسلر پرووائس چانسلر اور وزیٹر کا نمائندہ غیر مسلم ہے۔ فیصلے کے وقت وہ بضد تھے کہ یہ مستحق نہیں ہیں۔ حالاں کہ علی گڑھ سرسید نگران کے گھر جاکر ناچیز نے ان سے ڈاکٹر عتیق اللہ کے لیے پرزور سفارش بھی کی تھی۔ فیصلے کے وقت وہ کمیٹی میں مچل گئے کہ منانا مشکل ہوگیا۔ میری نہ سنی تو ڈاکٹر محمود الٰہی نے ان پر دباؤ ڈالا کہ تقرری کی توثیق فرمائیں۔ آخر کار وہ بادلِ ناخواستہ مان گئے۔

دوسری طرف قسمت کی نیرنگی دیکھیے۔ ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے ریڈرشپ کے انتخاب میں کسی کو نہیں ہونے دیا۔ وائس چانسلر پروفیسر آرسی مہروترا نے ازراہِ شفقت پوچھا کہ کس کو کارشناس بنایا جائے۔ راقم نے ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب کا نام لیا۔ وہ بلائے گئے۔ اب صدارت بدل چکی تھی۔ 1980 کا سال تھا۔ استاذی تشریف لائے اور دوسرے اکسپرٹ ڈاکٹر رضی الدین صاحب تھے۔ دونوں کی حمایت کے باوجود ڈاکٹر فضل الحق صاحب بے قابو ہوگئے۔ صبح کی نشست میں ہونے والی بیگم ڈاکٹر عابدہ بیگم کا تقرر کراچکے تھے۔ سہ پہر کی میٹنگ میں بدمزگی کی حد تک اختلاف رونما ہوئے ہمارے ساتھ فریدی صاحب، شریف صاحب، شمیم صاحبہ کسی کا نہ ہوسکا۔ پروفیسر آرسی مہروترا نے دوبارہ دریافت کیا کہ کسے اکسپرٹ بنائیں۔ ناچیز نے بلاتکلف ڈاکٹر محمد حسن صاحب کا نام لیا۔ میٹنگ میں وہ تشریف لائے۔ مگر ڈاکٹر فضل الحق کے سامنے وہ بھی ناکام رہے۔ یہ حضرات پیکر شرافت تھے۔ صدر شعبہ بدخواہ ہی نہیں کج کلام بھی تھے۔

بھلا ہوا کہ ترقی کی اسکیم نافذ ہوئی تو ہم سب ریڈر اور پروفیسر ہوئے۔ بزرگ استاذ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی اور ڈاکٹر قمر رئیس بھی اسی منصوبے کے تحت منتخب ہوئے اور بعد کے سبھی ہم کار اسی بار احساں سے سرفراز ہوئے۔

کسی استاد کے محصولات کا ایک میزان یہ بھی ہے کہ اس کی پرورش و پناہ میں کیسے اور کتنے افراد کو اماں ملی۔ وہ ایک فرد نہ تھے بلکہ اپنے وجود میں ایک مخصوص موثرات کی تربیت گاہ تھے۔ ان کی راہ کہکشاں میں کیسے کیسے علمی چراغ فروزاں ہوئے۔ پروفیسر انصاراللہ نظر، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر فیروز احمد، پروفیسر فضل امام رضوی، پروفیسر جمال حسین، پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر افضال حسین، پروفیسر فضل الحق مرحوم وغیرہ کی خدمات سے اس دبستان کی دہلیز روشن ہورہی ہے۔ اس زاویہ نظر

ان کی راہ کہکشاں میں کیسے کیسے علمی چراغ فروزاں ہوئے۔ پروفیسر انصاراللہ نظر، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر فیروز احمد، پروفیسر فضل امام رضوی، پروفیسر جمال حسین، پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر افضال حسین، پروفیسر فضل الحق مرحوم وغیرہ کی خدمات سے اس دبستان کی دہلیز روشن ہورہی ہے۔

میں بھی کوئی استاد ان کی ہمسری کا مدعی نہیں ہوسکتا۔ پاسِ ادب اور اساتذہ کا احترام واجب ہے۔ ورنہ اساتذہ کے ہاتھوں طلبا کے استحصال کی کہانی بھی بڑی دل دوز ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی پیکر ایثار اور دردمند دل کے مالک تھے۔ ہوسِ سیر و تماشا سے بے نیاز رہے۔ 1976 میں دسہرہ کی چھٹیوں میں ایک ہفتے کے لیے دہلی آگئے۔ حسبِ معمول میرے گھر قیام کیا۔ تاکید کی کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ میری رہائش یونیورسٹی احاطے میں ہی تھی۔ ایک شام ڈاکٹر محمد حسن صاحب اچانک آگئے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں حیرت کی فراوانی میں کچھ لمحے کے لیے ڈوب گئے۔ ڈاکٹر محمد حسن صاحب بولے کہ مراقبے کے لیے مہرولی میں میرے بزرگوں جمالی وکمالی کے حجرے موجود ہیں۔ سکوتِ شام وہاں اچھی گزرے گی۔ ڈاکٹر محمود الٰہی زود پشیمانی سے دوچار تھے۔ کافی دیر تک گفتگو اردو پر ہی مرتکز رہی۔ اکثر کاموں کے بار سے اوب کر وہ سفر کرتے۔ چند ماہ کے لیے قائم مقام وائس چانسلر ہوئے۔ اس دوران ہر سفر موقوف رہا۔ اپنی شدبدھ بھی کم تھی۔ ذمے داری سے سبک دوش ہوئے تو پھر روپوشی کی خاطر دہلی آگئے۔ چند دنوں بعد گورکھپور واپس گئے۔ گھٹنوں میں کبھی درد بڑھتا تو تمباکو کے پتے سے سینکائی کرتے۔ سرما میں انگلیوں کے جوڑوں کا درد شروع ہوتا تو انگیٹھی سے گرم کرتے۔ پوری سردی ان کا آتش دان روشن رہتا۔ ہر سال ایک کوئنٹل اعلیٰ کا کوئلہ خرچ ہوتا۔ پوری زندگی سادگی سے عبارت تھی۔ مگر عزت وحمیت میں مرد تھے۔ مولانا اسعد مدنی والد بزرگوار کے مدرسے میں ان کے ہم سبق اور ہم نشین تھے۔ یہ بھی ٹانڈہ کے ہی رہنے والے تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے دوستانہ مراسم تھے۔ وہ سیاست میں سرگرم ہوئے اور دیوبند دہلی کی سیاست کا شکار ہوا تو ڈاکٹر محمود الٰہی نے مولانا اسعد مدنی سے ترکِ تعلق کرلیا۔ استاد محترم معتدل مزاج رکھتے تھے۔ فکر و نظر میں بھی اعتدال پسندی ان کا طریقۂ کار تھا۔ ان کی تنقیدی نگارشات اور تحقیقی بازیافت میں ادعائیت نہیں ملتی۔ ترقی پسندی، جدیدیت وغیرہ مباحث میں بھی وہ متوازن فکر کے حامل تھے۔ ان تحریکوں کی مسلوب فکر اور مجہول نظریات کے وہ ہمیشہ مخالف رہے۔ ابتدائی زمانے میں وہ انقلابی شاعری کی تخلیق و ترجمانی کرتے رہے بعد میں وہ تخلیقِ شعر سے دست بردار ہوگئے مگر زخمی تخلص نام ونشان سے چسپاں ہی رہا۔ کئی برس سے وہ بیمار تھے۔ 19 مارچ کی سہ پہر کو اطلاع ملی کہ ڈاکٹر صاحب نہیں رہے:

زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اس کی
وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا محمود

2 ستمبر 2013 کو ملاقات کے آخری لمحات نقش بن کر رہ گئے۔ چلنے سے معذور، بولنے میں لکنت، وہیل چیئر پر بیٹھے۔ دیکھتے ہی زور سے بولے مائی فیملی، دونوں ہاتھ بڑھاتے ہوئے گلے ملنے کی خواہش، مصافحے پر مطمئن ہوئے، بے بسی کا یہ دردآشوب منظر کئی دنوں تک کابوس بن کر ستاتا رہا۔ پھر موت کی خبر!!

نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہوتا

■

Prof Abdul Haq, Prof Emirates, Dept of Urdu, Delhi Unversity, Delhi - 110007

خوشونت کی کالم نویسی اور نشاطیہ کلچر

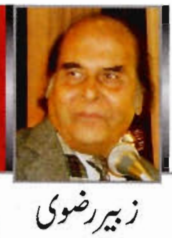

زبیر رضوی

خوشونت سنگھ پورے سو برس کی زندگی جی لیتے تو اُن کی ہفت رنگ سوانح کا آخری ورق اور بھی دلچسپ ہوجاتا۔ ننانوے برس کی کہانی سناتے ہوئے راوی کا خاموش ہوجانا اور آخری سین کے اَدھورے بیانیے پر اَچانک پردے کا گر جانا، صرف ایک برس کی زندگی مانگنے والے دستِ دعا کا عرش سے محروم ہو کے لوٹ آنا اِس رازِ سربستہ کا انکشاف تھا کہ زمین کی چاروں سمتوں کے آفاق تو انسانی زندگی کے نام لکھ دیے گئے تھے لیکن موت کے بعد کی خلوتوں کا جلال و جمال مشیت نے اپنے ہی اختیار میں رکھا تھا۔ خوشونت سنگھ اس 'جہانِ معلوم' کے سارے گُل بوٹے اپنے دامن میں سجاتے رہے تھے، انھوں نے 'جہانِ نامعلوم' کو اپنی تیسری آنکھ سے دیکھنے کی کوشش بھی کی وہ اس طرح کہ اپنا 'وفاتیہ' بھی لکھا اور 'موت میری دہلیز پر' والی تحریر بھی لکھ ڈالی مگر وہ زندگی کے نعمت کدوں اور راحت کدوں میں اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے آئینہ بردار بنے رہے تھے انھوں نے دانستہ اپنی اُفتادِ طبع اور طرزِ حیات کو ایک دہریے اور ناستک کا نام دیا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ وہ ایک بے حد خدا پرست اور رسم و رواج پر سختی سے کاربند معاشرے کے پروردہ ہیں یہاں عقیدہ، لوگوں کی پیشانیوں پر بندیا اور سجدہ بن کر دملتا، چمکتا رہتا ہے گھر اور گھر سے باہر، مندر، مسجد اور گورودوارے اپنے ماننے والوں کو آوازیں دیتے رہتے ہیں 'دہریت' اور 'ناستک' ہونے کا اعلان دراصل ایک ایسی محفوظ پناہ گاہ ہے جس کی کنجی خود آپ کی جیب میں پڑی رہتی ہے۔ خوشونت سنگھ نے اَن گنت مکھوٹے پہنے، کئی طرح کی زندگی جی، کبھی ایک مشغلہ اپنایا تو کبھی دوسرا، کبھی ٹینس اور بیڈمنٹن کے چھوٹے Space میں بلے بازی کرتے رہے اور کبھی عالمی نقشے پر نظر ڈال کر اپنی پسند کے ساحلوں اور بندرگاہوں پر لنگر انداز ہوتے رہے خوش حال اور باعزت خاندان میں پلے بڑھے جس معاشرے کے روز و شب کی رونقیں اُن کے حصے میں آئیں وہ نسبتاً کشادہ دل، خوش پوش اور نشاطیہ کلچر کا دلدادہ تھا خوشونت سنگھ نے جن گلیاروں سے گزر کر زندگی کے کشادہ میدانوں میں آ کر سانس لینے اور زندگی کو سیاست، ثقافت اور تخلیقی فنون سے ہم آہنگ کر کے اپنی زندگی کے خالی Space کو جن رنگوں سے سجانے اور سنوارنے کی کوشش کی اُن میں شراب اور شاہدِ رعنا کے تصور کو شہ نشینی ملی۔

خوشونت سنگھ نے اپنے دہریے پن، میخواری، حسن پرستی، رعنائیوں سے ہم کلامی اور ہم آغوشی کے لیے اپنے صحافتی پیشے کو پہلے تو بے حد دل کش اور مرکزِ توجہ بنایا اور پھر اس کی مقبولیت کی فضا سازی کے لیے اُس میں نسائی حُسن اور اس کی مدح سرائی کے ساتھ ساتھ میخواری کی چاش بھی چھڑک دی خوب صورت جوڑوں کے ساتھ شامیں گزارنے کی جلوہ سامانیوں کو بھی رواج دیا 'کسولی' میں جو اُن کا گرمائی مستقر تھا وہ حُسن پرور منظروں سے ہر شام سنور اُٹھتا تھا کہا جاتا ہے کہ عرب کے ایامِ جاہلیت میں، امرؤ القیس کی شاعری کا گھر گھر چرچا تھا وہ اور اُس کی شاعری بے حد پسند کی جاتی تھی یہاں تک کہ ماں اپنی

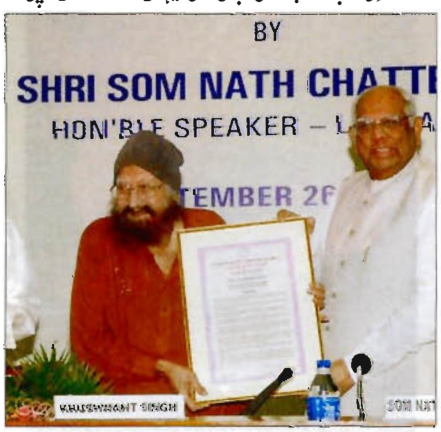

جوان اور شادی کے لائق لڑکیوں کے رشتوں کی فضا سازی کی درخواست لے کر امرؤ القیس کے پاس جاتی اور اسے اپنی لڑکی دِکھا کر اس پر توصیفی نظم لکھنے کی فرمائش کرتی۔ خوشونت سنگھ کے کالم ہمارے ہندوستانی معاشرے میں اسی طرح کی مقبولیت کے حامل تھے میں ایسے اَن گنت ناموں اور دوستوں سے واقف ہوں جن کے لیے خوشونت نے کالم لکھے اور وہ سلیبریٹی بن گئے۔ خوشونت سنگھ نے اپنے سنڈیکٹ کالم کو گلیمر بھی دیا اور اسے فیشن کلچر کی طرح مقبول بنایا۔ خوشونت کے تخلیقی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا تھا، انھیں کہانی لکھنے اور سنانے کا فن آتا تھا، وہ جب جب کسی مرد یا عورت کو اپنے کالم میں محوری کردار بناتے تو ایسے دلچسپ انداز میں کردار سازی کرتے کہ وہ کردار کالم پڑھنے والے قارئین کے حافظوں میں دیر تک روشن رہتا۔ خوشونت سنگھ کو کالم نویسی میں اپنی عمر کے شاداب دنوں کے رائیگاں جانے کا شدید احساس تھا کیونکہ افسانہ نگاری ان کی پہلی پسند اور اُن کی آنکھوں کا پہلا خواب تھا۔ ان کی افسانہ نگاری کا یہ وہ ابتدائی زمانہ تھا جب میری اُن سے پہلی ملاقات ترقی پسندوں کے مقبول اور محبوب رسالے 'شاہراہ' کے دفتر میں ہوئی تھی۔ پرکاش پنڈت 'شاہراہ' کے مدیر تھے۔ پاکستان سے ہجرت کر کے اردو ادیبوں کا ایک بڑا گروپ دلّی آ کر بس چکا تھا، ان کے لیے دلّی، لاہور جیسا ہی ادب پرور شہر بے مثال تھا خوشونت اردو افسانے پر اور اردو میں مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے اکثر نظر آ جاتے وہ ان دنوں بھی اپنی صحافیانہ اور خلاّقانہ ذہانتوں کی بنا پر خاصے معروف تھے۔ سجان سنگھ پارک ان کی قیام گاہ تھا اور تب اُن کے دروازے پر بلا وقت مقرر کیے Bell نہ بجانے کی تختی آویزاں نہیں تھی لیکن بعد کے دنوں میں اُنھوں نے خود کو منظّم کر لیا تھا اُن کے کاموں اور سرگرمیوں میں ترتیب آ چکی تھی وہ فون خود اٹھاتے تھے اس لیے ان سے کام کی اور مطلب کی بات کرنے میں سہولت میسر تھی، وہ صحیح کاز کی حمایت کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے اور بلا کسی تامّل اور جھجک کے اُس بات کی تائید کرتے تھے جو انھیں پسند ہوتی اُن سے اُس بیان پر اُن کے اور نکھل چکرورتی اور کلدیپ نیّر کے دستخط حاصل کرنے کی ڈیوٹی میری لگائی گئی جب ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل کی پوسٹ کے لیے I.A.S آفیسر کا تقرر کرنے کے بجائے ایک مستحق براڈ کاسٹر کا تقرر کرنے کے لیے ہم پروگرام والوں نے میڈیا میں مہم چلا رکھی تھی، خوشونت سنگھ نے نہ صرف یہ کہ آمادگی کے ساتھ ہماری اپیل پر سب سے پہلے دستخط کیے بلکہ متعلقہ وزیر سے میرے سامنے زوردار لفظوں میں ہمارے کاز کی حمایت بھی کی۔

خوشونت سنگھ کی مقبولیت اور اُن کی جمہوریت پسندی والے امیج کو اُس وقت ٹھیس لگی جب انھوں نے

مسز اندرا گاندھی کے ملک پہ ایمرجنسی لگانے کی پرزور حمایت کی اور پدم بھوشن کا خطاب بھی قبول کیا۔ انھوں نے گولڈن ٹمپل پر بلواسٹار نامی کارروائی کے خلاف احتجاجاً لوٹا دیا۔ وہ سلمان رُشدی کو ہندوستانی انگریزی ادب کا صفِ اوّل کا ناول نگار مانتے تھے لیکن جب اُن سے پینگوئن نے اُس کے ناول 'شیطانی آیات' پر رائے مانگی تو خوشونت نے ناول نہ شائع کرنے کی رائے دیتے ہوئے یہ انتباہ دیا کہ اِس ناول کی اشاعت سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوں گے مگر 'انڈیا ٹوڈے' نے اِس ناول کے کچھ حصے چھاپ دیے تو ناول کے خلاف احتجاج کی آگ بھڑک اٹھی، رُشدی نے اس سب کے لیے خوشونت کو ذمے دار ٹھہرا دیا۔

خشونت سنگھ کا ایک بڑا اڈّہ آل انڈیا ریڈیو بھی رہا تھا، اُن کے ساتھ مراسم میں یہ بھی ایک حوالہ اور کڑی بنا رہا، یہ نومبر 1990 کی بات ہے جب چھہتر سالہ خوشونت سنگھ اپنی سجان سنگھ پارک والی رہائش گاہ پر میرے ریڈیو مائیک کے روبرو باتیں کرنے اور میرے سوالوں کا جواب دینے کے لیے آ بیٹھے تھے، یہاں اُس انٹرویو کو دُہرانے کا موقع نہیں لیکن اس انٹرویو میں پوچھے گئے بیشتر سوالوں کے جواب میں انھوں نے عادتاً سچ بولنے کو ترجیح دی۔ جب میں نے شکایت کے لہجے میں کہا کہ آپ نے پاکستانی ڈپلومیٹ جو اردو کے ممتاز افسانہ نگار بھی تھے، جن کا نام منیر احمد شیخ تھا، آپ نے یہ لکھا کہ آپ کے اور ان کے درمیان اردو، شراب اور حسین عورتیں وجہِ دوستی تھیں تو خوشونت کا جواب تھا ''میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کسی کے بارے میں حلفِ رازداری اُٹھایا ہو، میں جو کچھ بھی لکھتا ہوں وہ ہوتا ہے جو میرے علاوہ کچھ اور لوگوں کے علم میں بھی ہوتا ہے، میں ممنوعات (Taboos) کا قائل نہیں ہوں اور جو خوبیاں میں نے منیر کی ذات سے منسوب کی ہیں کیا وہ بُری ہیں''؟ اِس آخری جملے پر میں بھی قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

خوشونت نے بچوں کے ممتاز شاعر شفیع الدین نیّر سے اردو پڑھی اور ان کی رہنمائی میں اُس پر عبور حاصل کیا تھا، وہ برملا کہتے تھے کہ اردو ان کی مادری زبان جیسی ہے۔ انھوں نے اپنا مشہور ناول 'دِلّی' پچیس برسوں کے مطالعے کے بعد لکھا تھا، وہ اعتراف کرتے تھے کہ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے بارے میں میر کی آپ بیتی اُن کا کلیدی ماخذ تھا۔ ناول کا ایک کردار قمر النساء بھی میر کی

شاعری میں جگہ پانے والی ایک نسائی شبیہ کی دین تھا۔ ناول میں 1857 کی بغاوت کا سارا پس منظر بہادر شاہ ظفر پر چلائے جانے والے مقدمے کی کارروائی سے لیا گیا تھا، غالب اور اقبال سے فکری قربت کا احساس خوشونت کو بہت تھا، دیوانِ غالب ان کے مطالعے میں رہتا تھا اور غالب کے بیشتر اشعار ان کی روزمرہ کی گفتگو کا حصہ بن جایا کرتے تھے۔ انھوں نے اقبال کے شکوہ اور جوابِ شکوہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا، فیض، مخدوم اور راشد

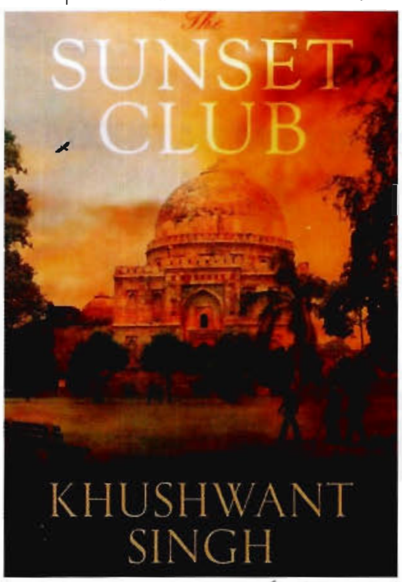

کی شاعری کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا۔

ممبئی میں قیام کے دوران خوشونت سنگھ کی سردار جعفری اور رفیق زکریا سے ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں، اُن ملاقاتوں کے درمیان اُن کی بات چیت اردو ہی میں ہوا کرتی تھی۔ دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ خوشونت پنجابی بولتے تھے مگر وہ گورمکھی لپی سے نابلد تھے جب ولایت پہنچ کر اپنی ماں سے خط وکتابت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھیں پنجابی یعنی گورمکھی لپی سیکھنی پڑی اُس پر انھوں نے اتنا عبور حاصل کرلیا کہ وہ گورمکھی بھی اردو اور انگریزی کی طرح لکھنے لگے۔ ان کی شخصیت بہت سوں کے لیے نزاعی تھی اور بہت سوں کے نزدیک وہ بے حد محبوب شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے اور 'ٹرین ٹو پاکستان' جیسا مقبول ناول بھی اور 'نیچر واچ' پرندہ شناسی پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جو نیچر پرستوں میں پسند بھی کی گئی اور تنقید کا نشانہ بھی بنی۔ انھوں نے ایک ڈائری بھی لکھی تھی۔ لیکن ان کی ادارت اور کالم نویسی نے بڑی دھوم مچائی۔ السٹریٹڈ ویکلی کی تعداد ان کے زمانے میں ہزاروں سے لاکھوں تک پہنچ گئی۔ ان پر بہت کچھ لکھا بھی گیا، پنجابی فکشن نگار اجیت کور نے ان پر ایک طویل خاکہ بھولا بادشاہ لکھا تھا جو خاصا مقبول ہوا تھا۔ مذہب اور اُس کے حوالے سے ملّا، پنڈت کا مذاق اور اُن کی تضحیک کے پس منظر میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ خوشونت نے سکھوں کی روشن تاریخ بھی لکھی تھی اور اپنی خواب گاہ میں آویزاں پکاسو کی تصویر کے فریم میں مصورہ ارپنا کور کی بنائی گورونانک جی کی تصویر لگائی تھی، ان کی سوانح Not a nice man to know والے عنوان کی بازگشت کشور ناہید کی سوانح 'بُری عورت کی کتھا' میں بھی سنائی دی تھی۔ خوشونت سنگھ نے اپنے بے حد مقبول انگریزی کالم کا عنوان With Malice Toward s one and All مارٹن لوتھر کنگ اور ولیم فاکنر کے سوانح نگار Stephen B. Oates سے ذرا سی تبدیلی کے ساتھ مستعار لیا تھا۔ انگریزی صحافت میں جس شخصی طرز کی کالم نویسی کو خوشونت سنگھ نے رائج کرنے کی کامیاب اور مقبول کوشش کی وہ اگلے کسی ایسے ہی تسلسل میں زندہ رہ پائے گی؟ اس کا جواب مجھے اس مصرعے سے ملتا ہے: 'اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے'۔ خوشونت سنگھ کی حسِ مزاح خاص طور سے لطائف کے تعلق سے غضب کی تھی۔ لطائف جمع کرنے کا انھیں بڑا شوق تھا اور ان کے کئی انتخاب بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اپنا مشہور کالم وہ ایک لطیفے پر ختم کیا کرتے تھے۔ اس تحریر کو ختم کرتے ہوئے سعدیہ دہلوی کا ایک لطیفہ نما جملہ بھی سن لیجیے۔ انھوں نے کہا تھا اگر خوشونت عورت ہوتا تو وہ ہمیشہ 'حاملہ' ملا کرتا، کہ اسے 'نہ' کہنے کی عادت نہیں!''

■

Mr. Zubair Razvi C-2, A B Complex, 179/8, Zakir Nagar New Delhi - 110025

نگار عظیم

ایک باغ و بہار شخصیت

صغرا مہدی

کسی اپنے کے چلے جانے کے بعد اس کی ذات سے وابستہ کچھ بھی تحریر کرنا کس قدر مشکل کام ہے؟ اردو کی ممتاز ادیبہ افسانہ نگار، ناول نگار، انشاپرداز پروفیسر صغرا مہدی کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے ایسا ہی مشکل اور تکلیف دہ احساس دل و دماغ پر طاری ہے۔ وہ ایک ایسی منفرد ہمہ جہت شخصیت کی مالک تھیں جس کا مکمل بیان ناممکن ہے۔ وہ جس خانوادے کی چشم و چراغ تھیں اور جن نامور ہستیوں کے زیر سایہ ان کی پرورش ہوئی اور جو کچھ انھیں ورثے میں ملا اس کے تمام اوصاف ان میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے اندر اس سب سے کچھ زائد بھی تھا جو ان کا اپنا، صرف اپنا تھا۔ جو انھوں نے خود حاصل کیا تھا۔ ان کا نڈرپن، بے باکانہ اندازِ گفتگو، ضد، انصاف پسندی، صاف گوئی کے علاوہ خوشامد، منافقت، فرقہ پروری اور زمانہ سازی سے دور وہ نئی اور پرانی تہذیب کا ایسا سنگم تھیں جن کے بہت سے مداح تھے۔ ان کا وجود ایسا گھنا درخت تھا جس کی شاخوں پر پرندے چہچہاتے اور تازہ دم ہوکر اڑان بھرنے کے لیے نکل جاتے۔ ان کی شخصیت ان کے اپنے خاندان میں بھی اور جہاں جہاں وہ وابستہ رہیں وہاں بھی منفرد ہی رہی۔ اس کی کئی وجہیں ہوسکتی ہیں۔

صغرا مہدی کا اصل نام امامت فاطمہ تھا۔ سات بہن بھائیوں میں درمیان کی اولاد تھیں۔ دو بھائی اور ایک بہن چھوٹے اور تین بہنیں بڑی۔ ظاہر ہے درمیان کی اولاد ویسے بھی دونوں طرف سے دباؤ میں رہتی ہے۔ بڑوں کا دباؤ اور چھوٹوں کی ذمے داری، ایسے میں اپنے لیے کوئی راہ وہ بھی علاحدہ ناممکن ہی ہے۔ لیکن صغرا مہدی نے اس ناممکن کو ممکن بنا کر اپنا نیا جہان آباد کیا۔

صغرا مہدی نے بچپن سے اپنی دنیا کو اس روپ میں دیکھنا پسند کیا جیسا کہ وہ چاہتی تھیں۔ وہ دنیا انھیں قبول نہیں تھی جیسا کہ تھی۔ لکھتی ہیں:

''مجھے کھیلوں سے دلچسپی نہیں تھی، کھیل سے چپکے سے نکل کر گوشۂ تنہائی تلاش کرلی جہاں بیٹھ کر اکیلے خود سے باتیں کرتی۔ میری اپنی خیالی دنیا تھی، جو اس دنیا سے بالکل الگ تھی۔ اس میں بسنے والے سب لوگ وہی تھے جو حقیقی دنیا میں میرے ساتھ یا آس پاس تھے۔ مگر وہ ایسے تھے جیسا میں چاہتی تھی کہ ہوں۔ اس دنیا میں ہر وہ بات تھی جو مجھے پسند تھی۔''

ہر فرد اپنے ماحول میں جیتا ہے پرورش پاتا ہے پروان چڑھتا ہے اور یہی بنیاد اس کی زندگی کی عمارت کی بنیاد ہوتی ہے۔ صغرا مہدی کے مزاج کا کھرا پن اور کھردرا پن انھیں اپنی زندگی کے حالات سے میسر آیا۔ ان کے والدین کی عمروں میں بہت فرق تھا اور مزاجوں میں بھی ماں باپ کے درمیان چھوٹی چھوٹی باتیں وجہ اختلاف بن جاتیں۔ صغرا مہدی کی اماں دادی جان کو سخت ناپسند کرتی تھیں جو رشتے میں ان کی بڑی چچی بھی لگتی تھیں بہت تیز مزاج اور سخت گیر بھی تھیں۔ ایسے میں صغرا مہدی کا معصوم بچپن اپنی نئی من پسند دنیا آباد کرکے تمام ناگواریوں سے فرار حاصل کرلیتا۔

بھوپال سے سات میل دور قصبہ باڑی میں اپنے خاندان کے زیر سایہ ان کا بچپن بیتا۔ بارنا ندی نے اس قصبے کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ کسی وقت یہاں گونڈ بھیل راجاؤں کی حکومت تھی۔ صغرا مہدی کے والد (میاں) سید علی مہدی اسی علاقے میں سب انسپکٹر تھے۔ تھانے سے ملا ایک مردانہ مکان جسے پرانے وقتوں میں مردان خانہ کہا جاتا تھا، بھی تھا جو عارضی قید خانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہاں مجرم رکھے جاتے تھے۔ علاقہ بے حد خوبصورت ہرا بھرا پھولوں کی وادیوں سے گھرا ہوا تھا۔ ندی نے اس علاقے کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیے تھے۔ یہیں ہری ہری گھاس میں لال لال بیربہوٹیاں دیکھتے ہوئے رنگ برنگی تتلیاں پکڑتے ہوئے رات کے اندھیرے میں جگنوں پکڑ پکڑ کر دامن میں بھرتے ہوئے اور کبھی کبھی شیر بھی دیکھتے ہوئے، ہرے بھرے کھیتوں میں دور تک پھیلے ہوئے دھوپ کے ساتوں رنگ آنکھوں میں بسائے قدرت کی گود میں صغرا مہدی کا بچپن قلانچے بھر رہا تھا۔

صغرا مہدی سب بہن بھائیوں میں زیادہ معمولی شکل و صورت کی تھیں۔ اوپر سے چیچک کے داغ بھی بسیرا کرکے بیٹھ گئے۔ دبلی پتلی کالی سوکھی اور چیچک کے داغ بھرے چہرے نے احساس کمتری میں مبتلا کردیا تھا۔ سونے پہ سہاگا گھر اور باہر کے لوگ چڑانے لگے تھے کہ تم اماں اور میاں کی بیٹی نہیں ہو بلکہ تمھیں کسی جمعدارنی سے گود لیا ہے۔ ایسے میں صغرا کے معصوم دل پر کیا گزرتی ہوگی؟ صغرا کے والد صغرا کی والدہ سے دس برس بڑے تھے اور انسپکٹر بھی تھے۔ ظاہر ہے مزاج میں سختی اور تناؤ بھی رہا ہوگا۔ حاکمانہ انداز ہوگا شاید اسی سبب میاں اور اماں کے درمیان ہمیشہ تناؤ کی صورت رہتی۔ صغرا نے ایسی صورت میں خود کو کمتر محسوس کر کے نظرانداز نہیں کیا بلکہ یہی وہ حالات تھے جب امامت فاطمہ کے اندر صغرا مہدی پروان چڑھ رہی تھی۔ ایسے میں صغرا مہدی اپنی ایک خیالی دنیا آباد کرلیتی تھیں جس میں وہ خوبصورت، ذہین، پڑھی لکھی اور سب کی چہیتی لڑکی بن جائیں۔ ایک آئیڈیل گھر ان کے ذہن میں تیار ہو جاتا اور اپنی پسند کے مطابق کردار، ساز و سامان، آرائش، زیبائش، لباس اور جو وہ چاہتیں تیار ہو جاتا... واہ صغرا مہدی... واہ۔ کیا اس سب سے ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ تخلیق کار صغرا مہدی پیدا ہوچکی تھیں۔ جس میں وہ کہانی کار بھی تھیں اور کردار بھی۔

یوں تو صغرا مہدی کی بڑی بہن سیدہ فرحت کو شاعری سے نہ صرف شغف تھا بلکہ وہ نظمیں اور غزلیں بھی کہتی تھیں اور گاتی بھی تھیں۔ چھوٹے بھائی اقبال مہدی بھی آگے چل کر افسانہ نگار بنے لیکن صغرا مہدی کی بات ہی الگ تھی۔ ان کا بچپن بھی انوکھا تھا جوانی بھی نرالی اور ضعیفی بھی منفرد و مختلف جو کبھی آئی ہی نہیں۔

صغرا مہدی کی تعلیم و تربیت اور ادب سے وابستگی اپنے ماموں جان (ڈاکٹر عابد حسین) اور ممانی صاحبہ

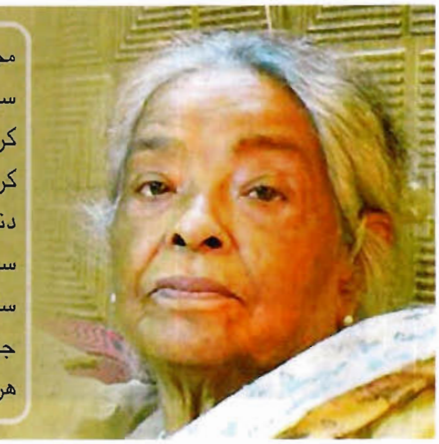

مجھے کھیلوں سے دلچسپی نہیں تھی، کھیل سے چپکے سے نکل کر گوشۂ تنہائی تلاش کرلی جہاں بیٹھ کر اکیلے خود سے باتیں کرتی۔ میری اپنی خیالی دنیا تھی، جو اس دنیا سے بالکل الگ تھی۔ اس میں بسنے والے سب لوگ وہی تھے جو حقیقی دنیامیں میرے ساتھ یا آس پاس تھے۔ مگر وہ ایسے تھے جیسا میں چاہتی تھی کہ ہوں۔ اس دنیا میں ہر وہ بات تھی جو مجھے پسند تھی۔

(صالحہ عابد حسین) کے زیر سایہ دہلی اور علی گڑھ میں ہوئی۔ یہاں کا کھلا ماحول انھیں نہ صرف راس آیا بلکہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے اجاگر ہونے میں بہت سازگار ثابت ہوا۔ وہ باقاعدہ افسانے لکھنے لگی تھیں۔ سب بہن بھائی پڑھ لکھ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ شادیاں ہو رہی تھیں۔ گھر آباد ہو رہے تھے لیکن صغرا مہدی نے یہاں بھی غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔ لکھتی ہیں:

''ممانی جان کو اور خاندان کے دوسرے لوگوں کو میری شادی کی بھی فکر تھی۔ میں نے اس سلسلے میں معمول کے خلاف اپنے خیالات ماموں جان سے شیئر کیے کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے لکھنے کا شوق ہے۔ میں نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور اپنا پہلا ناول 'پا بہ جولاں' لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ماموں جان نے میرے خیال کو رد نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ ''تنہا زندگی گزارنا مشکل ہے۔ اگر تم یہ چاہتی ہو تو پھر ابھی سے اس کی تیاری شروع کر دو، اپنے کو پراعتماد رکھو۔ اگر تم اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن رہیں تو میں کبھی تمھیں شادی پر مجبور نہیں کروں گا۔ مگر شادی کے دروازے بند نہ کرو۔'' (حکایتِ ہستی)

اپنے ماموں جان کے نصیحت آمیز یہ جملے صغرا مہدی کے لیے مشعلِ راہ بن گئے۔ انھوں نے خود کو پراعتماد بنایا خوش اور مطمئن رہنا اپنا شعار بنایا۔ زندگی اپنے ڈھنگ سے جینا سیکھی اور تنہا زندگی گزارنے جیسے مشکل مرحلے سے وہ بہ حسن و خوبی شادماں گزریں اور کیا پتہ انھوں نے کوئی خیالی شہزادہ بھی شوہر کے روپ میں بنا کر اپنی دنیا میں آباد کر رکھا ہو کیونکہ ان کی خیالی دنیا بہت پاور فل تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھیں زندگی میں دقتیں در پیش نہیں آئیں۔ آئیں، انھوں نے ان کا مقابلہ کیا۔ لکھتی ہیں:

''میں نے شروع سے ہی سوچ لیا تھا کہ سوسائٹی کے Norms سے ہٹ کر جو کام کیا جائے اس کی قیمت چکانی پڑتی ہے اس لیے اس سلسلے میں جو مشکلات پیش آئیں ان کا یہی سمجھ کر سامنا کیا۔'' (حکایتِ ہستی)

صغرا مہدی کے والد زیادہ تر ملازمت کے سلسلے میں اپنے دوروں پر رہتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت باہر ہی گزرتا۔ گھر اور بچوں سے ان کو کم ہی واسطہ رہتا۔ والدہ اکثر بیمار رہتی تھیں۔ ذہنی طور پر بھی پریشان رہتی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ ایک اچھی خاتونِ خانہ تھیں۔ کھانا اچھا پکاتی تھیں۔ بہت اچھی منتظم تھیں۔ بے حد دلچسپ گفتگو کرتی تھیں۔ شوخ تھیں۔ لوگوں کو ہنساتی تھیں۔ ملنسار تھیں۔ لوگوں کو تحفے تحائف دینے کا بھی شوق تھا مگر جب موڈ خراب ہوتا تو پھر ان کی ہر چیز سے دلچسپی ختم ہو جاتی اور گھر کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اپنی اماں کی یہ تمام خصوصیات صغرا مہدی میں موجود تھیں۔ ہاں ان کے اچھا کھانا پکانے پر ضرور شبہ کیا جا سکتا ہے۔ اس ناچیز کو ان کے یہاں بہت لذیذ کباب اور چپاتی ایک ادبی نشست میں کھانے کا اتفاق ہوا۔ گول اور پتلی چپاتیاں خوش ذائقہ مناسب مسالحہ والے کباب یقیناً صغرا مہدی نہیں پکا سکتی تھیں کیونکہ اتنی مناسبت تو ان کے اندر تھی ہی نہیں۔ اس میں یا تو ان کی بھابی شمع صاحبہ (اقبال مہدی کی بیوی) یا پھر کسی ملازمہ کا ہاتھ ضرور لگا ہوگا۔ ویسے اقبال مہدی نے ان کے کھانے پکانے اور گرہستی جمانے کے ذوق کو بڑے دلچسپ انداز میں قلم بند کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ایک زمانہ تھا کہ آپا کھانا پکانے کے نام پر صفر تھیں اور آج خدا کی شان کہ وہ طرح طرح کے کھانے پکاتی ہیں اور ستم یہ بھی ہے کہ لوگوں کی دعوتیں بھی کرتی ہیں۔ گھر بھی صاف ستھرا رکھنے کی خواہش کرتی ہیں اور اگر ضرورت ہو تو عیب کو چھپانے کے لیے پیوندکاری کے فن سے بھی واقف ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ آرٹ کا 'ٹچ' ہے۔ کھانا بنانے کے لیے کسی مغلانی بیگم کے دسترخوانی نسخے کی ضرورت نہیں۔ جیسی بے ساختہ خود ہیں اسی طرح خود ساختہ ڈشیں بناتی ہیں۔''

کیا صغرا مہدی کا یہ تعارف ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے کافی ہے؟ ہرگز نہیں... سیدھے سادے لفظوں میں اگر یہ کہا جائے کہ صغرا مہدی بہت ہی لڑاکو اور ہٹلر قسم کی خاتون مشہور تھیں تو آپ کو کیسا لگے گا؟ ایک پروفیسر اردو کی ادیبہ تہذیب یافتہ گھرانے کی چشم و چراغ اور اتنا بڑا الزام... ؟ لیکن یہ الزام نہیں آنکھوں دیکھی ہے۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں بس صرف ایک واقعہ تحریر کروں گی شاید یہ 1988 یا 89 کی بات ہے (1977 میں صغرا مہدی شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ ہو چکی تھیں) مجھے اپنے پی ایچ ڈی کے داخلے کے سلسلے میں کئی مرتبہ اردو ڈپارٹمنٹ جانا ہوا۔ محترم پروفیسر ذاکر صاحب اس وقت ہیڈ تھے۔ میں چاہتی تھی کہ محترمہ صغرا مہدی صاحبہ یا پروفیسر شمیم حنفی صاحب کے زیرِ نگرانی میرا کام پایۂ تکمیل کو پہنچے کہ ایک دن ڈپارٹمنٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہی کسی خاتون کی گرج دار کڑک دار آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی ذرا سا دروازہ کھولا چھ سات طلبہ و طالبات گردن جھکائے کھڑے تھے اور کوئی خاتون فل والیوم سے ان کی خبر لے رہی تھیں۔ چہرہ نظر نہیں آیا۔ میں پیچھے ہٹ گئی اتنے میں محترم عنوان چشتی اندر سے باہر آئے مجھے خوف زدہ دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے ''گھبرایئے نہیں صغرا مہدی صاحبہ ہیں۔'' میں چند منٹ باہر کھڑی ہو کر واپس آ گئی۔ میں نے اپنا مقالہ ان کی نگرانی میں مکمل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ کچھ تکنیکی مجبوریوں کے سبب پروفیسر شمیم حنفی بھی میرے گائیڈ نہیں بن سکے لہٰذا پروفیسر حنیف کیفی صاحب کی نگرانی میں میرا داخلہ ہوا۔ حالانکہ میری چھوٹی بہن مہر جمال صغرا مہدی صاحبہ کی ایم اے میں شاگرد رہ چکی ہے۔ وہ انھیں سخت گیر کہنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعریف بھی بہت کرتی ہے۔ ایسے ہی اکثر سیمیناروں اور مشاعروں میں صغرا مہدی صاحبہ کو زبردست طریقے سے ہوٹنگ کرتے ہوئے دیکھا۔ خود بھی کرتی تھیں اور دوسروں کو بھی اکساتی تھیں۔ میرے شوہر عظیم صدیقی کو ان کا ہوٹنگ کرنا بہت پسند آتا تھا۔ اس لیے وہ ان کے آس پاس ہی بیٹھنے کی کوشش کرتے اور اس منظر کا پورا لطف لیتے۔ لیکن جب صغرا مہدی سے قربتیں بڑھیں تو اندازہ ہوا وہ بڑی منفرد مزاج کی خاتون ہیں ان کے اندر ہمہ وقت ایک شوخ چنچل بچہ موجود رہتا ہے ایک مست بنداس لڑکی بھی جو ہنستی اور قہقہے لگاتی رہتی ہے اور اپنا حکم منواتی ایک ہٹلر دیدی بھی، جو موقع پڑنے پر مقابلہ کرتی جھانسی کی رانی بھی بن جاتی ہے۔ میرے

لیے صغرا مہدی کو سمجھنے کے لیے ان کی تحریروں اور کارناموں کے علاوہ اوکھلا میں یعنی جامعہ نگر میں منعقد ہونے والی محفلوں کا بڑا ہاتھ ہے۔

اوکھلا کا علاقہ ویسے بھی ادیبوں کے لیے بہت سازگار علاقہ ہے۔ ایک دوسرے کے یہاں شادیوں میں ادبی نشستوں میں خوشی اور غم میں ملاقات ہونا لازم ہے لہٰذا کسی سے ایک دوسرے کی حقیقت چھپی نہیں رہتی بلکہ نزدیکیاں بڑھتی ہیں۔ بے تکلفی بڑھتی ہے، روابط بڑھتے ہیں تو ایک فیملی جیسا ماحول خود بہ خود پیدا ہوجاتا ہے جو ایک دوسرے کو سمجھنے میں بڑا معاون ہوتا ہے۔

اقبال مہدی نے ایک خاکہ نما مضمون 'آپا! ہٹیے ان کو کون نہیں جانتا!'' میں کچھ ایسی سچی کھری کھری بے لاگ باتیں تحریر کردیں کہ مجھے کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ اس لیے میں خود کو بچاتے ہوئے اپنے دل کی آواز کو ان کی تحریر کے ذریعے عام کرنا چاہوں گی۔

- ''بہت سے حرفوں کو ملا کر نام بنا ہے پروفیسر صغریٰ مہدی: لہٰذا بڑے بڑے حرفوں کا عطر مجموعہ ہیں محترمہ!''

- ''ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ہماری اماں ان کو 'ہٹلر' کہہ کر پکارتی تھیں۔ اماں نے بات تو بڑی سچی کہی تھی۔ غریب ہٹلر تو ختم ہوگیا مگر اپنا جانشین چھوڑ گیا اور ان کی شانِ ہٹلری وہی ہے۔''

- ''دراصل آپا کی پارہ صفت طبیعت اور مزاج کا اتار چڑھاؤ ان کی خداداد ذہانت ہے جس کو انھوں نے اپنی محنت اور لگن سے سنوارا ہے اور اس سنوار اور نکھار میں ایسی جلوہ نمائی ہے کہ اپنے مقابل پر وار اس طرح کرتی ہیں کہ مداحوں کی نوکِ زبان پر بے ساختہ آجاتا ہے: ''لڑتی ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں'' تلخ کلامی بری بات ہے۔ خدا بچائے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سب باتوں کے باوجود کیسے لوگ ان کے مداح ہیں؟ کیا آج کل کے لوگ اتنے ڈھیٹ ہوگئے ہیں؟''

- ''یہ آپا صاحبہ کس قدر ہڑدنگی ہیں اور ہمیشہ سے ہیں۔ انھوں نے کیا کیا نہ ادھم جوتے ہیں۔ باجی کہتی تھیں۔ ''اتنی بڑی ہوگئی ہے صغریٰ خدا کے واسطے سنجیدہ بنو۔ یہ کیا اپنی گت مت کھوئی ہے چھوٹے بھائی بہنوں میں۔''

- ''بچپن ہی میں کیا زندگی کے ہر دور میں ان کی مزاجی افتاد یہی رہی ہے کبھی شعلہ کبھی شبنم—— یعنی ہنسنا، قہقہے لگانا، چیخنا چلانا، اور کبھی ناقابل یقین حد تک سنجیدہ ہوجانا۔''

- ''آپ کا تاریخی نام امامت فاطمہ ہے۔ لیکن کسے پتہ تھا کہ امامت فاطمہ قیامت صغریٰ بن کر لوگوں پہ ستم ڈھائیں گی۔ مگر ہاں اپنے تاریخی نام امامت فاطمہ کی نسبت سے ملک کے ملاؤں، مفتیوں، اور اماموں سے بھڑتی رہتی ہیں جو بات بات پر فتوے جاری کرتے رہتے ہیں۔''

یہ تھیں ہماری صغرا مہدی صاحبہ۔ واحد ایسی خاتون جو تنہا ہوتے ہوئے بھی مکمل انجمن تھیں۔ ہمیشہ بھیڑ میں گھری ہوتیں۔ محبتیں لٹاتیں، ڈانٹ پھٹکار سناتیں، گلے سے لگاتیں، دعوتیں کرتیں، نصیحتیں کرتیں، دوستی کا دم بھرتیں اور سب کے دل میں گھر کرلیتیں۔ ہر چھوٹے بڑے سے ملنا اس کا دل رکھنا انھیں خوب آتا تھا۔ میرے غریب خانہ پر بھی ادبی نشست میں شرکت کرکے رونق اور عزت بخشی۔ انھیں ملال تھا کہ وہ عظیم صدیقی کے گزر جانے پر میرے غم میں شریک ہونے کے لیے نہیں آسکیں کیونکہ اس وقت میں تھرڈ فلور پر رہ رہی تھی۔ بہت

> **صغرا آپا کی شوخیاں اور شرارتیں جامعہ بھر میں مشہور ھیں۔ صغرا آپا اور عذرا باجی کی جوڑی کو خدا سلامت رکھے، ایک زمانے میں قیامت برپا کررکھی تھی۔ کون تھا جو ان کی زد سے بچا ھو۔ آج بھی یہ دونوں مل جائیں تو شریر بچے کے کان کاٹتی ھیں، مشاعروں میں یہ دونوں پیچھے بیٹھ کر وہ ھوٹنگ کرتی ھیں کہ اللہ میاں بھی شاعروں کا ساتھ چھوڑ دیتا ھے۔ مرنے کے بعد تو شاعروں کو دوزخ میں جانا ھی ھے، مشاعروں میں یہ دونوں ان کی زندگی بھی دوزخ بنا دیتی ھیں۔**

معذرت خواہ تھیں، مجھے ان کی صحبتوں پر فخر ہے۔ تعریف وتنقید اور انعام واکرام سے بے نیاز رہنے والی صغرا مہدی ہمیشہ خاموشی سے اپنے تخلیقی کاموں میں منہمک رہیں۔ اردو اکادمی دہلی نے ان کی کاوشوں پر فکشن ایوارڈ سے نوازا لیکن حقیقت میں وہ بڑے ایوارڈ کی حقدار تھیں۔ ان کے افسانے اور ناول ہمارے سماج کی بنتی بگڑتی تصویروں کا عکس ہیں جس میں عورت کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ مزاج کی طرح ان کی فکری بصیرت بھی منفرد تھی۔ صرف تحریر ہی نہیں انھوں نے حقوق نسواں اور تعلیم نسواں کے لیے آواز بھی بلند کی۔ یک طرفہ فتویٰ دینے والے فیصلوں پر اعتراض بھی کیا۔

قرۃ العین حیدر اور صغرا مہدی کے نزدیکی مراسم تھے جب کہ دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ عینی آپا خود پسند اور تنہائی پسند تو صغرا مہدی بالکل پلٹ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صغرا مہدی نہ صرف تہذیبی قدروں سے جڑی تھیں بلکہ نبھانا بھی خوب جانتی تھیں۔

سہیلیوں کے گروپ میں تاباں صاحب کی بیٹی عذرا باجی کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ پکی سہیلیاں! پروفیسر خالد محمود لکھتے ہیں:

''صغرا آپا کی شوخیاں اور شرارتیں جامعہ بھر میں مشہور ہیں۔ صغرا آپا اور عذرا باجی کی جوڑی کو خدا سلامت رکھے، ایک زمانے میں قیامت برپا کررکھی تھی۔ کون تھا جو ان کی زد سے بچا ہو۔ آج بھی یہ دونوں مل جائیں تو شریر سے شریر بچے کے کان کاٹتی ہیں، مشاعروں میں یہ دونوں پیچھے بیٹھ کر وہ ہوٹنگ کرتی ہیں کہ اللہ میاں بھی شاعروں کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ مرنے کے بعد تو شاعروں کو دوزخ میں جانا ہی ہے، مشاعروں میں یہ دونوں ان کی زندگی بھی دوزخ بنا دیتی ہیں۔''

آہ... اب دونوں کی جوڑی...؟ جب آنگن میں صغرا مہدی سفید لباس میں منہ ڈھانپے خاموش ابدی نیند سوئی تھیں اور عذرا باجی زار وقطار رو رہی تھیں تو کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ لگتا تھا صغرا مہدی ابھی ابھی منہ سے چادر ہٹائیں گی اور بولیں گی: اے ہے عذرا بس اب چپ بھی کرو—— کیوں نیند خراب کرتی ہو، تمھیں خدا سمجھے۔

صغرا مہدی کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو مختلف احساس ذہن کے پردے پر نمایاں ہوتے ہیں۔ کبھی لگتا ہے ان کی زندگی کسی طویل داستان کا ایک حصہ تھی اور وہ اس کی اہم کردار، اپنا رول بہ حسن وخوبی ادا کرکے وہ دور آسمانوں میں کہیں گم ہوگئیں۔ کبھی محسوس ہوتا ہے وہ اللہ میاں کے یہاں بھی بھیڑ لگا کر حقوق نسواں کو لے کر عورتوں کی برابری کے لیے جھگڑ رہی ہیں اور اللہ تعالیٰ پر مردوں کے تئیں پارشیالٹی کا الزام عائد کررہی ہیں۔ امید ہے اللہ تعالیٰ وہاں بھی ان کی نگہبانی کریں گے۔ وہ اپنی بے شمار یادوں باتوں قہقہوں اور تحریروں کے ذریعے ہمیشہ ہمارے درمیان رہیں گی۔ ادبی دنیا میں ویسے بھی دور دور تک—— اب کوئی صغرا نہیں۔

حوالہ جات:

(1) حکایتِ ہستی: پروفیسر صغرا مہدی
(2) شگفتگی دل کی: پروفیسر خالد محمود
(3) یہ کس مقام پہ تنہائی سونپتے ہو مجھے: اقبال مہدی

■

Nigar Azim, H-3, Batla House, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

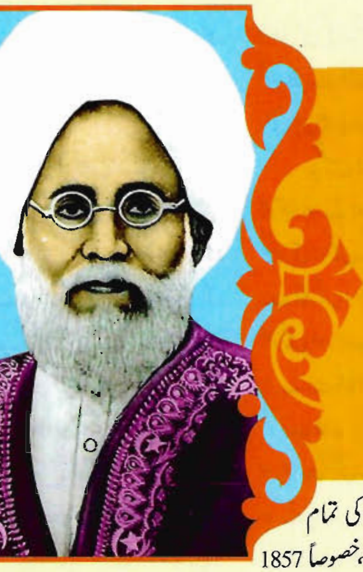

تابش مہدی

علامہ شبلی نعمانی

شمس العلما علامہ شبلی نعمانی اُنیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی عیسوی کے اوائل کے ایک ایسے رجلِ عظیم ہیں، جنھیں کئی اعتبار سے اہمیت و برگزیدگی حاصل ہے۔ ان کے جس پہلو کو بھی سامنے رکھ کر اُن کی تعیین قدر کی جائے، وہ منفرد و نمایاں نظر آتے ہیں۔

1857 کے کرب انگیز اور جاں گسل سانحے کے بعد ملتِ اسلامیہ برصغیر کو ذہنی و فکری غم و اندوہ اور غیر معمولی اذیت و اضطراب سے نکالنے کے لیے سرسید احمد خاں مرحوم کے جن مخلص و اولوالعزم رفقا نے بڑھ چڑھ کر علمی و فکری سطح پر اُس میں حصہ لیا اور پوری یک سوئی و ہوش مندی کے ساتھ اپنی ادبی، فکری اور قلمی جولانیاں دکھائیں، ایک بڑے طبقے کو متاثر کیا اور ان کے اندر دردمندی و حوصلہ مندی پیدا کی شبلی نعمانی اُن میں سب سے زیادہ ممتاز و نمایاں ہیں۔

شبلی نعمانی گرچہ اردو و فارسی دونوں زبانوں میں لکھتے تھے، دونوں زبانوں کی نظم و نثر پر انھیں دست رس حاصل تھی اور دونوں ہی زبانوں کے علما و ناقدین نے ان کی دونوں زبانوں کی ادبیات و شعریات پر گہری نگاہ کا اعتراف کیا ہے اور دونوں ہی زبانوں کے متعدد سخن وروں نے ان کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا ہے، علامہ سید غلام رسول قوس حمزہ پوری، مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی، مولانا حمید الدین فراہی اور علامہ اقبال سہیل جیسے نام وران سخن اُن کے تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں، لیکن اُن کی نثر و نظم اور نقد و تحقیق کا وہ سرمایہ اردو ہی میں ہے، جس کی وجہ سے اردو شعر و ادب میں انھیں اعتبار حاصل ہے۔ وہ اردو ادب کے عناصرِ اربعہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اس خصوص میں وہ بالکل غالب کے ہم پلہ ہیں۔

قوم و ملت کی تباہی و بربادی پر گریہ وزاری اور ان کے مسائل و قضایا سے قلبی ہم دردی و سوز مندی گرچہ شبلی نعمانی کی تمام تحریروں میں ملتی ہے اور ان کی تمام سرگرمیاں اسی درد و سوز کے گرد گھومتی ہیں، خصوصاً 1857 کے بعد کے حالات و واقعات کے پس منظر میں جب ہم ان کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اسلام کی گراں قدر شخصیات و رجال اور بعض اہم تاریخی واقعات و حقائق کو موضوع بنا کر امت مسلمہ کی جو ملی و مذہبی بازیافت کی ہے اور اس کے اندر شعور و فکر کی بیداری کی جو سوچی سمجھی کوشش کی ہے، وہ ہماری آج کی نسل کے لیے ایک نشانِ راہ بلکہ منارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن شبلی کے قومی و ملی جذبات اور مذہب و ملت سے ان کی گہری قلبی وابستگی کا صحیح اور بے آمیز اندازہ ان کی شاعری سے ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری کا غالب حصہ تاریخ و واقعہ نگاری پر مشتمل ہے۔ اُن کے عہد میں جو سماجی، معاشرتی، سیاسی یا عالمی مسائل وجود میں آئے، اُنھوں نے انھیں اپنی شاعری کے ذریعے سے پیش کیا ہے اور ملت کو اُن سے باخبر کر کے، اُسے عملی اقدام کے لیے اکسایا ہے۔

شبلی نعمانی نے گرچہ اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ وہ شاعر نہیں ہیں، اُنھوں نے اِس سلسلے میں کسی سے اصلاح نہیں لی ہے، بس اپنی طبعِ موزوں کو کام میں لا کر کبھی کبھی اُنھوں نے اشعار موزوں کر لیے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں یہ ان کا انکسار تھا۔ جہاں وہ بہت سی باتوں میں عام شعرا سے الگ اور منفرد مزاج رکھتے ہیں، وہیں اِس ذیل میں بھی وہ سب سے مختلف تھے۔ علامہ نثار احمد فاروقی کے لفظوں میں شعرا عام طور سے اپنے آپ کو باون گز سے کم نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک اُن سے بڑا کوئی شاعر نہیں ہوتا۔ جب کہ شبلی نعمانی ایک بڑا اور عظیم شاعر ہونے کے باوجود خود کو کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ ایک عظیم شاعر بھی تھے اور اُنھوں نے اساتذۂ فن سے اصلاح بھی لی ہے۔ اس کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔ البتہ یہ اصلاح انھوں نے متواتر یا مسلسل کسی سکہ بند استاذ سے نہیں لی۔ بلکہ اُن کے درسی اساتذہ میں جو اِس فن کا ادراک رکھتے تھے اور وہ خود بھی سخن ور تھے اُن کو ہی انھوں نے اپنا رہنما بنایا اور وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی حیلے سے ان سے اصلاح ملتی رہی۔ یہ بات تو سچ ہے کہ شاعری کے لیے اصلاح اور کسی استاذ کی رہنمائی ضروری ہے۔ ابتدائی اصلاح کے بغیر کوئی شاعر ہو ہی نہیں سکتا۔ خواہ وہ اصلاح کی نوعیت کچھ بھی رہی ہو۔ لیکن بعض وہ مبتدی سخن ور، جو موزوں طبع اور ذہین و فہیم ہوتے ہیں اور ان کا مطالعہ بھی وسیع ہوتا ہے، وہ استاذ کی معمولی توجہ سے فارغ الاصلاح ہو جاتے ہیں۔ یہی صورتِ حال شبلی کی بھی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ اب تک اِس بات سے کسی کو انکار نہیں ہوا کہ شبلی ایک سچے، اچھے اور حقیقی شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے سے اپنے عہد کی تحریکوں، سیاسی سرگرمیوں اور بعض قومی و ملی مسائل و قضایا کو جس طرح اور جس فنی و ادبی چابک دستی کے ساتھ اپنی سخن وری کا موضوع بنایا ہے، وہی صحیح معنوں میں سچی اور حقیقی شاعری ہے۔ ان کی شعری و ادبی حیثیت اور اس کی تاریخی اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں۔

شبلی نعمانی کی شاعری اور اُن کی شاعری کی وساطت سے اُن کی قومی و ملی دردمندی اور اس سلسلے کی اُن کی گہری فکر مندی کو سمجھنے کے لیے اُن کی اُن نظموں کا مطالعہ کرنا زیادہ مناسب ہوگا، جو کلیاتِ شبلی میں مثنویات اور مسدسات کی شکل میں ہیں۔ قطعات بھی ممد ہو سکتے ہیں۔ 'ہم کشتگانِ معرکۂ کان پور ہیں' ان کی معرکہ آرا نظموں میں ہے۔ یہ نظم 1912 میں سانحۂ مسجد کان پور کے بالکل متصلاً بعد لکھی گئی تھی۔ اس کے ڈیڑھ سال بعد وہ اِس دنیا سے

رخصت ہوگئے تھے۔ یہ نظم غزل کے فارم میں ہے اور صرف نو (9) اشعار پر مشتمل ہے۔ اِس کا ایک ایک شعر بلکہ ایک ایک مصرع شبلی نعمانی کے قومی وملی سوز و دردمندی اور مذہبی غیرت وحمیت کی شہادت پیش کرتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ شہر کان پور کے محلے مچھلی بازار میں سرراہ ایک مسجد واقع تھی۔ انگریز شرارت پسندوں کے ایما سے وہاں سے ایک سڑک نکالی گئی، جس میں مسجد کا وضوخانہ بھی زد میں آ گیا۔ اس واقعے سے مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہوگئی۔ انھوں نے ایک بڑا جلسہ منعقد کیا۔ جلسے کے بعد جوانوں، بوڑھوں اور بچوں نے مل کر مسجد کی منہدم دیوار پر چن چن کر اینٹیں رکھنی شروع کردیں۔ یہ بات حکام کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ انھوں نے بڑی بے رحمی کے ساتھ غیر مسلح شرکا پر حملے کا حکم دے دیا۔ فوجی پولیس نے ان پر گولیاں چلانی شروع کردیں۔ بڑی تعداد میں بوڑھے، بچے اور نوجوان شہید ہوئے۔ اس کے نتیجے میں پورا ملک بے چین اور مضطرب ہوگیا۔ شعرا اور اربابِ قلم بھی بیدار ہوگئے۔ علامہ شبلی نعمانی پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ انھوں نے بڑے درد و سوز کے ساتھ یہ اشعار کہے:

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جاکے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خرد سال ہیں، جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آ گئی ہے منتظرِ نفخِ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں، بے خبر نشۂ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں
سینے پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار
از بس کہ مستِ بادہ و نازو غرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر
لذت شناس ذوقِ دلِ ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دل دادۂ فنا
جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرقِ نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکۂ کان پور ہیں

اس کے بعد شبلی نے فارسی کے سات اشعار میں بھی مسجد کو خطاب کیا ہے اور اس کے درد انگیز واقعے کو دہرا کر اس کے ساتھ اپنی ہمدردی و دردمندی کا اظہار کیا ہے۔

'کلیاتِ شبلی' میں جب ہم شبلی نعمانی کی نظمیہ شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں اور اُس عہد کو سامنے رکھ کر اُن کے بارے میں کسی رائے تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، تو یہ بات ہم پر پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ شبلی نعمانی کی شاعری میں قومی سطح پر یہاں کی دوقوموں کے درمیان اتحاد و اتفاق کی علم برداری بھی ملتی ہے اور اس سے آگے بڑھ کر بین الاقوامی سطح پر ملتِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی آرزومندی بھی:

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو!
یہ ظلم آرائیاں تاکے، یہ حشر انگیزیاں کب تک
کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک
سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤ گے ہمارا اِس طرح نام و نشاں کب تک
زوالِ دولتِ عثماں، زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو! فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

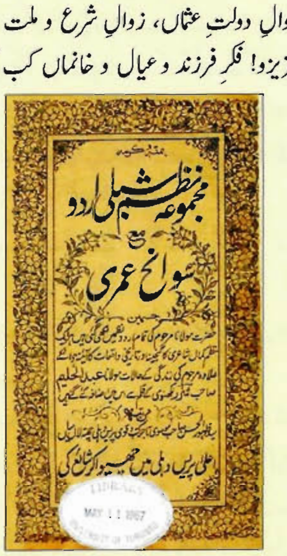

یہ اشعار شبلی نعمانی کی نظم 'شہر آشوب اسلام' کے ہیں۔ جو انھوں نے 1912 کے قریبی زمانے میں لکھی تھی۔ مشہور شبلی پسند مفکر و عالم اقبالیات مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اپنی کتاب 'ہندستانی مسلمان' میں لکھا ہے:

''مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور اُن میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کے سلسلے میں مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے حصے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جنھوں نے الہلال کی نظموں اور مسلم گزٹ کے مضامین کے ذریعے برطانیہ کی وفاداری کی پالیسی اور مسلمانوں کی کم زور سیاست پر سخت تنقید کی اور تعلیم یافتہ طبقے کے ذہن کو متاثر کیا۔''

شبلی نعمانی اتحادِ انسانیت کے داعی تھے۔ وہ انسانوں کو باہمی مساوات اور برابری کا درس دیتے تھے۔ انسانوں کو شرفا اور ارذل کے خانوں میں تقسیم کرنے کے وہ سخت مخالف تھے۔ اسلامی اصولِ مساوات کے ایک معلم کی حیثیت سے انھوں نے جاگیر دارانہ طرزِ فکر کو اسلامی روایات وتعلیمات کے منافی قرار دیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مغرب کے اصل چہرے کو بے نقاب کرنے کے لیے یہاں کے کہتر و مہتر میں سیاسی شعور کی بے داری ناگزیر ہے۔

میں بعض اُن ناقدین سے قطعی اتفاق نہیں کرتا، جو شبلی نعمانی کی قومی وملی شاعری کو محض شاعری خیال کرتے ہیں اور بہ زعم خویش یہ فتویٰ صادر کردیتے ہیں کہ شبلی نے صرف الفاظ کا خرمن جمع کیا ہے اور ان میں شاعری کی وہ خصوصیات نہیں ہیں، جو کسی زبان کی اچھی اور بڑی شاعری کے لیے ناگزیر ہیں۔ میں ایسے ناقدوں کو شاعری کے نئے رجحانات سے نابلد سمجھتا ہوں۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ ایسے ناقدین نے نہ حالی کو پڑھا ہے نہ اقبال کو اور نہ شاعری کے آغاز و ارتقا سے انھیں کوئی باخبری ہے۔

1857 کے بعد ملتِ اسلامیہ ہند جن حالات سے دوچار ہوئی، اُن کے پیش نظر اس کے اندر قومی وملی اعتماد کو بحال کرکے حوصلہ وخود کفیلی کا جذبہ پروان چڑھانے کے لیے ایسے ہی تخلیقی عمل کی ضرورت تھی، جسے شبلی نعمانی نے پوری قوت وتوانائی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اس عہد کے جن شاعروں اور سخن وروں نے اس رویے کو ناقابل اعتنا سمجھا، آج ان کا کوئی نام لیوا بھی نہیں ہے۔ جب کہ حالی، اکبر، اقبال، شبلی اور ان کے ہی زمانے میں دنیائے شاعری میں قدم رکھ کر ان کے چراغ سے چراغ جلانے والے شعرا شفیق جون پوری، نشور واحدی، روش صدیقی، شہباز امروہوی اور نازش پرتاب گڑھی آج اس لیے زندہ ہیں کہ انھوں نے قوم وملت کے درد کو سمجھا ہے اور ان کے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

شبلی نعمانی کی اردو شاعری میں تحریک سرسید احمد کے دور رس اثرات بھی محسوس کیے جاسکتے ہیں اور مسلم لیگ وتحریک احرار کے جذباتی وفور بھی اور اس میں اسلامی قصص اور اسلامی تاریخ کے اہم واقعات کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ شبلی نے ملتِ اسلامیہ خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے اور انھیں ان کی حقیقی تصویر سے آشنا کرنے کے لیے اپنی شاعری کو استعمال کیا۔ شبلی نعمانی نے اپنی شاعری سے وہی کام لیا ہے، جو خواجہ الطاف حسین حالی، اکبر الہٰ آبادی اور علامہ اقبال نے لیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ان کے ہاں اپنے ان ہم عصروں سے بڑی حد تک مماثلتیں نظر آتی ہیں۔ بل کہ میری حقیر رائے میں بعض پہلوؤں سے شبلی کہیں کہیں آگے نظر آتے ہیں۔ اس ذیل میں آل احمد سرور کا یہ قول آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ شبلی نہ ہوتے تو محمد علی اور اقبال نہ ہوتے۔''

■

Dr. Tabish Mehdj G5/A - Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi - 110025 (INDIA)

مولانا شبلی نعمانی

بھاشا زبان اور مسلمان

عام طور پر مشہور ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے بھاکھا زبان میں شعر و شاعری کی وہ امیر خسرو ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے کا پتا آگے تک چلتا ہے، مسعود سعد سلمان جو سلطنتِ غزنویہ کا مشہور شاعر گزرا ہے اور جو امیر خسرو سے تقریباً دو سو برس پہلے تھا، اس کی نسبت تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں، کہ ہندی زبان میں بھی اس نے ایک دیوان لکھا تھا، تذکرۂ مجمع الفصحا میں لکھا ہے:

''الحاصل دی را سہ دیوان بود تازی، ہندی، و پارسی۔''

اس واقعے سے صرف والہ داغستانی نے اس بنا پر انکار کیا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے ملک کی زبان میں اس قدر کمال پیدا نہیں کرسکتا کہ اس میں شاعری کرسکے، لیکن مولوی غلام علی آزاد نے اس شبہے کو اس طرح رفع کردیا کہ مسعود سعد سلمان گو خاندان کے لحاظ سے ایرانی تھا، لیکن پیدا لاہور میں ہوا تھا، اس لیے ایک ہندوستان زا کا ہندی میں اس درجے کا کمال پیدا کرنا کچھ بعید نہیں۔

حضرت امیر خسرو نے سنسکرت اور بھاکھا میں جو کمال پیدا کیا وہ محتاجِ اظہار نہیں۔

مثنوی نہ سپہر میں انھوں نے خود اپنی سنسکرت دانی کا ذکر کیا ہے، افسوس ہے کہ ان کے بھاکھا کے خالص اشعار آج ناپید ہیں، عام زبانوں پر صرف وہ اشعار ہیں، جن میں انھوں نے فارسی اور بھاکھا کو پیوند دیا ہے، مثلاً:

چوں شمع سوزان، چوذرہ حیران ز مہرِ آن مہ بگشتم آخر
نہ نیند نینان نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
آنکھ بدن آرام خط

اس طرز کے ان کے اشعار عام طور پر مشہور ہیں اس لیے ہم اُن کو قلم انداز کرتے ہیں۔ ایسے بڑے زبردست شاعر تھے، کہ خود ہندوؤں میں آج تک کوئی ان کا ہمسر نہیں پیدا ہوا۔ پدماوت اُن کی مثنوی آج موجود ہے اور گھر گھر پھیلی ہوئی ہے، ہندوؤں میں سب سے بڑا شاعر آخر زمانے کا کالیداس گزرا ہے، جس نے رامائن کا بھاکھا میں ترجمہ کیا ہے، نکتہ شناسوں کا بیان ہے، کہ قدرتِ زبان کے لحاظ سے پدماوت کسی طرح رامائن سے کم نہیں اور اس قدر تو ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ پدماوت کے صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جاؤ، عربی فارسی کے الفاظ مطلق نہیں آتے، اور یوں شاذ و نادر تو رامائن بھی ایسے الفاظ سے خالی نہیں، ملاحظہ ہو:

رامائن کے بعض اشعار:

رام انیک گریب نواجے لوگ برِبر برو براجے
غریب نواز
گنی، گریب، گرام، نرناگر پنڈت موٹے ملیں اوجاگر
غنی غریب

ملک محمد جائسی نے پدماوت کے سوا بھاکھا میں اور بھی دو مثنویاں لکھیں، جو ان کے خاندان میں اب بھی موجود ہیں، لیکن افسوس کہ اُن کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

اکبر کے زمانے میں ہندی زبان کو اور بھی قبولِ عام حاصل ہوا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ امرا اور شہزادے تک ہندی زبان میں شاعری کرتے تھے۔ شہزادہ دانیال (پسرِ اکبر شاہ) کے ضمنی تذکرے میں جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے:

''بہ نغمۂ ہندی مائل بود، گاہے بہ زبانِ اہلِ ہندو باصطلاحِ ایشان شعرائے می گفت، بدنبودے۔''

عبدالرحیم خانِ خاناں جو دربارِ اکبری کا گلِ سرسبد تھا ہندی شاعری میں کمال کا درجہ رکھتا تھا، اسی کتاب میں خانِ خاناں کی وفات کے ذکر میں لکھا ہے:

''خانِ خاناں در قابلیت و استعداد یکتائے روزگار بود و زبانِ عربی و ترکی و فارسی و ہندی می دانست و از اقسامِ دانشِ عقلی و نقلی حتی علومِ ہندی بہرۂ وافی داشت و بزبانِ فارسی و ہندی شعر نکو گفتے۔''

جہانگیر کے زمانے میں غواصی نام کا ایک شاعر تھا اس نے طوطی نامہ کو جو نثر میں تھا، اس طرح نظم کیا، کہ ایک مصرع فارسی اور ایک ہندی میں تھا، اس سے اُس کی قدرتِ زبان کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ میر حسن صاحب اپنے تذکرۂ شعرا میں لکھتے ہیں:

''غواصی تخلص در وقتِ جہانگیر بادشاہ بود، طوطی نامہ بخشی را نظم نمودہ است بزبانِ قدیم نصفے فارسی و نصفے ہندی بطور بکٹ کہانی، سرسری دیدہ بودم شعر آن نظم بہ یادنیست۔''

اسی زمانے میں ملا نوری ایک بزرگ تھے، قصبۂ اعظم پور کے قاضی زادوں میں تھے، اور فیضی سے نہایت اتحاد رکھتے تھے، وہ اگرچہ فارسی کہتے تھے، لیکن کبھی کبھی ہندی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے، ریختہ یعنی اردو زبان کی ترکیبیں بھی ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں چنانچہ میر حسن صاحب نے اپنے تذکرے میں ان کا ایک شعر نقل کیا ہے:

ہر کس کہ خیانت کند البتہ نبرسد
بیچارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

اکبری اور جہانگیری دور میں سب سے زیادہ جس نے اس فن میں نام پیدا کیا، وہ شیخ شاہ محمد بن شیخ معروف فربلی تھے۔ یہ بلگرام کے رہنے والے تھے، اور حصار کی حکومت پر ممتاز تھے، ایک دفعہ سفر میں ایک ہندو لڑکی کی حاضر جوابی ان کو بہت پسند آئی، اس کو ساتھ لائے اور تربیت کی، چناں چہ اُن کے اکثر دوہے اور گیت اُسی کے ساتھ سوال و جواب میں ہیں۔

ایک دفعہ سفر سے آئے، اُس نے ان کو مدت کے بعد دیکھا تو جوشِ محبت سے اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ انھوں نے کہا:

کم ورگ دھری سنار مم آیو بھا یو نہیں
کیوں تیری آنکھ آبدیدہ ہوئی اے نازنین، کیا میرا آنا پسند نہیں ہوا؟ اُس نے برجستہ کہا:

لینھن نین پکھار لمن ہستی تو کو درس بن
آنکھ صاف کرنا گردآلود تیرے دیدار کے بغیر
یعنی چونکہ میری آنکھیں تمھاری جدائی میں گردآلود ہو رہی تھیں، اس لیے میں نے ان کو آنسوؤں سے دھولیا۔

شیخ محمد کے اشعار نہایت کثرت سے سروِ آزاد کے دوسرے حصے میں نقل کیے ہیں۔

تیموری سلاطین بھاشا زبان کی شاعری کی اسی طرح قدردانی کرتے تھے، جس طرح وہ اپنی شاہی زبان (فارسی) کے قدردان تھے، اور یہ اس بات کا بڑا سبب تھا کہ ہندی شاعری بھی روز بروز ترقی کرتی جاتی تھی۔ راجہ سورج سنگھ نے جب ایک ہندو شاعر کو جہانگیر کے دربار میں پیش کیا، اور اس نے ایک اچھوتے مضمون کی نظم پڑھی تو جہانگیر نے ایک ہاتھی انعام میں دیا، چنانچہ خود تزک میں لکھتا ہے:

''باین تازگی مضمونے از شعرائے ہندکم بگوش رسیدہ بہ جلدوے این مدح فیلے بہ او مرحمت کردم۔''

جہانگیر کے حکم سے ان اشعار کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا گیا:

گر پسر داشتے جہان افروز
شب نہ گشتے ہمیشہ بودے روز
زان کہ چون او نہفت افسرِ زر
بہ نمودے کلاہ گوشہ پسر
شکر کز بعد او چنان پدرے
جانشین گشت این چنین پسرے
کہ ز شنقار گشتن آن شاہ
کس بہ ماتم نہ کرد جامہ سیاہ

اِن اشعار کا حاصل یہ ہے کہ اگر آفتاب کے کوئی بیٹا ہوتا تو کبھی رات نہ ہوتی کیوں کہ جب آفتاب چھپ جاتا، تو اُس کا بیٹا، اُس کے بجائے عالم افروزی کرتا، خدا کا شکر ہے کہ آپ کے والد (اکبر شاہ) کو خدا نے ایسا بیٹا دیا کہ لوگوں نے اُن کے انتقال کا غم نہ کیا۔

ہندی تصنیفات کے ساتھ مسلمانوں کی توجہ کی یہ نوبت پہنچی، کہ لوگ ہندی کی مشہور کتابوں کو زبانی یاد کرتے تھے۔ امین رازی تذکرہ ہفت اقلیم میں میر ہاشم محترم کے حال میں لکھتے ہیں:

''امروز در ہندست، تمام کتاب مہابھارت را کہ مستجمع اسامی غریبہ و حکایات عجیب است در ذکر دارد۔''

اس مسئلے میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ عالمگیر کو نہایت متعصب کہا جاتا ہے، اور عام خیال ہے کہ وہ ہندوؤں کے علوم اور زبان سے نہایت نفرت رکھتا تھا، لیکن مسلمانوں نے بھاشا زبان پر جس قدر اس کے زمانے میں توجہ کی پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ ضمیر ایران کا ایک مشہور شاعر تھا، وہ عالمگیر کے زمانے میں ایران سے آیا اور شاہی منصب داروں میں مقرر ہوا، اس نے بھاشا زبان میں، انتہا درجے کا کمال پیدا کیا، اگرچہ بھاشا و سنسکرت کے الفاظ کا وہ صحیح تلفظ نہیں کرسکتا تھا، تاہم اس زبان میں نہایت برجستہ اشعار کہتا تھا۔ ہندی میں اس کا تخلص پتھی تھا۔ یارجا تک جو موسیقی میں ہندی زبان کی مشہور کتاب ہے۔ اس کا ترجمہ اُسی نے فارسی زبان میں کیا۔ مولوی غلام علی آزاد بلگرامی یدِ بیضا میں اس کے حالات کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''درعہدِ عالمگیر بادشاہ از ولایت ایران بہ ہند آمدہ و در سلکِ منصبداران شاہی انتظام داشت و باوجود آں کہ بہ ہند آمدہ زبانِ ایں ولایت آموخت اما بواسطۂ حدت ذہن در نظم ہندی طبع او آن قدر دخیل شد کہ از جملہ استادانِ فن برآمد زبانش بہ تلفظِ ایں زبان خوب نمی گردید، اما نظم

بسیار پختہ واقع می شد و در ہندی پتھی تخلص میکرد۔ ترجمہ یار جاتک در فنِ رقص و نغماتِ ہندی از وست۔''

عالمگیر ہی کے متوسلین میں ایک اور شاعر کا دانا تخلص تھا، اس کی نسبت مولوی غلام علی آزاد بلگرامی یدِ بیضا میں لکھتے ہیں:

''نظمِ ہندی بسیار خوب گفتہ''

بھاشا کی زبان دانی اور شاعری کا ذوق اس زمانے میں اس قدر عام ہوا کہ بڑے بڑے علما اور حضراتِ صوفیہ اس میں کمال پیدا کرتے تھے۔ شیخ غلام مصطفٰی متخلص بہ انسان بہت بڑے پایے کے شخص گزرے ہیں، وہ قوم کے کنبو اور مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ معقولات کی تحصیل حضرت ملا قطب الدین شہید سہالوی (جدِّ مولانا بحرالعلوم) کی خدمت میں کی۔ حدیث کا فن محدث دہلوی کے خاندان سے حاصل کیا، تصوف میں شیخ جان محمد شاہجہاں آبادی کے مرید تھے، طب، نجوم، خوشنویسی، فنِ جنگ، ان تمام چیزوں میں کمال رکھتے تھے، عالمگیر کے زمانے میں منصب داری کے عہدے پر مامور ہوکر دکن گئے لیکن چند روز کے بعد استعفا دے کر چلے آئے۔ 1142ھ میں بہ مقام ایلچپور وفات پائی۔

ہندی زبان اور بھاشا کی شاعری میں ان کا جو درجہ تھا، اس کا اندازہ مولوی غلام علی آزاد کی عبارتِ ذیل سے ہوسکتا ہے:

''علم ہندی بحیثیتے کہ اکثر براہمہ حلِ غوامض از خدمتِ شیخ می کردند و شعرِ ہندی نیز خوب می گفت، صنادیدِ شعرائے ہندی برہمن در حضورِ او سر فرود می آوردند و اصلاح کبت و دوہا می گرفتند۔'' (سروآزاد)

عبدالجلیل بلگرامی: (مولوی غلام علی آزاد کے نانا) جو عالمگیر کے درباری تھے، ہندی زبان کے ممتاز شاعر تھے، فارسی قصیدوں میں بھی کہیں کہیں بھاشا بول جاتے ہیں، چناں چہ ایک قصیدے میں لکھتے ہیں:

اسیس دے کے، کہے ہندوی میں یوں سمت
رہے جگت میں اچل باس یہ وزیر سدا

یہ ذوق اس قدر ترقی کرتا گیا کہ محمد شاہ کے زمانے میں جب راجہ جے سنگھ والیِ جے پور نے بیس لاکھ کے صرفہ سے رصد خانہ قائم کیا اور فنِ ریاضی کے ساتھ نہایت اہتمام کیا تو علمائے اسلام نے اس کے حکم سے شرحِ چغمنی اور ہیئت کی اور کتابوں کا ترجمہ بھاشا زبان میں کیا، چناں چہ آزاد، سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں:

وقد نقل العلماء الاهاند بامر جی سنگھ شرح الجغمنی وغیرہ من کتب الهیئة والهندسة من العربیة الی الهندیة. (سبحۃ المرجان، ص 135)

''ہندوستان کے علما نے جے سنگھ کے حکم سے شرحِ چغمنی وغیرہ کتابوں کا جو علم ہیئت اور ہندسہ میں تھی، عربی زبان سے ہندی زبان میں ترجمہ کیا۔''

شرحِ چغمنی اس درجے کی مشکل کتاب ہے کہ اردو میں اس کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا، اس سے قیاس کرنا چاہیے کہ جو علما بھاشا زبان میں اِس کا ترجمہ کرسکے، ان کی بھاشا دانی کا کیا رتبہ ہوگا۔

اسی زمانے میں سید نظام الدین بلگرامی نے سنسکرت اور بھاشا کے علم ادب میں نہایت شہرت حاصل کی، سنسکرت کے حاصل کرنے کے لیے بنارس کا سفر کیا، اور وہاں رہ کر اس علم کی تکمیل کی، ہندی موسیقی میں اس درجے کا کمال پیدا کیا کہ لوگ ان کو نایک کہتے تھے،

چناں چہ اس فن کے متعلق بھاشا میں دو کتابیں تصنیف کیں، ناؤ چندر کا اور مدھنا یک سنگار، بھاشا میں مدھنا یک تخلص کرتے تھے، 1009ھ میں وفات پائی، کلام کا نمونہ یہ ہے:

جو چترانن چیت چڑھے، نہ بڑھے، بدھ بیدن، گرنتھ نہ گائے
فرشتہ دل ترکیب وصورت عقلا کتب آسمانی قدیم کتابیں
بھارتھی، بھوری کری، بھرین، جپ، جوگن، جوگ اتھیہ گنائے
گویائی سبحہ گردانی ریاضت مرتاض
جو مکھ جوت جگی، نہ تھگی، مدھنا یک گھونگھٹ چنچل تائے
چہرہ روشنی نام شاعر شوخی
جھنین، دوکوں، چھے جھلکی، انچھ، براجت، اچھ رجھائے
باریک دوپٹا زیب دینا بے مثل فریفتہ کرنا

مطلب یہ ہے کہ تیری آنکھیں نقاب کے اندر جس قدر خوش نما ہیں، اس کی خوبی فرشتوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتی اور نہ آسمان کی کتابوں میں اُن کی توصیف پائی جاتی ہے۔

قوتِ نطق خود محوِ حیرت ہے، اور زاہدِ مرتاض سبحہ گردانی سے بھی زیادہ اس کا مدّاح ہے نقاب تک ان آنکھوں کی خوبی کو چھپا نہیں سکتی بلکہ باریک دوپٹا اس کی خوبی اور بھی دوبالا کردیتا ہے۔

ان کا بہت سا کلام سروِ آزاد میں نقل کیا ہے، لیکن چونکہ ناظرین کے لیے وہ نامانوس صدا ہوگی، اس لیے ہم اس کو قلم انداز کرتے ہیں۔

سید رحمت اللہ پسر سید خیرالدین بلگرامی بھاشا زبان کے مشہور استاد تھے، سلطنت کی طرف سے دوصدی منصب اور جاگیر مقرر تھی۔ اس زمانے میں بھاشا کا مشہور شاعر چنتامن ایک ہندو تھا، اس کا ایک شاگرد رحمت اللہ کا شہرہ سن کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور چنتامن کا دوہا ان کے سامنے پڑھا:

ہیو ھرت ارکرت ات چنتامن چت چین
وا مرگ بینے کی لکھی واہی کی سی نین

سید رحمت اللہ نے اس دوہے میں غلطی نکالی اور چنتامن نے سنا تو غلطی تسلیم کرکے اس کی اصلاح کردی چنتامن نے سید رحمت اللہ کی مدح میں ایک دوہا بھی لکھا جس کا مطلع یہ ہے:

گرب، گھسنگ، جیون، سبل، کل گاج من، پربل گنج باج، دل، ساج، دھایو
غرور شیر بطور قوی اظہار دلیری زبردست ہاتھی گھوڑا فوج آراستہ حملہ کیا
بجت اک جمک گھن گھمک دندبھن کی ترنگ، کھر، دھمک، بھوتل ہلایو
ایک طرح پر گردون شگاف نقارہ گھوڑے کا سم زمین

سید رحمت اللہ نے 13 ربیع الاوّل 1118ھ میں وفات پائی، ان کے بہت سے دوہے سروآزاد میں نقل کیے ہیں، ہم صرف ایک پر اکتفا کرتے ہیں:

کرا چاے جمھائے تیر دھاری بھج یہ بھائے
ہاتھ بلند کرنا انگڑائی باز و خوش نما معلوم ہو ہے
منو چپلا دوی چمک ہوئے گری بھوم پر آئے
گویا بجلی زمین

یعنی محبوب نے جمھائی لیتے ہوئے جب دونوں ہاتھ اٹھا کر نیچے کرلیے تو یہ معلوم ہوا کہ گویا دو بجلیاں چمک کر زمین پر گر پڑیں۔ سید غلام نبی پسر سید محمدؐ باقر، سید عبدالجلیل بلگرامی کے بھانجے تھے، 2 محرم 1111ھ میں پیدا ہوئے، سید عبدالجلیل اس زمانے میں عالمگیر کے ساتھ دکن کی مہم پر تھے، بھانجے کے پیدا ہونے کی خبر سنی تو سالِ تاریخ کی فکر ہوئی، اسی حالت میں سوگئے اور خواب میں یہ...... ہاتھ آیا:

نور چشم باقر عبدالحمید م

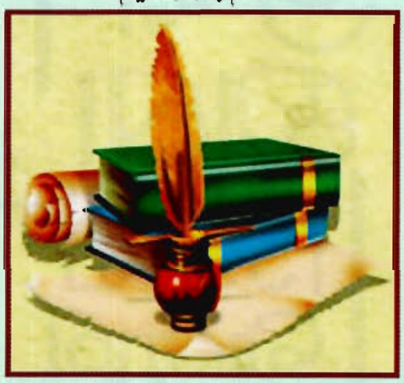

تفاول کے طور پر پیشین گوئی کی کہ یہ لڑکا شاعر ہوگا، خدا کی قدرت پیشین گوئی صحیح اُتری، اگرچہ عربی و فارسی میں مہارت رکھتے تھے، لیکن بھاشا کی شاعری میں نہایت کمال پیدا کیا، 1163ھ میں نواب وزیر اور افاغنہ کی لڑائی میں نواب کے ہمرکاب تھے، اور عین معرکہ جنگ میں مارے گئے۔ مولوی غلام علی آزاد سے نہایت درجے کا اتحاد تھا، چنانچہ آزاد نے تاریخ کہی:

رقم کر دہے ہے غلامِ نبی

بھاشا زبان میں ایک دیوان لکھا جس میں 177 دوہے ہیں، اُس کا نام انگ درپن رکھا، بھاشا میں ان کا تخلص درس لین ہے، درس کے معنی بھاشا میں دیدار کے ہیں اور لین کے معنی محو کے ہیں اور درسین کا لفظی ترجمہ محوِ دیدار ہے، ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

توحید

تیری منور تھ کوہوت ہے سین لوک توں ہی ہوئی اکاش، کرت نکہت اودت ہے
مطلب اشارہ دینا آسمان ستارہ روشنی
توں ہی چاروتو، سیل، تڑپس، پنچھی، ہوت توں ہی میگھ ہوجی کوت اوا کوت ہے
اربعہ عناصر پہاڑ درخت چرند پرند بادل دیتا ہے حساب بے حساب
توں ہی بن ناری بھرتا کی رلیں موت توں ہی ہوئی کی ستر لب این تن لوت ہے
عورت شوہر خو دشمن
جاگ پڑیں جھونوں جیون سیں لوگ، ہوت یتھیں بنا پچاری لوک جاگت کو مت ہے
بیداری خواب ہے

یعنی تیرے ہی اشارے سے دنیا پیدا ہوتی ہے، تو ہی آسمان بن کر ستاروں کو روشن کرتا ہے، تو ہی اربعہ عناصر اور پہاڑ، درخت، چرند اور پرند بن جاتا ہے، تو ہی بادل بن کر بے حساب بارش کرتا ہے، تو ہی عورت کے قالب میں آکر مرد کا راحت رساں ہے، تو ہی بالآخر موت کی صورت میں جان کا دشمن ہے، تو جس طرح کہ جاگنے کے بعد خواب بالکل وہم معلوم ہوتا ہے اس طرح خداشناسوں کے نزدیک یہ دنیا تمام تر خواب ہے۔

سید برکت اللہ بہت بڑے فقیہ تھے، بھاشا میں شعر کہتے تھے اور پیمی تخلص کرتے تھے، بھاشا میں جو اُن کی نظموں کا مجموعہ ہے، اس کا نام خود پیم پرس رکھتا تھا، سروآزاد میں ان کا بہت سا کلام نقل کیا ہے، ہم صرف ایک دوہے پر اکتفا کرتے ہیں:

چکہ جوگی کنتھا گرین، ارن، سیام اور سیت
آنکھ گا سرخ سیاہ سفید
آنسو بوند سمرن لیں درسن بھچا ہیت
قطرہ تسبیح دیدار خیرات

یعنی آنکھیں ایک ریاضت کش جوگی ہیں، جو سرخ، سیاہ اور سفید دانوں کا مالا پہنے ہوئے اور آنسوؤں کی تسبیح لیے ہوئے دیدار کی بھیک کی طالب ہیں۔

ان بزرگوں کے سوا اور بہت سے اہل کمال گزرے ہیں جنھوں نے بھاشا زبان کی انشاپردازی اور شاعری میں نام وری حاصل کی، اور جن کے حالات مختلف تذکروں میں مل سکتے ہیں۔ کیا ان واقعات کے بعد بھی ہمارے ہندو دوست کا یہ بیان قابلِ تسلیم ہے کہ مسلمانوں نے کبھی ہندو لٹریچر پر توجہ نہیں کی، اور جو کرنا چاہتا تھا، وہ کافر قرار پاتا تھا۔ ہمارے ہندو دوستوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں سے زیادہ بے تعصب قوم، نہ صرف دنیا کی پچھلی تاریخ بلکہ موجودہ اور آیندہ زمانہ بھی قیامت تک نہ پیش کرسکے گا۔

■

ماخذ: انتخاب مضامین شبلی: مولانا شبلی نعمانی، سنہ اشاعت: 2011، ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اشتراک: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سماجی برائیاں

بوستانِ خیال کے تناظر میں

ابن کنول

شراب نوشی

شراب کا استعمال قدیم زمانے سے تقریباً تمام ممالک میں رائج ہے، خصوصاً ٹھنڈے ملکوں میں اس کا پینا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ شراب کے پینے کا جواز کبھی زندگی کی تکالیف سے فرار حاصل کرنا ہوتا ہے اور کبھی محض سرمستی و سرور کی کیفیت طاری کرنے کے لیے اسے استعمال کرتے ہیں۔ بعض طبقوں میں مہمان کی تواضع کے لیے شراب کا پیش کرنا لازمی سمجھا جاتا ہے۔

ہندوستان میں جو مسلمان آئے وہ بادہ نوشی کے عادی تھے اور پھر یہاں کا ماحول بھی ایسا نہ تھا کہ شراب سے پرہیز کرتے، یہاں پہلے ہی سے میخانے آباد تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ قرونِ وسطیٰ کے سلاطین کی سب سے بڑی برائی شراب نوشی بن گئی۔ بالآخر میخانوں اور مے خواروں کی کثرت اس قدر بڑھی کہ علاء الدین خلجی نے اپنے عہد حکومت میں شراب کشید کرنے والوں، شراب خوروں، قمار بازوں، بھنگ اور تاڑی فروخت کرنے والوں کو پایۂ تخت سے جلا وطن کردیا۔ شراب کے استعمال اور فروخت پر سختی کے ساتھ پابندی لگادی۔ محل کے تمام خوب صورت جام اور شراب کے برتن توڑ وادیے۔ سونے اور چاندی کے برتنوں کے سکے ڈھلوادیے، سڑکوں پر اس قدر شراب بہائی گئی کہ برسات کے موسم کی طرح کیچڑ ہوگئی۔ چوری چھپے شراب بیچنے والوں کو زمین دوز قید خانوں میں قید کردیا اس کے باوجود مکمل طور سے شراب نوشی ختم نہ ہوسکی، جو شراب پینے کے عادی تھے وہ کسی نہ کسی طرح سے شراب حاصل کرلیتے تھے، مجبوراً علاء الدین کو تھوڑی مقدار میں صرف گھروں کے اندر شراب پینے کی اجازت دینی پڑی۔ یہ پابندی صرف اسی کے عہد تک تھی۔ اس کی موت کے بعد اس کے جانشینوں نے محل کو پھر مے خانہ بنادیا، مبارک شاہ خلجی کا شغل ہی یہ تھا۔

مغلیہ دور تک پہنچتے پہنچتے شراب نوشی عام ہوگئی تھی، اورنگ زیب کے علاوہ سبھی مغل بادشاہ غرق مئے ناب نظر آتے ہیں، بابر کی بیماری کا ایک سبب شراب نوشی بھی تھی، وہ حد سے زیادہ نشہ آور چیزوں کا شوقین تھا۔ اکبر شراب نوشی کے معاملے میں اعتدال پسند تھا وہ چاہتا تھا کہ شراب کو صرف ضرورتاً ایک خاص مقدار میں استعمال کیا جائے۔ اسی لیے اس نے سرکاری افسران کی نگرانی میں سرکاری شراب خانے کھلوائے، شراب کی قیمتیں مقرر کردیں لیکن اکبر اپنی اولاد کی شراب نوشی میں کمی نہ لاسکا۔ مراد اور دانیال کی موت کثرت شراب نوشی کے سبب ہوئی۔ جہانگیر بھی بلا کا شراب نوش تھا۔ جس کا ثبوت اس کی چھوڑی ہوئی یادگاروں پر منقش جام وصراحی بھی ہیں۔ اپنی تصنیف میں جگہ جگہ شراب کا ذکر کرتا ہے، لکھتا ہے:

''جب میں اس تخت پر بیٹھتا ہوں تو دونوں حوضوں کو شراب سے پُر کردیا جاتا ہے۔''

''حوض میں شراب بھروا کر حکم دیا کہ حاضرین جتنی چاہیں پییں۔''

شاہ جہاں کو جو شراب سے پرہیز کرتا تھا جہانگیر ہی نے شراب پینے کی ترغیب دی۔ خرم یعنی شاہ جہاں کے جشن سالگرہ کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جمعہ 25 ماہ دی کو خرم بیٹے کی مجلسِ وزن منعقد ہوئی اس وقت تک اس کی عمر 24 سال کی ہوئی ہے اور خدا کے فضل وکرم سے صاحبِ اولاد ہے مگر اس نے آج تک شراب نہیں پی، اس محفل میں میں نے اس سے کہا کہ بیٹے تو اب صاحبِ اولاد ہے اور سلطنت کی رسم ہے کہ بادشاہ اور شاہزادے شراب پیتے آتے ہیں اس لیے آج اس جشن کی خوشی میں میں تجھے بھی شراب پلاتا ہوں اور اجازت دیتا ہوں کہ جشن کے موقعوں پر نوروز اور بڑی بڑی محفلوں میں شراب پی لیا کرو لیکن اعتدال کے ساتھ پیا کرو تاکہ ہوش و حواس قائم رہیں۔ الغرض اسے شراب پلائی گئی۔''

جہانگیر کی ہدایت کے باوجود شاہ جہاں شراب کا عادی نہ بن سکا بلکہ تخت نشینی کے بعد اس نے ترک بھی کردی تھی، اورنگ زیب بھی شراب نوشی کے عیب سے پاک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے زمانے میں امرا بھی شراب نوشی کم کرتے تھے۔ برنیر نے اس عہد کے بارے میں لکھا ہے کہ شراب جو فرنگستان میں کھانے کا بڑا جزو سمجھی جاتی ہے دہلی کی کسی دکان میں نہیں ملتی، لیکن اورنگ زیب کے بعد عہد زوال کے ساتھ دور شراب بھی شروع ہوگیا اور تمام بادشاہ اور امیر ساغر وصراحی میں ڈھل گئے۔ جہاندار شاہ کے بارے میں مشہور ہے کہ جب وہ لال کنور کے ساتھ شراب پینے ایک شراب بیچنے والی کے پاس جاتا تو کبھی کبھی عالم مدہوشی میں رتھ میں پڑا رہ جاتا، خدّام محل تک پہنچاتے، پھر فرخ سیر، محمد شاہ وغیرہ سب ہی شراب نوشی کا حد سے زیادہ شوق رکھتے تھے امرا بھی بادشاہوں کے نقش قدم پر چلتے تھے، ان کے یہاں بھی جام کھنکتے تھے، شراب بہتی ہے، اس عہد کی حالت کا اندازہ اس دور کی اردو شاعری سے ہوتا ہے، بادشاہوں اور امرا کی اخلاقی پستی پر آنسو بہاتے ہوئے بہت سے شعرا نے شہر آشوب لکھے اور اپنے زمانے کی تصویر پیش کی۔ میر نے یوں نظم کیا ہے:

لال خیمہ جو ہے سپہر اساس/ پالیں ہیں رنڈیوں کی اس کے پاس/ ہے زنا وشراب بے وسواس/ رعب کر لیجیے یہیں سے قیاس/ قصہ کوتاہ رئیس ہے عیاس

'بوستان' میں بھی سبھی مسلمان اور کافر بادشاہ اور شاہزادے مے خوار ہیں۔ خواہ وہ مہدی ہوں یا ان کی اولاد قائم، اسمٰعیل، یا صاحبقران اکبر معزالدین ہوں، کبھی کبھی اتنا ضرور لحاظ رکھا جاتا ہے کہ شراب کو کوئی خوبصورت سا نام دے دیتے ہیں یا طلسمی شراب کہہ کر اپنے لیے حلال کرلیتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی نشہ اسی شراب کا سا ہے بلکہ اس سے بھی تیز اور زود اثر جس کا ایک جام پینے کے بعد شہوانی خواہش پریشان کرتی ہے اور ہوس جسم نازنیں مانگنے لگتی ہے۔ شربتِ طلسم کے یہ اثرات بیشتر مقامات پر شاہزادوں کی حرکات سے ظاہر ہوئے ہیں۔ یوں تو تمام شاہزادے شرابِ ناب بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پیتے ہیں۔ اور بے خودی و سرشاری کے عالم میں نازنینانِ زہرہ جبینوں کے لب ورخسار کو بطور گزک استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی شراب کے حرام ہونے کا خیال آجاتا ہے تو بات اس طرح بیان کردی جاتی ہے۔

''بجر د اس حکمِ ملکہ فوراً کشتی و جام وصراحی لیے ساقی سیم بدن حاضر ہوئے اور ناچ شروع ہوگیا اور اس ماہ لقا نے جام جواہر نگار خود اپنے دست نگاریں سے اٹھا لیا اور صراحی سے لبریز کر کے شاہزادے کو نہایت ناز و انداز سے مسکرا کر دیا، صاحبقرانِ اکبر فلک قدر نے جام دست حق پرست میں لے لیا اور اس وقت خیال میں آیا کہ شراب ناجائز مشروع کا پینا مناسب نہیں ہے یکا یک اس نازنیں نے کہا اے شاہزادہ عالی وقار حضور کو اس جام کو نوش فرمانے میں کیوں مضائقہ ہوا، یہ وہی شراب رمانی ہے جو حضور نے اکثر مقامات طلسم میں نوش فرمائی ہے۔ اس باغ میں ہر وقت موجود رہتی ہے وہ شراب نہیں جس کا حضور خیال فرماتے ہیں۔''

اور جب شبہ دور ہوجاتا ہے تو ساقیانِ سیمیں ساق کے دستِ حنائی سے بےغل وغش و بے اندیشہ شراب کے جام پر جام نوش کیے جاتے ہیں، ماحول پر بیخودی اور مدہوشی چھا جاتی ہے۔ ہر شے مست و سرشار نظر آتی ہے، نہ نظامِ سلطنت کا خیال آتا ہے، نہ نماز کی فکر دل میں رہتی ہے۔

''شاہزادہ عالی وقار مکانِ تخلیہ میں خواتین شمع رخسار و ماہرویان آفت روزگار سے بخوشی و خاطر عیش و عشرت میں مشغول تھا ہر ایک نازنیں مہ جبیں اپنے دست حنائی سے جامہائے شرابِ ناب پلا رہی تھی اور شاہزادہ عالی جاہ نشہ شراب میں بےخود و مدہوش تھا، دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں تھی۔''

جب شراب کو اس طرح جائز قرار دے دیا گیا تو ضروری ہے کہ دوسری ممنوعات بھی جائز ہوجائیں، شراب کے ساتھ عورت کا جائز ہونا لازمی تھا۔

''القصہ تمام شب صاحبقران والا قدر نے جام یاقوت میں شراب پی اور طناز وراحت ناز وغیرہ نازنینوں سے بےغل وغش نوبت بنوبت مباشرت کی۔''

غرض کہ ''بوستان'' کی ہر محفل میں جامہائے شراب نازنینان گل اندام کے ہاتھوں میں گردش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، صرف شاہزادے ہی شراب کا شوق نہیں فرماتے بلکہ شاہزادیاں بھی اپنی تشنہ لبی کو شراب سے دور کرتی ہیں، شاہزادیوں کا شراب پینا بُرا نہیں سمجھا جاتا، وہ بھی کبھی شاہزادوں کے ساتھ اور کبھی اپنے محل میں اپنی ہمسنوں کے ساتھ محفلِ جام وشراب آراستہ کرتی ہیں:

''ملکہ نوبہار گلشن افروز خواتین عالی وقار کو اپنے دست نازک ورنگین سے جامِ مے ارغواں دے رہی تھیں اور شرابِ ناب خواتین کو پلا رہی تھیں۔''

شراب کا استعمال میدانِ جنگ میں بھی ہوتا تھا، فوجی نظام کے ذیل میں بیان کیا گیا ہے کہ جب کسی سے مقابلے کے لیے کوئی پہلوان جاتا تھا تو بادشاہ بدستِ خود اسے جام شراب پیش کرتا تھا، کفار کے پہلوان زور وقوت بڑھانے کے لیے شراب پیتے تھے، تاکہ مستی میں مقابل سے اچھی طرح مقابلہ کرسکیں۔

''ادھر لشکر بکران شاہ خارجی سے بلقاس ایک جامِ شراب ارغوانی نوش کر کے تلخوم کے مقابلے کو چلا۔''

شراب کے علاوہ دوسری نشہ آور منشیات بھی مستعمل ہیں لیکن ان کا استعمال شراب کے مقابلے میں بہت کم ہے، افیون، چرس، بھانگ وغیرہ کا ذکر کیا جاچکا ہے ان کے علاوہ ایسا قہوہ بھی موجود ہے جس کے پینے سے شراب کی سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔

''ملکہ نے مسّی طلب کر کے ملی اور قہوہ سلطان کے واسطے تیار کیا اور کہا اس قہوہ کا پیالہ پی اور لب کا بوسہ لے کر اس کے اثر پر میں نے مسّی ملی ہے اور اس قہوہ سے شراب کی سی کیفیت ہوگی۔''

المختصر شراب کا استعمال مسلمان اور کفار شاہزادوں نے ہر مقام پر کیا ہے کفار کے لیے تو یہ جائز ہی ہے، مسلمانوں نے بڑی خوبصورتی سے جائز کرلیا ہے۔

طوائف پسندی

گھر کی چہار دیواری سے باہر جنسی آسودگی حاصل کرنے کا رواج ہندوستان میں قدیم زمانے سے رائج ہے، قدیم زمانے میں جنسی اختلاط کو خاص اہمیت حاصل تھی اس کا ثبوت اس عہد کی چھوڑی ہوئی نشانیوں میں موجود ہے۔ موہن جوداڑو میں ایک قدیم حمام ہے جس میں حوض کے گرد بہت سے کمرے بنے ہوئے ہیں، قدیم ترین حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حمام میں اپسرائیں یعنی بے پناہ حسین عورتیں رہا کرتی تھیں جو مردوں کو لُبھا کر اپنے ساتھ شامل کرلیتی تھیں۔ یہ حسینائیں نغمہ ورقص میں بھی کمال رکھتی تھیں۔ ڈی۔ ڈی۔ کوسمبی نے اپسراؤں کے متعلق لکھا ہے کہ:

''اپسرائیں کسی شخص کو شادی کے ذریعے خاوند بنا کر مستقل ازدواجی زندگی بسر نہیں کرسکتی تھیں۔ اس سے اس عظیم حمام کے کمروں کی عجیب وغریب تعمیر کا راز حل ہوتا ہے یہ اس پوجا یا مذہبی رسم کا حصہ تھا کہ مرد نہ صرف یہ کہ مقدس پانی میں اشنان کرے بلکہ جس دیوی ماتا سے قلعہ منسوب تھا اس کی نمائندگی کرنے والی خادمان کے ساتھ مباشرت بھی کریں۔ یہ کوئی دور از کار بات نہیں۔ سومر اور بابل میں اشتر کے معابد اسی طرح کی رسوم رکھتے تھے جن میں سربرآوردہ خاندانوں کی لڑکیوں کو شریک ہونا پڑتا تھا۔ خود دیوی اشتر بہ یک وقت ایک ابدی دوشیزہ بھی تھی اور ایک فاحشہ بھی۔''

اس حمام کی حالت بالکل طوائفوں کے بازار کی سی ہے جہاں ہر عورت بن سنور کر اپسرا نظر آتی ہے، اسی طرح مندروں میں دیوداسیاں جنسی آسودگی کا سبب بنتی تھیں۔ مندروں میں جنسی اختلاط کی آزادی ہوتی تھی:

''مندروں میں ناچنے گانے والی دیوداسیاں رہنے لگیں، شیوجی کے مندروں میں یہ رسم عام تھی، ان آبروباختہ عورتوں کی وجہ سے مندروں میں پجاریوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہوجاتی۔''

کیونکہ مندروں میں دیوداسیوں کا رہنا اور برہنہ ناچ کرنا مذہبی رسموں میں شامل تھا اس لیے مسلمانوں کی آمد کے بعد بھی یہ بالکل ختم نہیں ہوسکا، برنیئر نے اپنے سفرنامہ میں مندروں کے اندر ہونے والی بے حیائی کا ذکر کیا ہے۔ جگن ناتھ کے رتھ کے جلوس کے متعلق لکھا ہے کہ رتھ کے سامنے بلکہ خاص مندر میں بھی میلہ کے دنوں میں ناچ کے وقت کسبیاں اپنے بدن کی مختلف حرکات سے نہایت بےشرمی اور بےحجابی کا مظاہرہ کرتی ہیں اور برہمن ان لغویات کو بالکل اپنے ملک کے مذہب کے مطابق خیال کرتے ہیں، یہ وہ ناچ تھا جس میں بنگالی رنڈیوں کو بےتکلفانہ جلسوں میں بالکل برہنہ نچا کر خوش ہوتے تھے۔ برنیئر نے سادھوؤں اور کسبیوں کے تعلق پر مزید لکھا ہے کہ میں ایسی بہت سی خوبصورت کسبیوں کو جانتا ہوں جو باوجود پیشہ کے نہایت محتاط ہیں یعنی ہر کسی کے پاس نہیں چلی جاتیں، چنانچہ ان عورتوں کو کئی اہلِ اسلام اور عیسائی اور بعض پردیسی قوم کے بت پرستوں نے بہت کچھ دولت اور روپیہ دینا چاہا لیکن انھوں نے بایں عذر قبول نہیں کیا کہ ہم نے اپنے تئیں دیوتاؤں اور برہمنوں اور ان سادھوؤں پر جو ننگے دھونی رمائے اور جٹادھارن کیے مندر کے چاروں طرف بیٹھے ہیں وقف کیا ہے۔''

مسلمان جو ہندوستان میں آکر کچھ زیادہ ہی لذت پرست اور عیش دوست ہو گئے تھے بھلا کیسے اس پیشے پر پابندی عائد کرتے بلکہ خود انھوں نے اس میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔طوائفوں کے لیے الگ باقاعدہ بازار بننے لگا۔ طوائفوں کی رسائی دربار شاہی تک ہونے لگی۔ درباروں میں ان کا رقص ہوتا، نغمے سنے جاتے، امرا اپنے گھروں پر ان کے لیے محفلیں آراستہ کرتے، کوئی بزم یا جشن ایسا نہ ہوتا تھا جس میں طوائفیں شرکت نہ کرتی ہوں، ہر موقع پر انھیں ناچ گانے کے لیے بلایا جاتا تھا، باقاعدہ لوگ انھیں ملازم رکھتے تھے، بڑے شہروں میں ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی، فرانسیسی سیاح ٹیونز نے اپنے زمانۂ سیاحت میں گولکنڈہ کی طوائفوں کی تعداد بیس ہزار بتائی ہے۔1 محمد شاہ کے زمانے میں خاصی بڑی تعداد میں طوائفیں دلّی میں موجود تھیں، طوائفوں کی ایک طویل فہرست تو مرقع دہلی میں موجود ہے خود بادشاہ طوائفوں میں دلچسپی لیتا تھا نور بائی اس کے دربار کی مشہور طوائف تھی، مرقع دہلی میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ بڑے بڑے امرا اس کے دیدار و ملاقات کی تمنا دل میں رکھتے ہیں، اس کی محبت کا نشہ وہ خانہ خرابی ہے جو بھی اس کا ذوق رکھتا ہے اور اس کی آشنائی کا نشہ جس کے سر پر سوار ہوتا ہے وہ بے تابانہ اپنی دولت کو گرد و باد کی طرح اڑا دیتا ہے، نہ جانے کتنے لوگوں نے اپنی ثروت کو اس کے قدموں پر نچھاور کر دیا ہے۔ ایک اور طوائف چمنی بھی بادشاہ کی منظورِ نظر تھی، ان کے علاوہ بھینائے فیل سوار، خوش حال رام جنی، چک مک دمانی وغیرہ اس عہد کی مشہور طوائفیں ہیں۔محمد شاہ کے عہد کی ایک مشہور طوائف اور بیگم تھی جس کے بارے میں صاحبِ مرقع دہلی نے لکھا ہے:

''دہلی کی مشہور بیگم ہیں جو پائجامہ نہیں پہنتیں بلکہ اپنے بدن کے نچلے حصے پر پائجامہ کی طرح گل بوٹے بنا لیتی ہیں بعینہ ایسے گل بوٹے بناتی ہیں جو رومی کمخواب کے تھان میں ہوتے ہیں، اس طرح وہ امراء کی محفلوں میں جاتی ہیں اور کمال یہ ہے کہ پائجامہ اور اس نقاشی میں کوئی امتیاز نہیں کر پاتا۔ جب تک اس راز سے پردہ نہ اٹھے کوئی ان کی کاریگری کو نہیں بھانپ سکتا۔''

محمد شاہ ہی کے عہد میں کسل سنگھ نام کے ایک امیر نے رنڈیوں کی ایک بستی بسائی تھی جو کسل پورہ کے نام سے مشہور تھی ہر قسم کی عورتوں کو لاکر وہاں آباد کیا تھا۔عیش پسند لوگوں کو یہاں آنے کی عام دعوت تھی، اس کی ہوا جنسی لذت میں ہیجان پیدا کرتی تھی، اس کی فضا لذائذ نفسانی کو بے طرح برانگیختہ کرنے والی تھی لہو ولعب سے زندگی گزارنے والے بے روک ٹوک وہاں جاتے تھے۔

دہلی کے دور کے ختم ہونے کے بعد طوائفوں کو سب سے زیادہ عروج لکھنؤ میں حاصل ہوا، نوابین اودھ نے اس طبقے کی بہت پذیرائی کی۔لکھنؤ میں طوائفوں کو ہر طرح کی کھلی آزادی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف طوائفیں ہی طوائفیں نظر آنے لگیں۔شرر لکھتے ہیں:

''بازاری عورتوں اور ناچنے والے طایفوں کی شہرت اس قدر ہوگئی کہ کوئی گلی کوچہ ان سے خالی نہ تھا اور نواب کے انعام و اکرام سے وہ اس قدر خوش حال اور دولت مند تھیں کہ اکثر رنڈیاں ڈیرہ دار تھیں جن کے دو دو تین تین عالیشان خیمے رہا کرتے۔''

لکھنؤ میں طوائفوں کے کوٹھے پر جانا وہاں کی تہذیب میں شامل ہو گیا تھا، بڑے بڑے امرا اور رؤسا وہاں جایا کرتے تھے بلکہ یہاں تک خیال کیا جاتا تھا کہ جو شخص طوائف کی محفل میں نہیں جاتا وہ ادب و تہذیب سے ناآشنا رہتا ہے:

''بوستان'' میں طلسمات کے اکثر مقامات لکھنؤ کے گلی کوچوں کی طرح حسین عورتوں سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں، ''میخانہ ہوش ربا''، ''مقام الامتحان''، ''باغ ابرسیما''، ''طلسم الفروج'' اور بعض دوسرے مقامات طوائفوں کے کوٹھے ہی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ صاحبقرانوں کی شادی میں ہر منزل پر طوائفیں رقص کرتی ہیں اور نغمے سناتی ہیں صاحبقران انھیں انعامات سے نوازتے ہیں۔''

معزالدین کیقباد اور شجاع الدولہ کی طرح ''بوستان'' کے شاہزادے بھی محل سے باہر جاتے وقت طوائفوں کو اپنے ہمراہ رکھتے ہیں، خواہ جنگ پر جائیں یا شکار پر۔ صاحبقران اصغر جب شکار کے لیے گیا تو رقاصائیں اور مطربان خوش گلو اس کے ساتھ تھیں:

''ان کے علاوہ ملک اغرب نے بھی چند طوائف خوش خوان، خوش جمال بنی نوع انسان سے بھیج دی تھیں، وہ نازنینیں رات دن صاحبقران عیش دوست کے اوقات خوش رکھتی تھیں۔''

یوں شاہزادوں کے محل بھی طوائف کے مکانوں سے مختلف نہیں وہی ناز و غمزہ کے تیر اور جنسی اختلاط کی آزادی کا ماحول وہاں موجود ہے۔ پھر بھلا وہ کوٹھوں پر کیوں جانے لگے۔ یہ شاہزادے کوٹھوں پر نہ جائیں یہ دیگر بات ہے لیکن ''بوستان'' میں کوٹھے موجود ہیں اور دوسرے لوگ وہاں جاتے ہیں:

''ایک روز جمشید کوتوال طوائفِ شہر کا رقص دیکھ رہا تھا، ان میں سے ایک زن رقاصہ کی طرف اس کی طبیعت بے اختیار مائل ہوئی آخر شراب کے نشہ میں جمشید نے اس رقاصہ کو اپنے پاس بلایا۔سرِ محفل اس کے لب و رخسار کے دو چار بوسے لیے۔''

طوائفوں کو اپنے محلوں پر بھی بلایا جاتا تھا۔

''سولان کے ملک میں مزلفہ رقاصہ نامی ایک فاحشہ رہتی تھی، سولان نے اس کو طلب کر کے ان دونوں کی خدمت میں بھیجا، اور اس نے ان دونوں کو رقص و خواندگی کی داد ہائے غیر مکرر سے ایسا مفتون کیا کہ اس سے ایک دم کی جدائی ان کو نا گوار تھی اور فاجرہ ان دونوں سے اختلاط نہانی بھی کرتی تھی۔''

جنسی اختلاط کی آزادی ''بوستان'' کے اس شہر میں عروج پر نظر آتی ہے۔

''عجب شہر دیکھا کہ... عورتیں اعلانیہ کوچہ و بازار میں خویش و بیگانہ سے بلا مضائقہ مباشرت کرتی تھیں اور کوئی شخص ان کا مزاحم نہ تھا۔

''بوستان'' میں اگر چہ تمام شاہزادیاں اعلانیہ عشق کرتی ہیں۔محلوں سے نکل کر تلاشِ محبوب میں سرگرداں و پریشاں پھرتی ہیں، لیکن یہ کسی فعلِ بد کی مرتکب نہیں ہوتیں۔ جو عورتیں معاشرہ اور عورت کے کردار کو بدنام کرتی ہیں ان کا تعلق عام طور پر نچلے طبقے سے مثلاً جب ایک شخص ایک شاہزادہ کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے تو اس کی بیوی شوہر کے قاتل سے کہتی ہے کہ اچھا کیا تو نے اسے مار دیا، میں جب سے اس گھر میں آئی ہوں سر بمہر ہوں آج تو مرد ملا تو تجھ سے پہلو گرم کروں گی۔ ایسی عورتیں صرف جسمانی لذت کو مقصدِ حیات سمجھتی ہیں اور اسے پانے کے لیے وہ اپنے شوہر کو زہر دینے میں بھی جھجک محسوس نہیں کرتیں۔ شوہر کی موت کا سوگ منائے بغیر دوسرے ہی دن اپنے منظورِ نظر سے مختلط ہوتی ہیں اور حسبِ منشابات نہ بننے پر انتقام بھی لیتی ہیں۔ ایسی عورتوں کی بدکاری پر ان کے اعزہ انھیں اپنے ہاتھ سے قتل کر دیتے ہیں۔عدالت سنگساری کا حکم دیتی ہے، اس قتل اور سنگساری کے باوجود معاشرہ برائیوں سے محفوظ نہیں۔

گذشتہ صدی تک طوائف کو معاشرے میں انتہائی مقبولیت اور ترقی حاصل تھی۔ یہ جانتے ہوئے کہ طوائف کے کوٹھے کی راہ اخلاقی پستی کا راستہ ہے، طوائف کو معاشرے کا ایک لازمی اور اہم جزو سمجھا جاتا تھا۔

■

ماخذ: ہندوستانی تہذیب (''بوستان خیال'' کے تناظر میں: ابن کنول، سنہ اشاعت 2013، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سید منیر محی الدین

اردو گیت کے فنی محاسن

قدیم دور سے ہی انسان بے اختیار اپنے شدید جذبات واحساسات کا اظہار غنائی پیکر میں کرنے لگا جسے آگے چل کر 'گیت' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ گیت میں نہ تو صناعی کا عمل دخل ہوتا ہے اور نہ پرکاری کا۔ گیت ایک ایسا آلۂ کار ہے جس کے ذریعے انسان اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے، وہ اپنے رنج وغم اور خوشی وانبساط کے لمحوں کو گیت کے ذریعے نہ صرف ظاہر کرتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی اس میں شامل ہونے پر اپنی خوشی ومسرت کا اظہار کر بیٹھتا ہے۔

باعتبارِ فن 'گیت' میں نہ تو بحروں چھندوں کا کوئی باقاعدہ طور پر انتظام کیا جاتا ہے اور نہ ہی زبان وسلاست کا کوئی توڑ، وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بیان کر دیتا ہے۔ گویا کہ 'گیت' انسانی جذبات کا آئینہ دار ہے۔ 'گیت' میں 'لے' کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ لے کے بغیر کوئی گیت پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

اکثر گیت لکھنے سے پہلے 'لے' ذہن میں ابھرتی ہے اور یہ لے دراصل سنگیت کے تابع ہوتی ہے اور اِسی ڈور میں تمام جذبات وکیفیات کو پرو دیا جاتا ہے۔

اردو گیت میں 'صوتی آہنگ' کے ذریعے بھی غنائی کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے اور موسیقیت کو ابھارا جاسکتا ہے۔ اِس ضمن میں یوسف ظفر کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

چھن چھن چھنا چھن رقص کر
مر مر کے ناگن رقص کر

(اردو گیت، ص 72)

اِسی طرح میرا جی کا ایک شعر پیشِ خدمت ہے:

جگ جگ جوت جلے جیون کی
جوت جلے جیون کی

(اردو گیت، ص 74)

اردو نثر میں عام طور پر الفاظ کی تکرار کو معیوب سمجھا جاتا ہے، لیکن گیت میں یہی تکرار حسن وخوبی پیدا کر دیتی ہے۔ بقول رچرڈسن ''وزن اور بحر کا انحصار توقع اور تکرار پر ہی ہے۔'' (اردو گیت، ص 75)

اردو گیت میں الفاظ کی تکرار سے جو حسن وخوبی پیدا ہوتی ہے ہم ضیا جالندھری کے حسبِ ذیل بند میں دیکھ سکتے ہیں:

وہ نہ آئے نہ سکھ ساتھ لائے یہاں
وہ نہ آئے
چاند کی جوت جلتی تھی جلتی تھی
رات شاخوں کی آہوں میں چپ چاپ ڈھلتی تھی
وہ نہ آئے
جی ڈراتے رہے کالے سائے یہاں

(اردو گیت، ص 75)

اردو گیت میں شعرا نے 'صوتی تکرار' سے بھی نغمگی پیدا کی ہے جس سے اُن کے فنی کمال کا اظہار بخوبی ہوا ہے۔ اِس بات کو ہم قیوم نظر کے حسبِ ذیل بند میں دیکھ سکتے ہیں:

کھائیں جھکولے بنیں ہنڈولے پگ پگ اٹکیں مٹکیں
راس رچائیں، دھوم مچائیں، من کی کلیاں چٹکیں

(اردو گیت، ص 164)

اردو گیت میں شعرا نے 'زبان کی روانی وسلاست' کے ذریعے غنائی کیفیت پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اِس بات کو ہم الطاف مشہدی کے حسبِ ذیل بند میں بخوبی دیکھ سکتے ہیں:

سپنوں کے سنسار بسا دے
ایک نہیں دوچار بسا دے
پی کے گھومیں جن میں پریمی
پریمی کو چومیں جن میں پریمی
مدُھر میں ڈوبی تان اڑا
دھیرے دھیرے گا ری جوگن
دھیرے دھیرے گا

(اردو گیت، ص 167)

قتیل شفائی نے اپنے گیتوں میں تاثیر اور دل فریب کیفیات پیدا کر کے ایک قسم کی موسیقیت کو بڑے عمدہ پیرائے میں اجاگر کیا ہے جس کی جھنکار کو ہم حسب ذیل بند میں دیکھ سکتے ہیں:

موہے چاند کے پائل منگا دو سجن
خالی پیروں سے پنگھٹ کو میں چلوں
اپنی سکھیوں کو دیکھوں تو من میں جلوں
وہ نو ناچیں میں شرما کے منہ پھیروں
موہے پنگھٹ کی رانی بنا دو سجن

(اردو گیت، ص 175)

اردو گیتوں میں خاطر غزنوی آوازوں کی مخصوص تکرار سے ایک اچھوتا ترنم پیدا کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

رِم جھم رِم جھم جھن جھن جھن چھم چھم چھم پائل بولے

اردو گیتوں میں نگار صہبائی نے انفرادی جہت پیدا کر کے اس میں ایک دلکش خوبی کا اظہار کیا ہے۔ حسب ذیل بند ملاحظہ کیجیے:

سن ری سکھی موری پائل کی جھن
میں چلوں تو ستارے لٹائے گگن
میں رُکوں تو ہر اک تال میں کتنے بھسم
چال سنگیت میں میرا تن من مگن

(اردو گیت، ص 193)

اردو گیتوں میں 'چھندوں' کے استعمال سے غنائیت کی ایک مخصوص کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ بقول قیصر جہاں:

''چھندوں کے استعمال سے تمام آوازیں ایک روپ میں ڈھل جاتی ہیں۔ گیت میں شدید جذبات قائم رکھنے کے لیے چھند معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اُن کے وسیلہ سے خیال نغمہ میں گھل جاتا ہے۔''

(اردو گیت، ص 193)

اِس ضمن میں احمد ہمیش کے گیت کا ایک بند ملاحظہ کیجیے:

گزر گیا چپ چاپ ہوا کا جھونکا
دنیا میں بس میں ہی رہا اکیلا
نیند اڑائے دوری کے سب رنگوں اور تٹ بھی سارے
ہٹے ہوئے کنارے

(اردو گیت، ص 79)

افسر میرٹھی کی مترنم اور سادہ نظموں میں ایک بھرپور غنائی کیفیت پائی جاتی ہے جس سے دلوں میں فرحت ومسرت کا سرور پیدا ہونے لگتا ہے۔ حسب ذیل بند ملاحظہ کیجیے:

باغوں نے پہنا پھولوں کا گہنا
نہروں کا بہنا وارافتہ رہنا
دنیا میں جنت میرا وطن ہے

(اردو گیت، ص 116)

اردو گیتوں کا بغائر مطالعہ کیا جائے تو ہمیں عظمت اللہ خاں کے گیتوں میں غنائیت کا ایک اچھوتا انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی زبان بہت ہی رسیلی اور لطیف و نازک دکھائی دیتی ہے۔ حسب ذیل بند میں اس بات کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں:

چال نشیلی جھومتا بادل
یا کوئی ندی لہرائی
جورِ جوانی میں اِٹھلاتی
چھاتی چھپاتی
دل تڑپاتی

(اردو گیت، ص 110)

اردو گیتوں میں ہجر و وصال کے مضامین بڑی عمدگی کے ساتھ باندھے جاتے ہیں۔ بالخصوص 'ہجر' کو 'برہ' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جس میں ایک فراق زدہ عورت کے المیہ کو فنی چابکدستی کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ گیت کا مزاج فطرتاً فراق کی تپش سے وجود میں آتا ہے۔ اِس کیفیت کا بخوبی اظہار ہمیں حضرت امیر خسرو کے گیت میں بدرجۂ اتم دکھائی دیتا ہے۔ حسب ذیل بند ملاحظہ کیجیے:

کہ تابِ ہجراں ندارم اے جان نہ لیہو کا ہے لگائے چھتیاں
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
کِسے پڑی ہے جو سناوے پیارے پی کو ہمارے بتیاں
نہ نیند نیناں نہ رنگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
سپت من کے در آئے راکھوں جو جائے پاؤ پیا کی کھتیاں

(اردو گیت، ص 83)

حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے شعر میں بھی 'برہ' کی کیفیت پائی جاتی ہے:

آج برہے کی آگ مجھ تننے لاگے رے
آج برہے کی آگ مجھ تننے لاگے رے

(اردو گیت، ص 83)

محمد قلی قطب شاہ کے گیتوں میں نہ صرف ہجر کی کیفیات پائی جاتی ہیں بلکہ انھوں نے بڑے عمدہ پیرائے میں عشق کی اہمیت کو صرف ایک مصرعہ کے ذریعے واضح کیا ہے جس سے ان کے فنی کمال کا بخوبی اظہار قاری کو دیکھنے میں ملتا ہے۔ حسب ذیل بند ملاحظہ کیجیے:

پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج یک پل جیا جائے نا
کہیتے پیا بن صبوری کروں
کہیا جائے اماں کہیا جائے نا
نہیں عشق جس کو وہ بڑا کواڑ ہے

(اردو گیت، ص 86)

اِسی طرح ملا وجہی نے اپنے گیتوں میں ہجر کی جان لیوا کیفیات کا برملا اظہار کیا ہے۔ حسب ذیل بند ملاحظہ کیجیے:

طاقت نہیں دوری کی اب توں بیگی آمل رے پیارے
تج بن منجے جیا بہوت ہوتا ہے مشکل رے پیارے
کھانا برہ کا کھاتی ہوں میں پانی انجھو پتی ہوں
تجھ سے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا کیا سخت دل ہے پیارے

(اردو گیت، ص 86)

ولی اورنگ آبادی کے گیتوں میں ہجر کا سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ حسبِ ذیل ملاحظہ کیجیے:

سوا جس کے دل میں رہے یادِ یار
وہ رو رو پھرے ہجرسوں بے قرار
نہ ہوئے اُسے جگ میں ہرگز قرار
جسے عشق کی بے قراری لگے

(اردو گیت، ص 86)

فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو حسرت موہانی کے گیتوں میں کمالِ فن کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کی امتیازی

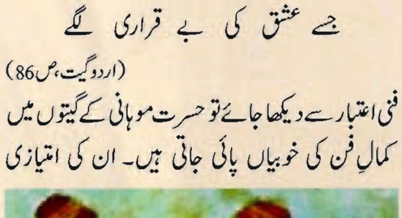

خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے منقبت کو بھی گیت کا جامہ پہنایا ہے اور اس میں ہجر کے دل سوز پہلو کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ سمویا بھی ہے۔ ایک بند ملاحظہ کیجیے:

بغدادی دیا لو کھویا

ہم ہوں گریب ہیں پار جویا
برہا کی ماری نپٹ دکھیاری
تاکن کب للگ دور سے نیا

(اردو گیت، ص 103)

آرزو لکھنوی کے گیتوں میں خیال کی سادگی، بیان کی نرمی اور زبان کی سلاست کے ساتھ ساتھ برہ کے جاں سوز پس منظر کو بڑے عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ حسب ذیل بند ملاحظہ کیجیے:

برہا اگن نے بن کر آنسو پتھر کو پگھلایا
دونوں آنکھیں دونوں باہیں ملنے کو للچائیں
آس ملن کی جیون آشا دکھ سنکٹ کٹ جائیں

(اردو گیت، ص 105)

اختر شیرانی نے اپنے گیتوں میں 'برہ' کے موضوع کو اپنایا ہے جس میں جذبات کی شدت اور حسن و عشق کی بجلیاں کوندتی ہوئی نظر آنے لگتی ہیں۔ حسبِ ذیل بند ملاحظہ کیجیے:

اب نہ آئے من کے چین
بیت چلی ہے آدھی رین
نہ کوئی ساتھی نہ کوئی سجنی نہ کوئی میرے پاس سہیلی
برہ کی بھی رات گزاروں، ڈر کے مارے کیسے اکیلی
نیر بہائیں کب تک نین
اب بھی نہ آئے من کے چین

(اردو گیت، ص 129)

اردو گیتوں میں عرش ملسیانی کا نام بھی فنی اعتبار سے اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے گیتوں میں 'برہ' کے موضوع کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا ہے۔ اِس ضمن میں ان کا ایک بند ملاحظہ کیجیے:

آہ بھرت ہوں ہر کروٹ پر
چونک پڑت ہوں ہر آہٹ پر
روپ انیک دکھائے پیا نہیں آئے
سیج سنگھار نہ بھائے

(اردو گیت، ص 139)

اردو گیتوں میں مقبول احمد کے نام کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ انھوں نے 'برہ' کے موضوع کو بڑے دلکش پیرائے میں پیش کیا ہے، حسبِ ذیل بند ملاحظہ کیجیے:

گھٹا برہ کی چھائی من میں گھور گھرج نہ بھائے
آدھی رات بیت گئی پر شیام اب تک نہ آئے
جیا للچاوے مور سکھی برکھا رُت دھوم مچائے
لگی برہ کی آگ بدن میں نیناں برس آئے

(اردو گیت، ص 141)

اردو گیتوں میں قیوم نظر نے بھی 'برہ' کے موضوع کو اپنایا ہے۔ ان کے گیتوں کو پڑھنے کے بعد یہ احساس شدت کے ساتھ پیدا ہونے لگتا ہے کہ انھوں نے اپنے گیتوں کے ذریعے اپنی دلی کیفیات کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اِس سلسلے میں ان کے گیت کا ایک بند ملاحظہ کیجیے:

قدم قدم پر نین بچھائے
پلک پلک پر دیپ جلائے
چمک چمک کر ڈولے تارے
کوئی نہ آیا
کوئی نہ آیا

(اردو گیت، ص 161)

■

Dr. Sayyed Muneer Mohiuddin, Lect Dept of Urdu, Sri Wenkteswara University, Tirupati - 517502 (AN)

وقار ناصری

تصویر: بشکریہ راشد اشرف

عطیہ فیضی
ایک بھولی بسری داستان

عطیہ کی داستان لکھنے والوں نے بس یہی لکھا کہ وہ جوانی میں ایک رنگین داستان تھیں اور بڑھاپے میں وہ اس داستان کی داستان گو بن گئیں۔ گویا عطیہ فیضی زندگی بھر اس داستان کو سناتی رہیں جو شہرزاد کی ہزار داستان سے کسی طور بھی کم نہیں تھی۔ حالانکہ عطیہ کی یہ داستان بیان کرنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ وہ اس کے علاوہ بھی کچھ اور تھیں۔ شبلی اور اقبال سے ان کے تعلقات کو لے کر بہت سے افسانے مشہور ہوئے مگر کسی نے یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ کیا شبلی کے 57 اور اقبال کے 35 خطوط کے سہارے ہی عطیہ کی پوری زندگی کو مکمل طور پر بیان کیا جاسکتا ہے یا شبلی کے دو چھوٹے چھوٹے فارسی غزلوں کے مجموعوں 'دستۂ گل' اور 'بوئے گل' کے ساتھ ساتھ 'بانگ درا' کی 'سلیما' اور اقبال کے شعر:

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیِ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے!

سے ہی عطیہ کا مکمل تعارف ہوسکتا ہے۔

عطیہ فیضی 1877 میں استنبول میں پیدا ہوئیں (بعض لوگوں نے بمبئی لکھا ہے) باپ مال دار تاجر ہونے کے علاوہ سلطنت عثمانیہ میں ہندوستان کی برطانوی حکومت کے سفیر تھے۔ عطیہ کی ماں امیر النسا اور نانی درۃ الولی پڑھی لکھی خواتین تھیں اور ان کے خاندان کی لڑکیاں 1880 سے لندن میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ عطیہ کی دو اور بہنیں زہرہ اور نازلی تھیں۔ عطیہ ہندوستان کی وہ پہلی مسلمان لڑکی تھیں جنھیں سرکاری وظیفے پر لندن جاکر تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ 1906 کا یہی وہ تعلیمی سفر تھا جس کا روزنامچہ عطیہ فیضی نے پابندی سے لکھا اور لاہور سے شائع ہونے والے ماہنامے 'تہذیب نسواں' میں باقاعدگی سے اس کی اشاعت ہوئی۔ بعد کو یہ روزنامچہ 'زمانہ تحصیل' کے عنوان سے مفید عام پریس آگرہ سے 1921 میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ (عطیہ بیگم رحمین۔ زمانہ تحصیل۔ مفید عام پریس۔ آگرہ 1922 - 2010 میں 'ادارۂ یادگار غالب' نے اسے دوبارہ شائع کیا اور اس کا انگریزی ترجمہ اور عطیہ کی زندگی کا احوال آکسفورڈ پریس انڈیا نے چھاپا ہے۔ یہ کام بوسٹن یونیورسٹی میں فارسی کے سینئر لیکچرار ڈاکٹر سنیل شرما اور ایس لیمبرٹ ہرلے نے مشترک طور پر انجام دیا ہے۔ اس کتاب کا نام Atiay's Jonnrcy: A Muslim Woman from Clonial Bombay to Edwardian Briton ہے۔ 1907 میں عطیہ یورپ سے ہندوستان واپس آئیں تو انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم اور کم سنی کی شادی کے خلاف زبردست مہم چلائی۔ 1908 میں وہ دوبارہ اپنی بہن نازلی بیگم اور بہنوئی ہز ہائی نس نواب جنجیرہ کے ساتھ لندن کے سفر پر نکلیں۔ لندن کے علاوہ یورپ کے مختلف شہروں میں ٹھہرتی ہوئی وہ استنبول پہنچی ہیں جہاں وہ پیدا ہوئی تھیں۔ استنبول میں کئی مہینوں تک دونوں بہنوں کا قیام رہا۔ دونوں بہنوں کو سلطان عبدالحمید خاں نے 'نشان شفقت' عطا فرمایا جو حکومت ترکی کا طبقۂ نسواں کے اعزاز میں ایک مخصوص تمغہ ہے۔

لندن میں دوران تعلیم قیام کے دوران اور اس کے بعد کے سفر میں ان کے ملنے والوں میں ادیبوں، دانشوروں، برطانوی شہزادے، شہزادیاں، اعلیٰ افسر، ہندوستانی نواب، راجے مہاراجے اور معزز حضرات اور ان کی بیگمیں ہیں جو اس زمانے میں لندن اور فرانس وغیرہ میں موجود تھے۔ سید علی بلگرامی، بیگم سید علی بلگرامی، جسٹس امیر علی، عبداللہ یوسف علی، آرنلڈ (اقبال کے استاد)، جمشید جی ٹاٹا، نواز بائی ٹاٹا، پرنس صوفیہ دلیپ سنگھ، سفیر ترکی، مہاراجا اور مہارانی بڑودہ، مہارانی کوچ بہار کے علاوہ دوسرے، بہت سے معزز حضرات سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ وہ ان کی محفلوں، مذاکروں میں پابندی کے ساتھ شرکت کرتی تھیں۔ عطیہ کو تاریخ اسلام پر یوسف علی کے لیکچر اس قدر محبوب تھے کہ وہ ان کے لیے دوسری محفلوں میں شرکت کرنے سے معذرت کر لیتی تھیں۔

عطیہ فیضی جس وقت لندن پہنچیں (1906) اس وقت ان کی عمر تیس برس تھی۔ اقبال سے لندن میں عطیہ کی پہلی ملاقات اپریل 1907 میں ہوئی جب وہ بیگم بلگرامی اور سید علی بلگرامی کی طرف سے انھیں کیمبرج آنے کی

دعوت دینے آتے ہیں۔ پونے کے یہودی مصور سیموئیل رحمین سے ان کی ملاقات لندن میں ہوتی ہے۔ وہ عطیہ سے عمر میں آٹھ برس چھوٹے تھے۔ ان کی ملاقاتیں کسی رومانی گوشے کے بجائے لندن کے سب سے بڑے کتاب گھر Foyels میں ہوتی ہیں۔ عطیہ ان سے کہتی ہیں کہ وہ مسلمان ہوجائیں تو وہ ان سے شادی کرلیں گی۔ سیموئیل مسلمان ہوکر ایس فیضی رحمین بن جاتے ہیں۔ 1912 میں دونوں کی شادی ہوجاتی ہے۔ غالبًا اقبال کی تیسری شادی اس کا سبب رہی ہوگی۔ شادی کے بعد عطیہ کبھی لندن اور کبھی یورپ کا سفر کرتی نظر آتی ہیں۔ 1918 میں وہ امریکہ جاتی ہیں اور وہاں ایک برس گزارتی ہیں۔ 1930 کی دہائی میں وہ اور سیموئیل رحمین تین برس تک یورپ کے مختلف شہروں میں قیام کرتے ہیں۔ لندن میں وہ اپنے شوہر کے لکھے ہوئے ڈراموں کو اسٹیج کرتی ہیں۔ ہندوستانی موسیقی پر امریکہ اور یورپ میں لیکچر دیتی ہیں۔ مصوری اور ہندوستانی خواتین کی دستکاری کی نمائشوں کا اہتمام کرتی ہیں۔ تھیٹر اور موسیقی سے عطیہ کو بے حد دلچسپی تھی اور ایسی محفلوں میں جانا انھیں پسند تھا۔ عطیہ فیضی نے تین براعظم گھومے اور چین، جاپان، فلپائن، فرانس، جرمنی، اٹلی اور امریکہ وغیرہ کا سفر کیا۔ ہندوستان میں انھوں نے جنجیرہ، کلکتہ، کھیم، علی گڑھ، احمد آباد، جے پور، آگرہ، دلی، امرتسر، لاہور، راولپنڈی، سرینگر، بھوپال، بڑودہ، بنارس اور ان کے علاوہ دوسرے چھوٹے بڑے شہروں کے سفر کیے جن میں لکھنؤ بھی شامل ہے۔

تقسیم اور قیام پاکستان کے وقت عطیہ فیضی قاہرہ میں تھیں (عطیہ کے عزیز آصف علی اصغر فیضی ہندوستان کے سفیر مقرر ہوئے تھے۔ یہ مشہور فلمی کہانی کار آغا جانی کشمیری کے ہم زلف تھے) قاہرہ سے وہ واپس بمبئی آئیں اور اپنی بہن نازلی بیگم (جن کے اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنے شوہر نواب جنجیرہ سے تعلقات خراب ہوگئے تھے) اور شوہر فیضی رحمین کے ساتھ کراچی پاکستان کا رخ کیا۔ اس وقت ان کی عمر 70 برس کی ہوچکی تھی۔ حکومت کی طرف سے انھیں برنس گارڈن کے عقب میں ایک قطعہ زمین دیا گیا جس پر انھوں نے اپنے پیسوں سے ایک گھر تعمیر کرایا اور 'تھری آرٹ سرکل' کے تحت ادب اور موسیقی کی محفلوں کا آغاز کیا۔ 1951 میں برٹش کونسل کے تعاون سے 'اقبال ڈے' کا اہتمام کیا۔ اقبال کے خطوط کی اشاعت سے ان پر یہ الزام بھی لگا کہ وہ اقبال کو اپنی شہرت کے لیے استعمال کررہی ہیں۔ حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ ان سے اپنا ہی گھر یہ کہہ کر چھین لیا گیا کہ وہ اس پر ناجائز طور سے قابض ہیں۔ پہلے یہ لوگ ایک اچھے ہوٹل میں منتقل ہوئے۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہونے کی بنا پر لباس وزیور فروخت ہوئے۔ فرنیچر بکا، اس کے بعد ایک معمولی ہوٹل میں عطیہ رہنے پر مجبور ہوئیں۔ 'ایوانِ رفعت' جیسی شاندار عمارت کے رہنے والوں کا کراچی میں یہ حال ہوا کہ تقدیر نے انھیں سڑک پر بٹھا دیا۔ 1964 میں عطیہ کے شوہر فیضی رحمین کا انتقال ہوا۔ پھر جو عطیہ پر گزری اس کے لیے مولانا طاہر القادری نے اپنے رسالے 'فاران' میں لکھا ہے:

''میں نے عطیہ بیگم کو ایک پرانے دوست سے پچاس روپے مانگتے دیکھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ صاحب انھیں خاموشی سے سو روپے نذر کرکے اٹھ گئے۔''

عطیہ کی زندگی کے آخری دنوں کی کہانی جس طرح دھیرے دھیرے اپنے انجام کی طرف بڑھتی رہی وہ عطیہ سے زیادہ اس دنیا کی بے رخی اور سفاکی کی کہانی ہے جس نے ان کا سب کچھ چھین لیا۔ آخر تنہائی اور تلخی کا زہر پیتے پیتے 90 برس کی عمر میں عطیہ چل بسیں۔ جناح اسپتال میں ان کی موت سے چند دن پہلے ریڈیو پاکستان کے ایک نمائندے ایس ایس سلیم نے ان کا انٹرویو کیا ان کے بقول ''عطیہ دنیا سے خوش خوش گئیں... انھیں زندگی سے پیار کرنا آتا تھا۔ وہ مرتے مرتے ورثے میں خوشیاں دے گئیں... اور اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ اپنی قوم کے حوالے کرگئیں۔'' حالانکہ عطیہ کے جاننے والے بخوبی جانتے ہیں کہ عطیہ تو اسی دن مرگئی تھیں جس دن 'تھری آرٹ سرکل' (گھر) سے انھیں بے دخل کیا گیا تھا۔ اس کے بعد تو عطیہ کی دربدری اور بے گھری تھی۔ عطیہ کے مرنے کے بعد دو برس تک ان کی بہن نازلی بیگم زندہ رہیں۔ پھر وہ بھی چل بسیں اور فیضی خاندان کا آخری ورق بھی کہیں وقت کے دھندلکوں میں گم ہوگیا۔

شبلی اور اقبال سے عطیہ کے جو مراسم تھے ان پر سب سے زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اور لکھنے والوں نے کون سی ایسی تہمت ہے جس کا بکھان نہ کیا ہو۔ نصر اللہ خاں نے عطیہ فیضی کے شخصی خاکے میں لکھا ہے کہ عطیہ کس طرح اکیلی بمبئی سے بذریعۂ ریل شبلی سے ملنے لکھنؤ پہنچتی ہیں۔ اسٹیشن پر شبلی انھیں لینے آتے ہیں۔ الگ الگ یکّے پر بیٹھ کر وہ شبلی کے ساتھ ان کے گھر پہنچتی ہیں۔ شبلی کی بیوی اور ان کی لڑکی سے وہ اس قدر گھل مل جاتی ہیں کہ ان کے ساتھ مل کر ڈھولک پر ساون کے گیت گاتی ہیں۔ وہ ایک ہفتے وہاں قیام کرتی ہیں۔

اور تو اور نصر اللہ خاں نے اس خاکے میں یہاں تک لکھ دیا کہ ''عطیہ اور قلوپطرہ کی داستان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قلوپطرہ ایک ملک کی حکمراں تھی۔ اس کے دام محبت میں سیزر اور انطونی اس طرح پھنسے جیسے مکڑی کے جال میں میاں مکھی پھنس جاتی ہے۔ عطیہ کی زلف گرہ گیر کے گرفتار بڑے بڑے دانش ور تھے۔ وہ دلوں کی ملکہ تھیں۔'' لیکن اسی کے ساتھ انھیں یہ بھی اعتراف کرنا پڑا کہ عطیہ کی سفارش کی بنا پر ہی بیگم بھوپال نے شبلی کو 'سیرۃ النبی' کے لیے ہر قسم کا تعاون دیا۔ عطیہ نے ان کو بتایا کہ:

''سیرت النبیؐ کے سلسلے میں نواب صدیق حسن خاں اور ریاست بھوپال کی حکمراں نواب سلطان جہاں بیگم کو انھوں نے اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ مولوی شبلی سے حضورؐ کی سیرت پاک پر کتاب لکھوائیں۔ اور مولوی صاحب نے عطیہ کو اس کام پر آمادہ کیا تھا۔ چنانچہ سیرت پر غیر زبانوں میں جتنا کام ہوچکا تھا اس کے ترجمے عطیہ نے کروائے تھے۔ واللہ اعلم۔'' اور

''نواب سلطان جہاں بیگم کے بارے میں عطیہ بیگم یہ کہا کرتی تھیں کہ اگر بیگم صاحبہ چاہتیں تو بڑے بڑے نوابوں اور نواب زادوں کے رشتے موجود تھے لیکن انھوں نے ایک عالم بے بدل مولوی نواب صدیق حسن خاں سے شادی کی جن کے پاس علم کی دولت کے سوا اور کچھ نہ تھا اور بیگم صاحبہ ان کی اسی طرح خدمت کرتی تھیں جس طرح اس زمانے کی ایک عام عورت اپنے شوہر کی کیا کرتی تھی۔ بیگم صاحبہ ایک باپردہ خاتون تھیں۔''

شبلی اپنے خطوط میں عطیہ کی صلاحیتوں کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔ کبھی لکھتے ہیں ''میری لڑکی تمھارے خط پڑھ کر سخت حیرت زدہ ہوتی ہے کہ اس قابلیت کی بھی عورتیں ہوتی ہیں'' کبھی ان کی بہن نازلی بیگم کو لکھتے ہیں ''آپ اور عطیہ جیسی اردو لکھ لیتی ہیں کاش ہمارے صوبے بھر میں کوئی خاتون لکھ سکتیں'' کبھی اپنی کسی کتاب کو عطیہ کے نام معنون کرنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔ کبھی انھیں موسیقی کی کتاب 'قانون موسیقی' بھجواتے ہیں۔ انھیں پارسی اور ہندو خواتین کی طرح لیکچر دینے پر اکساتے ہیں اور کبھی انھیں فارسی پڑھانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔

شبلی، عطیہ سے بیس برس بڑے تھے لیکن وہ انھیں ایک پرانی تصویر تیس برس کی عمر کی بھیجتے ہیں۔ جس کی بعد میں عطیہ نے اپنے مصور شوہر سیموئیل رحمین سے ایک نقل بنوائی۔ شبلی مولانا ابوالکلام آزاد کو اس تصویر کے بارے میں مطلع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہاں عطیہ فیضی کے یہودی شوہر نے جو آرٹسٹ ہے، میری تصویر ہاتھ سے کھینچی ہے ابھی پوری طرح تیار نہیں ہو چکی ہے۔ میں اس کا فوٹو لے کر آپ کو بھیجوں گا۔'' (بنام مولانا ابوالکلام آزاد، 20 اگست 1913)

سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں بھی اس تصویر کا ذکر آیا ہے۔ شبلی نے لکھا ہے:

''ایک نہایت استاد آرٹسٹ یہودی نے (جواب مسلمان ہے) اپنی خواہش سے میری تصویر ہاتھ سے کھینچی ہے۔ ابھی پوری تیار نہیں ہوئی۔ آجائے تو اس کا فوٹو لیا جائے۔'' (بنام سید سلیمان ندوی، 22 اگست 1913)

اس تصویر میں شبلی عبا پہنے کھڑے ہیں۔ سر پر عمامہ ہے۔ بائیں ہاتھ میں رول کیا ہوا کاغذ۔ داہنی جانب طاق میں تین کتابیں رکھی ہیں۔ ان کتابوں کے اوپر شعرالعجم دیوار کے سہارے کھڑی ہے۔ یہ تصویر پہلے عطیہ کے 'ایوان رفعت' کی زینت بنی۔ ایوان رفعت کے فروخت (1942) ہونے کے بعد بڑودہ میوزیم گجرات کی تحویل میں آگئی۔ 1913 میں فرانس کی ایک نمائش میں یہ تصویر رکھی گئی۔ کئی مصوری کے قدردانوں نے اس تصویر کو خریدنا چاہا مگر عطیہ راضی نہیں ہوئیں۔ رحمین کی بنائی ہوئی کچھ اور تصویریں لندن کی Tate گیلری میں آج بھی موجود ہیں۔

اقبال کے بارے میں عطیہ کی کتاب جو ان کے خیالات اور اقبال کے خطوط پر مشتمل ہے، ایسی بہت سی باتیں ہیں جو اقبال کو انسان سے زیادہ فرشتہ بنانے والوں کو اتنی ناگوار گزریں کہ پاکستان میں ان کی زندگی اجیرن کردی گئی۔ برابری کی سطح پر مکالمہ اور وہ بھی مفکر پاکستان سے؟ یہی وہ جرم تھا جس کا خمیازہ عطیہ کو اس طرح بھگتنا پڑا کہ انھیں پاکستان میں وہ عزت نہیں دی گئی جس کی وہ ان تمام لوگوں سے زیادہ مستحق تھیں جو اس وقت علامہ، علامہ کی رٹ لگائے ہوئے تھے۔ عطیہ کا یہ لکھ دینا گویا قیامت تھا۔

ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد اقبال کے خطوط سے صرف اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ''علامہ نے عطیہ فیضی کو 35 عشقیہ خطوط لکھے تھے اور وہ بے چاری ساری زندگی ان کے انتظار میں بیٹھی رہی جب کہ علامہ نے تین تین شادیاں کر ڈالیں۔'' حالانکہ ان خطوط میں علمی بحثیں، معاشی پریشانیوں کا ذکر، ذاتی نوعیت کی باتیں، گھریلو تلخیوں کے اظہار سے لے کر خودکشی کی خواہش تک وہ تمام باتیں موجود ہیں جو اقبال نے لکھی ہیں۔ دسمبر 1911 کے بعد دونوں کے درمیان خط و کتابت شاید مکمل طور پر موقوف رہی کیونکہ اس کے بعد دونوں اپنی اپنی زندگیوں میں گم سے ہو گئے۔

ہندوستان واپس آنے کے بعد بھی عطیہ اور اقبال کی خط و کتابت کا سلسلہ 1911 سے کچھ پہلے تک اس طرح جاری رہتا ہے کہ اقبال اپنے معاشی مسائل کے لیے عطیہ کو لکھتے ہیں۔

وہ حیدرآباد دکن کے دربار کی طرف دیکھتے ہیں۔ اس وقت عطیہ کے کزن اکبر حیدری جو بعد میں سر اکبر حیدری ہوئے حیدرآباد میں وزیر مالیات کے عہدے پر فائز تھے۔ اقبال، عطیہ سے اکبر حیدری اور ان کی بیگم کے نام تعارفی خط دینے کی فرمائش کرتے ہیں۔ عطیہ ان کی اس فرمائش کو نہیں ٹالتیں اور ایک تعارفی خط بھیج دیتی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اقبال پر اپنی کتاب میں لکھتی ہیں کہ:

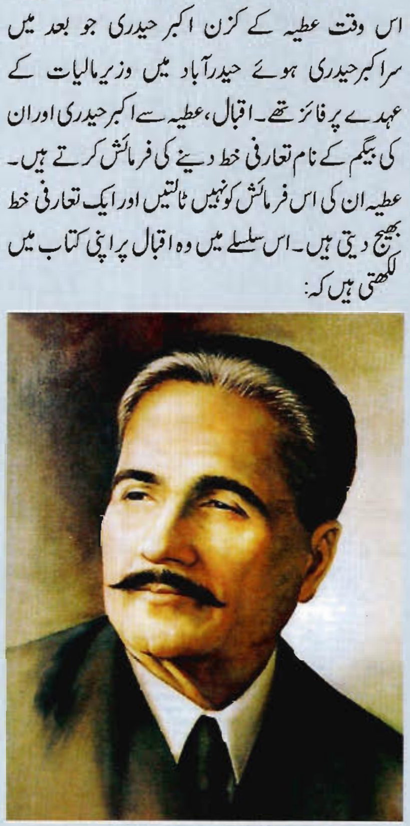

''مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال حیدرآباد سے مسحور ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ اس چمک دمک کا شکار ہوجائے جو باہر والوں کے لیے ہندوستانی ریاستوں میں موجود ہے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہاں جاکر اقبال اپنی فطانت کو کسی بڑے مقصد پر صرف کرنے کے بجائے ادنیٰ باتوں میں ضائع کردے گا۔''

عطیہ نے یہ بھی لکھا کہ:

''مجھے معلوم تھا کہ اسے مالی مشکلات درپیش ہیں اور اس مشکل میں آیا ہوا انسان اپنے رستے میں آئے کسی بھی تنکے کا سہارا لے گا۔ اس لیے میں نے اسے سختی سے ملامت کی۔ مقصد یہ تھا کہ وہ ریاستی ترغیب و تحریص کا شکار نہ ہو۔''

حیدرآباد سے واپسی پر اقبال نے ایک طویل خط عطیہ کو لکھا جس میں اکبر حیدری اور ان کی بیگم کی خاطر داریوں کا شکرگزاری کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ 7 اپریل 1910 کے اس خط میں عطیہ کی ناراضگی کو 'عتاب شیریں' کا نام دیتے ہوئے گزرے ہوئے دنوں کی یاد کا احساس بھی دلایا ہے۔

دسمبر 1911 میں اقبال انھیں اپنی کئی غیر مطبوعہ نظمیں بھیجتے ہیں اور 14 دسمبر 1911 میں اپنی نظم 'نوائے غم' ارسال کرنے کے ساتھ اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ ''میں نے اس بحر میں پہلے کبھی نہیں لکھا۔ یہ نہایت مترنم ہے۔ میری تمنا ہے کہ میں وہاں ہوتا تو آپ کو اور بیگم صاحبہ (نازلی بیگم) کو اسے ترنم سے سناتا۔''

اقبال سے ضیاءالدین برنی کی آخری ملاقات بمبئی میں ستمبر 1931 میں ہوئی جب وہ دوسری گول میز کانفرنس سے واپس تشریف لائے تھے اور خلافت ہاؤس میں مقیم تھے۔ رفیع الزماں زبیری نے اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے روزنامہ ایکسپریس کے کالم 'کتابوں کی باتیں' میں لکھا ہے کہ ان ہی دنوں عطیہ بیگم فیضی نے انھیں اور چند ممتاز شخصیتوں کو اپنے گھر ایک سہ پہر کو چائے پر مدعو کیا۔ برنی لکھتے ہیں ''ڈاکٹر صاحب کو جتنا مسرور میں نے اس سہ پہر کو دیکھا اتنا کبھی نہیں دیکھا۔ وہ عطیہ بیگم سے ہنس ہنس کر مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ مزاحیہ جملے بھی کستے جا رہے تھے۔ دوران گفتگو عطیہ بیگم نے کہا ''اقبال یاد رکھو بچے کے لیے ماں کی گود سب سے بڑی تربیت گاہ ہے۔'' اس پر ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر پوچھا ''اور بیوی کی گود کے بارے میں کیا ارشاد ہوتا ہے؟'' عطیہ بیگم نے انھیں جھڑک کر خاموش کردیا۔

عطیہ اور اقبال کے تعلقات کو محض 'عشق' تک محدود کرنے والوں نے یہ سوچنے کی کبھی زحمت ہی نہیں کی کہ ان کے تعلقات میں وہ باتیں زیادہ اہم ہیں جن کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے قریب آئے۔ اقبال سے عطیہ کی پہلی ملاقات اپریل 1907 میں اس وقت ہوتی ہے جب وہ سید علی بلگرامی کی طرف سے انھیں کیمبرج آنے کی دعوت دینے آتے ہیں اور خاص طور پر ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ عطیہ لکھتی ہیں کہ 'اس سے پہلے میں نے اقبال کے متعلق کچھ نہیں سنا تھا۔'' جب کہ اس ملاقات میں اقبال عطیہ سے یہ کہتے ہیں کہ ''تم اپنے سفرنامے کی وجہ سے لندن اور ہندوستان میں مشہور ہو چکی ہو۔'' یہ اشارہ 'تہذیب نسواں' میں شائع ہونے والے روزنامچے کی طرف ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اقبال کی نظر سے بھی گزرا ہوگا۔ اس کے بعد کے خطوط اور ملاقاتوں میں وہ کبھی انھیں فارسی نظم بھیج کر اس پر 'تنقیدی رائے' طلب کرتے ہیں۔ کبھی اپنی اردو کتاب 'علم الاقتصاد' پیش کرنے کے خواہاں ہیں اور کبھی یہ چاہتے

ہیں کہ وہ کلیات بابا فغانی ضرور پڑھیں۔ عطیہ پروفیسر آرنلڈ اقبال کے استاد کی دعوت پر ان مختلف محفلوں میں شریک ہوتی ہیں جس میں اقبال بھی موجود ہیں اور جہاں فلسفے کی جرمن کتابوں اور عربی کتابوں پر گھنٹوں بحثیں ہوتی ہیں۔ اس تناظر کے بعد یہ بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ اقبال عطیہ سے کیوں متاثر تھے۔ یہ عطیہ ہی تھیں جو اقبال کو حیدرآباد جانے سے اس لیے روکتی ہیں کہ وہاں جاکر اقبال اور ان کی شاعری پر برا اثر پڑے گا اور 'شاعر مشرق' کی آواز دربار کی دوسری آوازوں میں گم ہوکر اپنا فکری ارتقا کھو بیٹھے گی۔

عطیہ فیضی کو سمجھنے کے لیے ان تمام دنیاؤں کا سفر کرنا پڑے گا جہاں جہاں وہ گئیں اور جہاں جہاں انھوں نے اپنے ہونے کا احساس دلایا۔ 1906 میں کسی مسلم لڑکی کے لیے تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے گھر سے نکلنا اور ہندوستان کے باپردہ مسلم معاشرے سے لندن آنا ایک اہم خبر تھی۔ اسی اہمیت کے مدنظر 'لیڈیز پکٹوریل' کے ایڈیٹر کی نظر ان پر پڑتی ہے۔ ایڈیٹر کی فرمائش پر وہ انٹرویو دیتی ہیں اور ان کی کئی تصویریں کھینچ لی جاتی ہیں۔ اپنے ٹریننگ کالج میں وہ پروجیکٹر کی مدد سے تصویریں دکھاتی ہیں اور ہندوستان پر لیکچر دیتی ہیں۔ وہ باقاعدگی سے اپنے روز و شب کی روداد 'تہذیب نسواں' میں لکھتی ہیں۔ کبھی وہ ڈارون کے نظریۂ ارتقا کے بارے میں تہذیبی بہنوں کو بتاتی ہیں اور کبھی تعلیم کے بارے میں یونان کے فلسفیوں کے نظریات کا ذکر کرتی ہیں۔ برٹش لائبریری کی کتابوں کی تفصیل بیان کرتی ہیں۔ پارلیمنٹ ہاؤس جاکر وہاں کی کارروائی سنتی ہیں۔ گرجا گھر جاکر عیسائی عبادت کے طریقوں کا مشاہدہ کرتی ہیں۔ کیکسٹن ہال میں ہونے والی ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک ہوتی ہیں۔ لندن کی ہندوستان اور غیر ہندوستانی خواتین کی محفلوں میں شرکت کرتی ہیں۔ کیمبرج کی سیر کرتی ہیں۔ ہندوستانی موسیقی پر یورپ اور امریکہ میں لیکچر دیتی ہیں۔ مصوری اور ہندوستانی خواتین کی دستکاری کی نمائشوں کا اہتمام کرتی ہیں۔ ڈرامے اسٹیج کرتی ہیں۔ ہندوستان میں بھی وہ ان تحریکوں میں پیش پیش ہیں جہاں کم سنی کی شادی اور تعلیم کے ساتھ ساتھ طبقۂ نسواں خاص کر مسلم عورت کے حقوق آزادی کی بات ہوتی ہے۔

سرسید نے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ کے قیام کا منصوبہ بنایا۔ 24 مئی 1875 کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا افتتاح عمل میں آیا۔ ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' قائم کی۔ اس کا پہلا اجلاس دسمبر 1886 میں علی گڑھ میں ہوا۔ اس کے بعد اس کے سالانہ اجلاس 1945 تک ہوتے رہے۔ اس کانفرنس کے اغراض و مقاصد مسلمانوں کی تعلیم کے لیے وقف تھے مگر ان میں مسلم خواتین کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ سرسید ترقی پسند ذہن رکھنے کے باوجود مسلم خواتین کی تعلیم جیسے اہم مسئلے سے کنارہ کش تھے اور نہ ہی عورتوں کے کانفرنس میں شریک ہونے کے روادار تھے۔ 1926 کی 'محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس' میں عورتوں کو شریک ہونے کی اجازت نہ ملی تو اس کے اگلے برس عطیہ اور ان کی بہن زہرہ بمبئی سے دلی گئیں اور کانفرنس کے پنڈال میں پہنچیں۔ عورتیں پردے کے پیچھے تھیں۔ عطیہ پہلے تو پردے کے پیچھے سے تقریر کرتی رہیں لیکن جب انھیں تقریر کرنے سے روکنے کی کوشش کی گئی تو وہ پردہ ہٹاتے ہوئے اسٹیج پر بے پردہ

نمودار ہوئیں اور اپنی بے مثال تاریخی تقریر کی۔ انھوں نے پوچھا ''کیا علی گڑھ نے واقعی اپنی ذمہ داریاں پوری کی ہیں؟ علی گڑھ نے اپنی تنگ نظری، خودستائی اور یک طرفہ پالیسی ترک نہیں کی۔ اس نے خود کو بھی فریب دیا اور لوگوں کو بھی۔'' پھر انھوں نے عورتوں کی تعلیم کے لیے آواز بلند کی۔ اس ہنگامے کے بعد عورتوں نے اس اجلاس میں پوری طرح شرکت کی۔

ان کی اس تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے حسین بلگرامی کے ایک دوست نے انھیں لکھا ''بمبئی کی عطیہ نے کانفرنس کے سکریٹری کی بھی پروا نہیں کی۔ وہ بے پردہ تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ اللہ کی سرزمین پر انھیں بھی چلنے پھرنے کے وہی حقوق حاصل ہونے چاہئیں جو مردوں کو حاصل ہیں۔''

ہم نے اس عطیہ فیضی کو بھلا دیا جو تمام عمر حقوق نسواں کی بات کرتی رہی اور اگر یاد بھی رکھا تو اس طرح کہ:

''عطیہ حسن پرست اور عاشق مزاج تھیں۔ بمبئی میں وہ ساحل سمندر پر، جب چاند کی چودھویں ہوتی، تو ایک پارٹی کرتیں جس میں حسین عورتیں اور خوش رو جوان سپید لباس پہن کر جمع ہوتے... پھر ساحل سمندر پر ساز کے ساتھ چاند اور چاندنی کے گیت گائے جاتے۔ آپس میں چہلیں بھی ہوتیں۔ چاندنی رات کی موسیقی عطیہ بیگم خود ترتیب دیتیں... عطیہ صورت شکل سے جادوگرنی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ مصر بھی گئیں اور فراعنۂ مصر کے زمانے کی تہذیب کی تاریخ کے سلسلے میں ان کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ وہ اس زمانے کے راگ راگنیوں کی شکلیں امراؤ بندو خاں اور دوسرے گانے والوں اور گانے والیوں کو بتاکر ان سے گواتیں۔ اور یوں لگتا جیسے ہم فراعنۂ مصر کے زمانے کے مصر میں پہنچ گئے ہیں... عطیہ کی شخصیت انتہائی پراسرار تھی... اس کے فتراک میں ایسے نخچیر بھی تھے جو اس کے قیمتی پتھروں اور بے مثال جواہرات سے زیادہ نادر تھے اور جن کو شکار کرنا عطیہ کے علاوہ اور کسی کے بس میں نہیں تھا...'' (کیا قافلہ جاتا ہے، نصر اللہ خاں، ص 118-119)

The Music of India (1913) جیسی موسیقی کی بیش قیمت کتاب لکھنے والی، بھٹ کھنڈے کے تعاون سے دلی کا بھٹ کھنڈے کالج آف میوزک قائم کرنے والی، اقبال کو نظام حیدرآباد کے دربار سے دور رکھنے والی اور شبلی کو سیرت النبیؐ کی اشاعت کے لیے سلطان جہاں بیگم سے ہزاروں روپے دلوانے والی عطیہ فیضی کی داستان حیات کا ایک ایک ورق شاہد ہے کہ اب سے ایک صدی پہلے کی اس عورت نے عورتوں کی تعلیم، ان کے حقوق آزادی اور معاشرے میں ان کی عزت کی آواز اس وقت اٹھائی جب مسلم معاشرے میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ یہ ایک ناقابل معافی جرم تھا۔ عطیہ فیضی نے یہ جرم کیا اور برسرعام اس کا اعلان بھی کیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ عطیہ نے اس کی قیمت بھی ادا کی۔ ایک غلط سیاسی فیصلے کے نتیجے میں انھوں نے جو کچھ سہا اور برداشت کیا وہ ان کے اسی 'گناہ' کی سزا تھی اور سزا بھی ایسی کہ جس پر کف افسوس ملنے والا بھی اب کوئی نہیں۔

■

Waqar Nasri, Sheesh Mahal, Husainabad, Lucknow - 226003 (UP)

منور حسن کمال

اثر خیز صحافت کے علم بردار
ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خان (پ: 17 جنوری 1874، م: 27 دسمبر 1904) اپنے وقت کے عظیم صحافی، جید عالم دین، معتبر مؤرخ اور صاحب طرز ادیب و مترجم تھے۔ ان کی تحریروں میں مشرقی مزاج رچا بسا تھا۔ انھوں نے مشرقی تہذیب کی خوبیوں اور خرابیوں کا بڑے مؤثر اور دلنشیں انداز میں موازنہ کیا ہے۔ مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لیے انھوں نے اپنے اخبار 'زمیندار' کے توسط سے قوم کی جو خدمت کی ہے، اس کی مثال بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد شاہد حسین:

''صحافت کی وادیِ پرخار میں اپنی شکستہ پائی کے باوجود مولانا ظفر علی خاں نے اس استحکام کے ساتھ قدم رکھا کہ کانٹوں کو بھی پسینہ آ گیا۔ وہ ایک حق گو اور بے باک صحافی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے ایک ایسے جری سپاہی تھے، جن کے ذکر کے بغیر ہماری تاریخ آزادی نامکمل رہے گی۔ اپنے اخبار زمیندار میں برطانوی سامراج کے استحصال، جارحانہ عزائم اور اس کی سیاسی چالوں کے خلاف آواز بلند کرنے کی پاداش میں انھوں نے اپنی قیمتی زندگی کے چودہ برس جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارے اور آزادی کے متوالوں کو دی جانے والی سخت سزاؤں کی صعوبتیں برداشت کیں۔ زمیندار پندرہ مرتبہ بند ہوا۔ زمیندار کو ضبط کرنے اور ان کی گرفتاریوں کے سبب اس زمانے میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے کا جرمانہ ادا کیا۔ برطانوی حکومت اپنی تمام تر جارحیت کے باوجود مولانا ظفر علی خاں کو حق گوئی سے نہ روک سکی۔'' (زمیندار اور ظفر علی خاں، ابلاغیات، محمد شاہد حسین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2004، ص 106)

دراصل علامہ شبلی نعمانی کی شاگردی نے ان میں مشرق سے محبت، اسلامی تاریخ کے مطالعے کا شوق، نماز کی لگن اور عالم اسلام سے محبت سکھائی، وہیں اپنا سیاسی مزاج بھی گھٹی کی طرح مولانا ظفر علی خاں کو گھول کر پلایا۔ شبلی نعمانی اپنا ایک الگ سیاسی مزاج رکھتے تھے۔ استاد اور شاگرد دونوں راجپوت تھے۔ یہ راجپوتی رنگ اسلام کی بھٹی میں نکھرا اور پھر مولانا ظفر علی خاں نے اسی سیاسی رنگ کو اپنے اخبار زمیندار کے ذریعے ملک کی آزادی کے لیے صرف کیا۔ انھوں نے محسوس کرلیا تھا کہ اسلام کو مٹانے کے لیے صلیبی تحریکیں اپنی پوری قوت صرف کررہی ہیں۔ ان صلیبی تحریکوں نے جن جن ممالک کو نقصان پہنچایا، ظفر علی خاں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہوگئیں اور وہ اپنی شاعری اور صحافت کے ذریعے اس مظلوم طبقے کی حمایت میں آگے آئے اور اپنے زور قلم سے ایسے ایسے مضامین قلم بند کیے کہ ان کی گونج دور تک سنائی دی۔

1902 میں ظفر علی خاں حیدرآباد سے واپس آنے کے بعد پوری طرح صحافت کے ہوگئے اور اپنے اثر انگیز مضامین کے ذریعے مسلمانوں کی خدمت کو انھوں نے اپنا اہم مشن بنالیا۔ ان کے اخبار کا مقصد قومی مفادات کا تحفظ تھا، پھر وہ 1911 میں زمیندار کو کرم آباد سے لاہور لے آئے۔ غیر منقسم ہندوستان کے پنجاب کے دارالحکومت لاہور میں اہل علم و دانش کی مجلسوں نے انھیں عمل کے میدان میں نئے راستے دکھائے۔ یہاں چودھری سر شہاب الدین مرحوم کی زیرکی اور ان کی سوجھ بوجھ نے ظفر علی خاں کو میدان سیاست کے نئے جغرافیے سے روشناس کیا۔ اس طرح لاہور کے مستقل قیام کے دوران ان کے قلم میں مزید جولانی آگئی اور انھوں نے اپنے خوب جوہر دکھائے۔ تقریر کے تو وہ پہلے ہی سے بادشاہ تھے، اب تحریر بھی دوآتشہ ہوگئی۔ ان کی سیاست کا رنگ شروع ہی سے حریت و آزادی کی جانب تھا۔ آہستہ آہستہ ان کے قلم نے زمیندار کو ایک نیا جوش اور ولولہ عطا کردیا۔

یکم مئی 1911 کو 'زمیندار' کا لاہور سے پہلا شمارہ نکلا۔ اس تبدیلی سے متعلق مولانا عبدالمجید سالک اس طرح رقم طراز ہیں:

''زمیندار پنجاب کے زراعتی طبقے کا ترجمان تھا، لیکن مولانا ظفر علی خاں اس کو پوری ملت کی زبان بنانا چاہتے تھے، چنانچہ اس ہفتہ وار اخبار کو کرم آباد سے لاہور لے آئے اور اس کو روزنامہ کی صورت دے کر ادب و انشا کے محاسن کا گل دستہ بنادیا۔ یہ اخبار بینوں کے لیے ایک نادر نعمت تھی۔ وہ پیسہ اخبار اور وطن کی سادہ، متین اور ٹھنڈی صحافت پر اکتفا کررہے تھے۔ 'زمیندار' نے ان کے سامنے رنگارنگ نعمتوں کا ایک خوان چن دیا اور اپنی پرزور خطابت سے اخبار کو تقویت دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا ٹوٹ پڑی اور ہر طرف زمیندار اور اس کے مدیر کے کمالات کا غلغلہ بلند ہوگیا۔''

مولانا ظفر علی خاں مزاج کے بڑے تیز تھے۔ ہمیشہ

تیز چلتے تھے، تیز بولتے تھے اور تیز ہی لکھتے بھی تھے۔ اشعار کہنے میں بھی ان کے تیزی تھی۔ اپنے اخبار کے اداریے اور فکاہیہ بھی بہت تیز لکھتے تھے۔ مسلمانوں کی پسماندگی دور کرنے کے لیے انتھک کوششیں کرتے۔ وہ یہ بات اچھی طرح محسوس کر چکے تھے کہ مسلمان غیر مسلم طاقتوں کے محکوم ہیں اور ان کے خلاف خفیہ چالیں چلی جارہی ہیں۔ سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے یہ طاقتیں مسلمانوں کو ترقی کی دوڑ سے پیچھے رکھنے کے لیے مستقل سرگرم عمل تھیں۔ مولانا ظفر علی خاں اپنے سیاسی تجربات اور قلمی امتیازات سے مسلمانوں کو اقتصادی پستی سے نکالنا چاہتے تھے۔ وہ بے حد حساس تھے اور یہی احساس انھیں سرمایہ دارانہ نظام اور برطانوی سامراج کو شکست دینے کے لیے تحریر و تقریر دونوں سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار رکھتا تھا۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ مسلمان اقتصادی میدان میں اپنے دیگر قومی بھائیوں سے پیچھے نہ رہیں اور ان کی الگ شناخت ہو تاکہ سیاسی میدان میں بھی وہ پوری طرح ان سے شانہ بشانہ رہیں۔

'زمیندار' جس کی تعداد اشاعت چند سو تھی، ظفر علی خاں کی محنت اور زور قلم کے نتیجے میں زمیندار مقبول ہوتا گیا اور اس کی تعداد اشاعت میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ زمیندار کی پیشانی پر قرآن کریم کی آیت "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِم۔ (سورۃ الرعد: 11) (بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس قوم کی حالت نہیں بدلتا، جو خود اپنی حالت بدلنے کی کوشش نہیں کرتی) لکھی ہوئی تھی، جس کو ظفر علی خاں نے درج ذیل شعری جامہ پہنادیا:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

ظفر علی خاں جب مرکز علم و دانش حیدرآباد میں تھے

> 13 اگست 1913 کو مسجد کان پور کا حادثہ پیش آیا، جہاں ایک سڑک کو سیدھا کرنے کے لیے مسجد کے غسل خانے کو منہدم کر دیا گیا تھا اور مزاحمت کرنے والوں کا بے دریغ خون بہایا گیا تھا۔ اس حادثۂ جانکاہ میں شہید ہونے والوں میں مسلمان بچے، بوڑھے اور جوان سبھی شامل تھے۔

تو ان کی علمی سرگرمیاں انھیں شہرت کے آسمانوں میں لے جانے لگی تھیں۔ انھوں نے 1898 میں لارڈ کرزن کی کتاب Persian of Gardens کا ترجمہ 'خیابانِ فارس' کے نام سے کیا تو علمی دنیا میں ان کے چرچے زور و شور سے ہونے لگے۔ علمی دنیا اس وقت ششدر رہ گئی جب 1900 میں ظفر علی خاں نے علامہ شبلی نعمانی کی شہرۂ آفاق تصنیف 'الفاروق' کا انگریزی ترجمہ پیش کیا۔ 1902 میں ظفر علی خاں نے ایک علمی و ادبی اور تاریخی رسالہ 'افسانہ' کا اجرا کیا۔ 1903 میں 'دکن ریویو' جاری کیا۔ یہ بھی علمی و ادبی رسالہ تھا۔ (تاریخ ساز جوانیاں مرتب محمد جاوید خالد، اسلامک بک فاؤنڈیشن، دہلی، ص 75,81، 2007)

ظفر علی خاں نے زمیندار لاہور منتقل کرنے کے بعد زمیندار کو کسان اور انقلابی تحریک کا نقیب بنادیا۔ وہ کسان جو جبر و استبداد کا شکار تھے، زمیندار ان کے خیالات کو بھرپور انداز میں عوام کے سامنے لانے لگا۔ انھوں نے اپنی ایک نظم 'نالہ مایوس' کے عنوان سے زمیندار میں شائع کی جس کے بعض اشعار کو کسانوں نے اپنے دل کی آواز جانا:

کہانی دکھ بھری کون آج سنتا ہے کسانوں کی
سنی بھی ہے کسی نے آج تک ان ناتوانوں کی
وہ خود محتاج دیکھے جارہے ہیں کوڑی کوڑی کو
ہے رونق جن کی دولت سے حکومت کے خزانوں کی

اس کے ساتھ ہی ظفر علی خاں کی ادبی، صحافتی، سیاسی اور مجاہدانہ سرگرمیوں کا نیا دور شروع ہوگیا، جس نے برصغیر ہند میں ہلچل پیدا کردی اور ظفر علی خاں ایک مقبول صحافی شمار کیے جانے لگے۔ انھیں قومی تحریک آزادی میں بھی ایک نمایاں مقام ملا۔

مولانا ظفر علی خاں نے 1903 میں 'دکن ریویو' جاری کیا۔ یہ ایک معیاری، علمی، ادبی اور ثقافتی رسالہ تھا۔ یہ بہت مقبول رسالہ تھا۔ اس میں مشرق و مغرب کے خیالات کا امتزاج پیش کیا جاتا تھا۔ اردو ادبیات کو مغربی تنقید کے اصولوں پر جانچا پرکھا جاتا تھا۔ یہ ایک نئی چیز تھی، اس لیے اس کو عوام و خواص نے بڑی قدر و منزلت سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہ سلسلہ یہاں کسی وجہ سے رک گیا۔ پھر اسی رسالہ کو مولانا ظفر علی خاں نے بمبئی سے بھی نکالا، لیکن یہاں وہ مقام نہیں مل پایا۔ مولوی عزیز مرزا نے دوبارہ انھیں حیدرآباد بلایا، پھر دکن ریویو اپنی پرانی شان کے ساتھ جاری ہوا۔ برصغیر ہند کے نامور شعرا اور ادبا کی توجہ اس نے اپنی جانب مبذول کی۔ اس کے لکھنے والوں میں علامہ شبلی نعمانی، اکبر الہ آبادی، مولوی عبدالحق اور سرکشن پرساد شاد وغیرہ شامل تھے۔ (کاروان صحافت: ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، مطبوعہ 1964، ص 119)

ان کی گزر بسر ٹھیک طرح سے ہو رہی تھی، لیکن حالات اس طرح سے بدلیں گے شاید ظفر علی خاں کو بھی اندازہ نہیں تھا۔ حاسدوں اور مخالفوں کی ایک فہرست ظفر علی خاں کے پیچھے لگ گئی تھی۔ سب سے پہلا اعتراض یہ ہوا کہ سرکاری ملازم ہوتے ہوئے ظفر علی خان 'دکن ریویو' کیوں نکالتے ہیں؟ ظفر علی خاں نے فی الفور فیصلہ کیا اور

'دکن ریویو' کی نہ صرف ادارت چھوڑی بلکہ اس کی ملکیت بھی ایک دوسرے شخص کے حوالے کردی۔ (صحافت پاک و ہند میں: ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ص 349)

13 اگست 1913 کو مسجد کان پور کا حادثہ پیش آیا، جہاں ایک سڑک کو سیدھا کرنے کے لیے مسجد کے غسل خانے کو منہدم کردیا گیا تھا اور مزاحمت کرنے والوں کا بے دریغ خون بہایا گیا تھا۔ اس حادثۂ جانکاہ میں شہید ہونے والوں میں مسلمان بچے، بوڑھے اور جوان سبھی شامل تھے۔ ظفر علی خاں کب خاموش بیٹھنے والے تھے، انھوں نے اپنی تقریروں اور اخبار کے ذریعے اس دردناک واقعہ پر اپنے تاثرات کا اظہار بڑی شدت سے کیا۔ حکومت بوکھلا گئی اور 18 ستمبر 1913 کو زمیندار کی ضمانت ضبط کرلی گئی۔ زمیندار کا پریس ضبط کرکے لکھپت جیل لے جایا گیا، جہاں اس سے سرکاری اسٹیشنری چھاپنے کا کام لیا جانے لگا۔ ظفر علی خاں کی گرفتاری کی تیاری ہورہی تھی کہ کسی مخلص نے انھیں آگاہ کردیا اور وہ لندن روانہ ہوگئے۔ لندن پہنچ کر انھوں نے انڈین پریس ایکٹ کے خلاف ایک کھلا خط وزیرِ ہند کے نام لکھا۔ مختلف اراکین پارلیمنٹ سے ملاقاتیں کیں۔ اسی زمانے میں ایک خط ایڈیٹر کامریڈ، محمد علی جوہر کے نام بھی شائع ہوا، جس سے لوگوں کو ان کی وہاں کی سرگرمیوں کا حال معلوم ہوا۔ انھوں نے وہاں قانون مطابع ہند سے متعلق بڑا اہم کام کیا۔ انھوں نے ہندوستان کی سیاست پر تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب تحریر کی، جس میں برطانیہ کی سخت پالیسی پر کڑی تنقید کی گئی تھی۔ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی نے اپنی کتاب مولانا ظفر علی خاں۔ احوال و آثار میں لکھا ہے کہ یہ نسخہ (1986) ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ لندن میں قیام کے دوران برطانیہ کے اربابِ حل وعقد بھی ظفر علی خاں کے سیاسی نقطۂ نظر سے واقف ہوئے۔ ایک سال چند روز کے بعد 5 اکتوبر 1914 کو واپس آئے اور فوراً ہی نظر بند کردیے گئے۔ برطانوی حکومت کی نظر میں وہ دہشت پسند تھے۔ شعلہ بیان مقرر تو تھے ہی، دوسری طرف 'زمیندار' نے کھل کر ترکوں کی حمایت میں حصہ لیا اور کانپور کے المناک سانحہ میں بے گناہ لوگوں پر گولیاں چلائے جانے سے متعلق 'زمیندار' میں باقاعدہ حکومت کے خلاف مہم جاری کردی گئی تھی۔ گویا زمیندار مسلمانوں کی نمائندگی کررہا تھا، اس لیے ان کا شمار دہشت پسندوں میں کیا گیا۔ اگرچہ ملک لال خان کے مطابق ہندوستان میں دہشت پسندی کی تحریک سے براہِ راست ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

(مولانا ظفر علی خاں۔ احوال و آثار، ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی، مجلس ترقی ادب لاہور، ص 106، طبع اول 1986)

اپنی نظربندی سے متعلق ظفر علی خاں لکھتے ہیں:

''سر مائیکل اڈوائر لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کی ستم پیشہ ملوکیت نے 'زمیندار' کو سینہ ور کھلا رکھا تھا اور مجھے نیم نظربندی کی حالت میں اپنا ادبی شوق پورا کرنے کے لیے روزنامہ 'ستارۂ صبح' کی ادارت کے فرائض کی انجام دہی کی اجازت دے رکھی تھی۔ سیاست ان ایام میں میرے لیے شجرِ ممنوعہ کا حکم رکھتی تھی اور ستارۂ صبح کے اوراق صرف غیر سیاسی مضامین کے لیے وقف ہونے پر مجبور تھے، جن سے میں اپنا دل پرچا سکتا تھا۔ میں نے اس کو ہی غنیمت جانا اور اربابِ ذوقِ سلیم کے لیے علم وحکمت کی ایک بستی بسا دی، جس کے بام و در کتاب اور سنت کی روشنی سے جگمگا اٹھے۔ نقلی صوفیوں اور جھوٹے پیروں کا پول ستارۂ صبح میں اس طرح کھولا گیا کہ دنیائے طریقت کے برخود غلط رہنما چیخ اٹھے۔'' (ایضاً، ص 113)

مولانا ظفر علی خاں ستارۂ صبح میں 'فکاہت' اور 'جواہر ریزے' کے عنوانات سے غیر سیاسی موضوعات پر بڑے دلچسپ اور لطیف انداز میں تبصرہ کیا کرتے تھے۔ انھوں نے کرم آباد ہی سے اگست 1910 میں 'دکن ریویو' کی طرز پر ماہنامہ 'پنجاب ریویو' بھی جاری کیا تھا۔

یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کا سیاسی شعور مذہبی بصیرت کے خمیر سے پروان چڑھا تھا، اسی لیے اسلامی ممالک میں معمولی سی بھی سیاسی ہلچل ہوتی وہ ان کے ذہن میں ہلچل مچادیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک خلافت کے علاوہ سلطنت عثمانیہ سے متعلق برطانوی استعماروں کے دیرینہ عناد وبغض کا اپنے اخبار میں کھل کر تذکرہ کرتے تھے۔ سلطنت عثمانیہ کی اسلامی مرکزیت عرب اور ترکوں کے باہمی اتحاد کو برطانوی حکومت نے کس طرح پامال کیا، اس سے متعلق 'زمیندار' اپنی 11 فروری 1922 کی اشاعت میں لکھتا ہے:

''انگریزوں نے عربوں کو ترکوں کے خلاف ابھارنے اور کھڑا کرنے کے لیے یہ تحریک شروع کی کہ عربوں میں قومیت اور عرب نیشنلزم کا جذبہ ابھار دیا اور بالآخر عربوں کو ترکوں کے خلاف کردیا۔ اس مہم کا انچارج انگریز کرنل لارنس کو بنایا۔ جس نے دو سال کی میعاد سے پہلے ہی اپنے نشانہ کو پورا کردیا، اگرچہ اس دو سال کے عرصہ میں کرنل لارنس کو کافی رقم خرچ کرنی پڑی اور ایک حقیقت نگار کے مطابق 20 ہزار اشرفیاں عربوں میں اس کام کے لیے کرنل لارنس نے تقسیم کیں۔'' (مضمون شاہد کمال، ماہنامہ نیا دور، اردو صحافت نمبر، ص 155,156)

زمیندار کا خصوصی کالم 'تیر و تفنگ' اپنے نام کے مصداق مولانا ظفر علی خاں کے دھاردار طنز کے لیے مشہور تھا۔ یہ کالم اردو کی ادبی اور صحافتی تاریخ میں اپنی شہرت رکھتا تھا۔ اسی دور میں لاہور سے کئی بڑے اخبارات اور بھی شائع ہوئے تھے، جن میں آریہ سماجی روزنامہ 'پرتاپ' بھی مقبول اخبار تھا۔ پرتاپ کے ایڈیٹر مہاشہ کرشن اپنے اسلام مخالف جذبات و احساسات کو نمایاں کرکے شائع کرتے تھے۔ ان کی تحریروں کا مولانا ظفر علی خاں دنداں شکن جواب دیا کرتے تھے۔ 'زمیندار' کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ وہ اردو کا اوّلین کثیر الاشاعت اخبار تھا، جس کی اشاعت تیس ہزار یومیہ تھی۔ یہ تعداد آج بھی اردو کے بڑے اخبارات کے لیے بڑی اہمیت کی حامل شمار کی جاتی ہے۔

سائمن کمیشن کی ہندوستان آمد پر جب پورا ملک 'سائمن واپس جاؤ' کے نعروں سے گونج رہا تھا، مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار میں کمیشن کی حمایت کرنے والے انگریز نواز عناصر کو آڑے ہاتھوں لیا۔ 3 فروری 1928 کو اس کمیشن نے بمبئی کے ساحل پر قدم رکھا۔ ظفر علی خاں نے زمیندار کے 9 فروری 1928 کی اشاعت میں اس موضوع پر اداریہ لکھا:

''جو مواعید مدبرینِ برطانیہ نے اس وقت ہندوستان کے فریب خوردگان سے کیے تھے، وہ برلنی پرزۂ کاغذ سے

زیادہ اہم اور وقیع ثابت نہیں ہوئے اور جوں ہی آتش جنگ کے شعلے فرو ہوئے، انگریزوں کی دیرینہ ہوس استعمار میں جان پڑ گئی۔ انھوں نے ہندوستان کو آزادی عطا کرنے کے بجائے اس کی زنجیروں کو اور بھی مضبوط کرنے کا تہیہ کرلیا اور اس کے متعلق جو کارروائیاں عمل میں آئیں، اس سلسلے کی ایک کڑی سائمن کمیشن ہے۔''

مولانا ظفر علی خاں نے تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر میں بھی سائمن کمیشن کی مخالفت کی اور 9 مارچ 1928 کو لاہور میں سرکار کھڑک سنگھ کی زیر صدارت ایک جلسے میں کہا:

''کمیشن کے تقرر سے ہندوستانیوں کی سخت تذلیل ہوئی ہے اور ہندوستان کی خودداری کا یہی تقاضا ہے کہ وہ اس کا مقاطعہ کریں۔ ایسے ممالک جن کی آبادی اسّی لاکھ یا ایک کروڑ ہے، انھیں بھی آزادی کا حق حاصل ہے ... تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی تینتیس کروڑ ہے، غلامی کی لعنت میں گرفتار ہے۔'' (مولانا ظفر علی خاں۔ احوال و آثار، ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی، ص 157)

انھوں نے یہ بھی لکھا کہ کمیشن کی حمایت کرنے والے یہ تو فرمائیں کہ آخر انھیں خوشامد کا وہ کیا صلہ دے گا؟ کون سی عزت ملے گی ان کاسہ لیسوں کو؟ وہ کس سرخاب کے پر ان کی ٹوپی میں سجادے گا؟ یہ چچوڑی ہوئی ہڈیاں ہیں خوانِ مغرب کی جنھیں وہ پھینک کر مشرق کے کتوں کو لڑائے گا۔ واضح ہو کہ کمیشن کے حامیوں میں سر

محمد شفیع اور سر عبدالقادر کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال بھی شامل تھے۔

نادم سیتاپوری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کی نظموں کی اشاعت کے سبب زمیندار کا سنڈے ایڈیشن اتنا عنقا ہو جاتا تھا کہ بازار میں ایک ایک روپے میں بک کر بھی نہیں ملتا تھا۔

جب برطانوی حکومت نے پریس ایکٹ نافذ کیا تو مولانا ظفر علی خاں اس کے خلاف مہم چلانے کے لیے لندن گئے، جہاں سے انھوں نے اپنا تاریخی مضمون اس عنوان کے ساتھ اپنے اخبار کو بھیجا:

چار چیز است تحفۂ لندن
خمر و خنزیر و روزنامہ و زن

برطانوی حکومت اس ہتک آمیز مضمون کی اشاعت پر چراغ پا ہوگئی۔ اخبار اور پریس ضبط کرلیے گئے اور اسّی ہزار کی ضمانت طلب کی گئی۔ یہ رقم اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی، لیکن مولانا ظفر علی خاں کے قدردانوں نے یہ رقم بھی جمع کرادی۔

مولانا ظفر علی خاں کے زمیندار کو یہ بھی امتیاز حاصل ہے کہ اس نے پہلی مرتبہ رائٹر اور ایسوی ایٹیڈ پریس سے خبریں لے کر شائع کریں، جس کے سبب اس نے اپنے ہم عصر اخباروں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ مولانا ظفر علی خاں کے اخبار سے مولانا نیاز فتح پوری، مولانا عبداللہ عمادی، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی اور منشی وجاہت حسین جھنجھانوی بھی وابستہ تھے۔ زمیندار کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہ ہم عصر اخباروں میں بے باک شمار کیا جاتا تھا۔ اس اخبار کی مقبولیت سے متعلق ڈاکٹر عبدالسلام خورشید 'صحافت پاک و ہند' میں اپنے والد ماجد مولانا عبدالمجید سالک کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

''زمیندار کی غیر معمولی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب زمیندار سرحدی علاقے میں پہنچتا تھا تو یہاں ایک آنہ دے کر اخبار خریدتے تھے اور ایک آنہ پڑھوائی کے لیے دیتے تھے۔ کان پور میں جب مچھلی بازار کا واقعہ پیش آیا تو اس وقت سارے یوپی میں مسلمانوں کے جذبات حکومت کے خلاف مشتعل ہوگئے۔ کان پور کے تاجرانِ چرم نے اپنے ایک قاصد کے ہاتھ زمیندار کی مالی امداد کے لیے دو ہزار کی رقم اس غرض سے بھیجی کہ زمیندار اپنے مطالبے پر ڈٹا رہے۔ کانپور میں جب زمیندار پہنچتا تو اس کا ایجنٹ اپنی دکان کا دروازہ بند کرلیتا تھا کہ کہیں گاہک بے صبری کے عالم میں پرچے چھین کر نہ لے جائیں۔ دس بجے تک تو پرچہ ایک آنہ میں مل جاتا تھا، لیکن پچھلے پہر تو آٹھ آنہ کو بھی نہیں ملتا تھا۔ روزانہ اشاعت تیس ہزار تھی اور یہ 1947 تک کسی اردو اخبار کو نصیب نہیں ہوسکی۔ اس زمانے میں زمیندار کے دو ایڈیشن نکلتے تھے۔ صبح ایڈیشن کی قیمت ایک آنہ تھی اور شام ایڈیشن کے مقامی ایڈیشن کی قیمت دو پیسے پرچہ۔'' (صحافت پاک و ہند میں، عبدالسلام خورشید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، طبع اول، ص 315)

عبدالسلام خورشید نے یہ بھی لکھا ہے کہ

''حسرت موہانی کے بعد مولانا ظفر علی خاں پہلے گریجویٹ تھے جو صحافت میں داخل ہوئے، اس سے اردو صحافت کا وقار بلند ہوا اور لوگوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ صحافت ایک اونچا پیشہ ہے، جس میں اونچی قابلیت کے لوگوں کی ضرورت ہے۔'' (ایضاً ص 360)

شورش کاشمیری جو ایک صاحب طرز ادیب و نثار تھے، 'نقوش' کے شخصیات نمبر میں مولانا ظفر علی خاں سے متعلق لکھتے ہیں:

''ظفر علی خاں سرتا پا ہنگامہ تھے اور ظاہر ہے کہ ہنگامے میں حکایتیں شاذ اور شکایتیں وافر ہوتی ہیں۔ ظفر علی خاں کی شخصیت سے ہم عصروں اور ان کے جانشینوں نے جو تغافل برتا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ظفر علی خاں نے گرد و پیش کی عمارتیں ڈھانے میں زبان اور قلم کو ہمیشہ گرز البرز شکن بنائے رکھا۔''

مولانا ظفر علی خاں کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ادب کو عوام کے سانچے میں ڈھالا۔ ادب کو سادہ اور عام فہم زبان میں پیش کرکے اسے عوامی بنایا۔ ان کے اخبار زمیندار کی کامیابی میں ان کے اس ہنر کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ان کو ایک آندھی، جوار بھاٹا اور بجلی و شعلہ سے تشبیہ دی گئی، حقیقتاً میدان صحافت کے وہ بہت تیز رو شہسوار تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک جگہ لکھا ہے:

''ملک میں کسی تحریک کو مہینوں کے بجائے ہفتوں میں چلانا چاہو تو ظفر علی خاں اور شوکت علی خاں کو چھوڑ دو، وہ بسرعت تمام یہ قلعہ بنا ڈالیں گے۔''

آج کے اردو اخبارات کے لیے جو باتیں ضروری سمجھی جاتی ہیں، ان میں سے بہت مولانا ظفر علی خان کی دین ہیں، اس طرح وہ جدید اردو صحافت کے بانی کہے جاسکتے ہیں۔ ان کے زمانے سے ہی صحافت اور سیاست ہم رکاب ہوگئیں اور آج بھی ہم رکاب ہیں۔

□

Munawwar Hasan Kamal, G 5/A, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

مصنف: سعید نفیسی   مترجم: واصف احمد

(فارسی افسانہ)

وطن

سعید نفیسی عہد حاضر کے نامور فارسی افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی پیدائش انیسویں صدی کے اواخر میں تہران میں ہوئی۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے پیرس گئے۔ پیرس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد تہران میں مستقل سکونت اختیار کی اور دارالفنون تہران یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد تصنیف و تالیف میں ہمہ تن مشغول ہوگئے۔ نومبر 1966 میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے افسانے لکھے اور ناول بھی اور صنف ڈرامہ میں بھی طبع آزمائی کی لیکن خاص شہرت افسانہ نویسی میں ملی۔ صنف افسانہ نگاری میں نہ صرف ایران بلکہ ہندوستان میں بھی بہت مقبول ہوئے۔ ستارگان سیاہ (مجموعہ افسانہ) اور ماہ نخشب (مجموعہ افسانہ) وغیرہ ان کی مایہ ناز تصانیف ہیں۔ خانہ پدری (وطن) ان کا بہت ہی مشہور و مقبول افسانہ ہے جس میں انھوں نے جذبہ وطن پرستی اور حب الوطنی کو حتی المقدور ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

وطن

اسّی سال قبل ایک قدیم ایرانی نژاد بوڑھا شخص نصراللہ ہرات میں زندگی بسر کرتا تھا۔ نصراللہ کی عمر چوہتر سال تھی۔ ان کے آباواجداد بنیادی طور پر دھنو ارقان سے تعلق رکھتے تھے لیکن حالات سے مجبور ہوکر ہمیشہ کے لیے ہرات منتقل ہوگئے، وہیں مستقل سکونت اختیار کی اور قلی کے پیشہ سے منسلک ہوگئے۔ نصراللہ ان اشخاص میں سے تھے جو دنیا کی کسی بھی مادی چیز سے کوئی دلبستگی نہیں رکھتے تھے۔ وہ بچپن میں ہی یتیم ہوگئے تھے۔ انھوں نے شادی نہیں کی بلکہ یہاں تک کہ شادی کے تصور کو بھی لغو شمار کرتے تھے۔ راستے میں اگر کسی ماں کو اپنے بچے کو آغوش میں لے کر شفقتِ مادری اظہار کرتے دیکھتے تو بہت تعجب کرتے اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چونکہ ان کا اپنا کوئی مکان نہیں تھا اور رات مختلف جگہوں پر گزارتے تھے اسی لیے انھیں کسی خاص مقام سے انسیت اور لگاؤ پیدا نہیں ہوا اور نہ ہی کسی ایک خطہ سرزمین کو دوسرے خطے پر ترجیح و فوقیت دیتے تھے اور نہ ہی دوسری جگہ کو بہتر تصور کرتے تھے۔ نتیجتاً یہ بوڑھا شخص ان آزاد منش فلسفیوں کی طرح ہوگیا تھا جو کسی چیز کی طرف رغبت نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی کسی انسان سے پیار و محبت کرتا تھا۔ اسی لیے وہ کہتے تھے کہ دنیا کی کوئی بھی چیز ان کو اپنی طرف لبھا نہیں سکتی تھی اور موت کے وقت بھی بغیر کسی غم و افسوس کے خوشی بخوشی اس دارالفانی سے دارالبقا رحلت کرجائیں گے۔ مذکورہ بالا عقیدہ کے سبب وہ کسی کے گھر آمد و رفت نہیں کرتا تھا، کسی کے ساتھ دوستانہ تعلق استوار نہیں کرتا تھا اور نہ ہی کسی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا تھا۔

اتفاق سے ایک روز حکومت برطانیہ نے ایران پر حملہ کردیا۔ خراسان میں شدید جنگ شروع ہوگئی۔ ابتدا میں ایرانی اقوام فاتح ثابت ہوئی لیکن بعد میں انگریزوں نے ہرات اور گردونواح کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ گرچہ اس واقعہ نے نصراللہ کے علاوہ ہرات کے تمام باشندوں کو مغموم و مضمحل کردیا لیکن نصراللہ بالکل ہی متاثر نہیں ہوا اور نہ ہی غمگین ہوا۔

جنگ کی تباہی سے متاثر ہوکر شہر کے معزز خاندان کے افراد جذبہ وطن پرستی کو دل کے کونے میں دبا کر اور جذبہ حب الوطنی کو بالائے طاق رکھ کر ہرات کو خیرباد کہتے ہوئے خراسان ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے اور خراسان کے لیے روانہ ہوگئے۔ جنگ میں شکست کے بعد لوگ اپنے مال و اسباب کو بہت سستی قیمت میں فروخت کرکے خراسان ہجرت کررہے تھے تاکہ مشہد یا ایران کے دوسرے شہروں میں پناہ لے سکیں۔ ظاہر ہے، جنگی حالات میں لوگوں کی آمد و رفت بڑھنے کے سبب نصراللہ کا قلی کا مشغلہ کافی بڑھ گیا اور اس کی آمدنی کئی گنا بڑھ گئی۔ رات کو اپنے کام سے فارغ ہوکر نصراللہ جب قہوہ خانہ میں بیٹھتا تھا تو دوران گفتگو اپنے شہر کے لوگوں کے ہجرت کے رویے کو مورد تنقید قرار دیتا تھا۔ ان کی نظر میں ان لوگوں کو دیوانہ کہنا بے جا نہ ہوگا جو اپنی آخری عمر میں مال و اسباب سستی قیمت میں بیچ کر سفر کی مصیبت برداشت کرتے ہیں اور ہرات چھوڑ کر دوسرے شہروں کی طرف ہجرت کرتے ہیں۔ نصراللہ کے مطابق ہر جگہ یکساں ہے، ہر مقام کا درجہ برابر ہے اور ہر خطہ سرزمین کی اہمیت ایک جیسی ہے۔ ہرات اور مشہد کے درمیان کیا فرق ہے؟

نصراللہ اس بات پر زیادہ تعجب کرتا تھا کہ اگر یہ دیوانے خود اپنی مرضی سے ہجرت کررہے ہیں تو پھر غمگین اور پشیمان کیوں ہیں؟ کسی نے تو انھیں ہجرت کرنے پر مجبور نہیں کیا؟ اگر انھیں اپنے گھروں سے اتنی ہی محبت و الفت ہے تو پھر کیوں ترک وطن کرکے ہجرت کررہے ہیں؟ ہرات کے معمر اور تجربہ کار اشخاص نصراللہ کو حتی المقدور سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ انسان ہمیشہ اپنے مولد اور وطن کو عزیز رکھتے ہیں اور محبت کرتے ہیں اور آسانی سے ترک نہیں کرسکتے ہیں۔ حب الوطنی فطری جذبہ ہے۔ اس جذبے سے انسان انکار نہیں کرسکتا ہے لیکن نصراللہ نے ان لوگوں کی ایک نہ سنی اور ان لوگوں کے نقطہ نظر سے بالکل ہی متفق نہیں ہوا۔ دراصل انھوں نے ان لوگوں کی باتوں پر ذرا سا بھی دھیان نہیں دیا اور اپنی بات پر مصر رہا۔

ایک روز ہرات کے ایک مشہور زمیندار نے نصراللہ سے ملاقات کی اور کہا ''نصراللہ! اب تم بوڑھے ہوچکے ہو، ضعیفی کی وجہ سے نہایت ہی کمزور و نحیف ہوچکے ہو اور کام کرنے کی قوت بھی باقی نہیں رہی۔ میں بھی ہرات سے ہجرت کرنا چاہتا ہوں۔ میرا ایک بڑا باغ ہے جو شہر سے باہر واقع ہے۔ میرے اس خوبصورت باغ کی نگہبانی کے لیے ایک پاسبان کی ضرورت ہے۔ چونکہ بیشتر افراد اپنا مال و اسباب فروخت کرکے شہر سے ہجرت کرچکے ہیں اس لیے اس خوبصورت باغ کا کوئی معقول خریدار نہیں ہے۔ خدا جانے مستقبل میں کیا ہوگا۔

اس لیے میں باغ کی نگہبانی اور حفاظت کے لیے باغ کو تمھارے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ تم اس کی نگہبانی کرو تاکہ تمھاری روزی روٹی کا مسئلہ حل ہوجائے گا اور میرے باغ کی حفاظت بھی ہوجائے گی۔ اس طرح زندگی کی آخری عمر میں تمھیں روزی روٹی کے لیے مجبوری میں ادھر ادھر دربدر بھٹکنے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔

نصراللہ کو اپنی ضعیفی کا احساس ہو رہا تھا اور اللہ تعالیٰ سے اس قسم کی مدد کا طلب گار بھی تھا۔ اس نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلایا، باغ کی نگہبانی کی ذمے داری قبول کی، اپنا بوریا بستر اٹھایا اور شہر سے باہر واقع مذکورہ بالا باغ کی طرف روانہ ہوگیا۔

انھوں نے باقاعدہ باغ کی نگہبانی شروع کردی۔ ہر روز حسب معمول نیند سے بیدار ہو جاتا تھا اور سارا دن باغبانی اور پھولوں اور درختوں کی نگہبانی میں گزار دیتا تھا۔ جب کام سے تھک جاتا تھا تو تھکاوٹ رفع کرنے کی غرض سے ایک نہر کے کنارے جو باغ کے بیچ سے بہتی تھی، بیٹھ جاتا تھا۔ ان دنوں وہ نئے مشاہدات اور تجربات سے روبرو ہوا۔ ایک دن اس نے نئی اور انوکھی چیز دیکھی۔ چھوٹی چھوٹی کنکریاں پانی کے نیچے نہر کی تہہ میں اس طرح جم کر بیٹھ گئی تھیں جیسے ان کا اپنا گھر ہی ہو۔ یہ کنکریاں پانی کے بہاؤ کی سخت مخالفت کر رہی تھیں اور اپنا مقام چھوڑنے کے لیے ہرگز راضی نہیں تھیں۔

چونکہ وہ مقام ان کا مسکن تھا جس سے ان کو فطری طور پر لگاؤ اور تعلق پیدا ہوگیا تھا۔ پانی کا شدید بہاؤ ان کنکریوں کو اپنے مسکن سے باہر نکالنا چاہتا تھا لیکن یہ کنکریاں اپنی جگہ سے ہٹنے کے لیے بالکل ہی تیار نہیں تھیں۔ افسوس! آخرکار پانی کا تیز بہاؤ کچھ کنکریوں کو اپنی جگہ سے ہٹانے میں کامیاب ہوگیا پھر بھی یہ اپنے دشمن کے خلاف زور آزمائی کرتی رہیں تاکہ دوبارہ اپنی جگہ پر قابض ہوسکیں۔ لیکن وہ ناکام ہوگئیں۔ اب کنکریاں صرف حسرت بھری نگاہوں سے اپنی جگہ کو دیکھ رہی تھیں۔

کچھ دنوں بعد حکومت برطانیہ نے ہرات پر اپنا قبضہ جما لیا اور سبھی جائیداد، مال و اسباب کو جو مہاجرین چھوڑ گئے تھے، اپنی تحویل میں لے لیا۔ مقبوضہ جائیداد میں مذکورہ باغ بھی تھا جو نصراللہ کی عارضی ملکیت اور نگہبانی میں تھا۔ نصراللہ کو اپنی مرضی کے خلاف بادل نخواستہ مجبوراً باغ کو ترک کرنا پڑا اور انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا۔

اب اس دھخوارقانی ضعیف شخص نصراللہ کو باغ کی پاسبانی کی غرض سے انگریز بھی رکھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ آخرکار وہ باغ سے باہر نکل گیا، لیکن ہر روز بلاناغہ باغ کو دیکھنے آتا تھا اور دروازہ کے سوراخ سے اندرونی حصہ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہتا تھا۔ یہ اس کا روزانہ کا معمول ہوگیا۔ جب سے وہ باغ کا پاسبان مقرر ہوا تھا تب سے اسے اپنی ملکیت کا حصہ سمجھنے لگا تھا۔ بنا بریں اس باغ سے بے پناہ محبت والفت ہوگئی تھی۔ یہ ایک فطری تقاضا ہے کہ انسان اپنی ملکیت، اپنے رشتہ دار و خویش و اقارب، اپنا مال و اسباب و جائیداد اور اپنے وطن سے محبت کرتے ہیں۔ درحقیقت بیچارہ نصراللہ باغ کو بالکل ہی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ جب بھی باغ کا تصور کرتا اس کی آنکھوں کے سامنے درختوں اور پھولوں کا منظر گھومتا رہتا تھا۔ بنا بریں باغ کے نئے مالک کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھرتا رہتا اور کبھی کبھی رونا شروع کردیتا تھا۔ چونکہ باغ کی نگہبانی کا مشغلہ ختم ہونے کے ساتھ ذریعہ معاش بھی بند ہوگیا تھا اس لیے دوبارہ انھیں قلی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ لیکن دو ماہ قبل کے قلی اور آج کے اس نئے قلی میں کافی فرق آچکا تھا یعنی وہ بالکل ہی بدل گیا تھا۔ باغ ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اس کی ذہنی کیفیت بگڑ گئی تھی اور دل و دماغ قابو میں نہیں رہتے تھے۔ آزاد منش نصراللہ جو دوستی و دشمنی کے رشتے سے بالکل بے خبر و آزاد تھا، دوبارہ بادل نخواستہ مسافروں کا سامان کندھے پر اٹھا کر ڈھونے پر مجبور تھا۔ وہ بغض و کینہ اور جذبہ نفرت سے لبریز ہوکر زمین سے سامان کندھے پر اٹھاتا تھا۔ وہ متعدد بار جذبہ تنفر و غم و غصہ سے متاثر ہوکر سامان کو زمین پر گرادیتا تھا۔ شاید غصے سے سامان کو برباد کردینا چاہتا تھا۔ چونکہ انھیں ان کے عزیز باغ سے باہر نکال دیا گیا تھا اس لیے اس کے دل میں ہر نئے مسافر کے خلاف دشمنی کا جذبہ ابھرتا تھا۔ ایک دن اچانک راستے میں باغ کے بیچ سے بہتی ہوئی نہر اور پانی کے تیز بہاؤ کی مخالفت میں جنگ کرتے ہوئے کنکریوں کی یاد ذہن میں تازہ ہوگئی۔

وہ محسوس کرنے لگا کہ کس طرح وہ کنکریاں پانی کے تیز رفتار بہاؤ کی مخالفت میں احتجاج کرتی تھیں اور کسی حالت میں بھی اپنی جگہ سے باہر نکلنا نہیں چاہتی تھیں۔ پریشانی کے عالم میں نصراللہ اگلے دن ہی ہرات سے اچانک غائب ہوگیا۔ کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ دو مہینے بعد لوگوں نے دھخوارقان کے اس جوان نصراللہ کو مخدوش، ضعیف، نحیف، کثیف اور اجنبی شکل میں دیکھا۔ وہ ہاتھ میں عصا تھامے ہوئے تھا جس کے اوپر ٹفن بکس بندھا ہوا

تھا۔ وہ اپنے آبائی وطن یعنی اپنے باپ رجب علی کے گھر جہاں پر اس کی پیدائش ہوئی، کی تلاش میں سرگرداں و پریشان تھا۔

■

Dr. Wasif Ahmad, Associate Professor & Head
Dept of Arabic, Persian, Urdu & Islamic Studies,
Bhasha-Bhavan, Visva-Bharati University,
Shantiniketan - 731235 (WB)

تبصرہ وتعارف

طلسم لکھنؤ

مدیر: محمد یعقوب فرنگی محلی، مرتب: اقبال حسین
صفحات: 356 قیمت: 176 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
مبصر: عطاء الرحمٰن قاسمی این 80، سی ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، دلی

انیسویں صدی کے اردو اخبارات و رسائل میں ہفت روزہ طلسم ایک اہم ومعیاری اخبار تھا جو نواب واجد علی شاہ کی معزولی کے پانچ ماہ بعد محمد یعقوب فرنگی محلّی کی ادارت میں 25 جولائی 1856 سے شائع ہوا تھا اور 8 مئی 1857 تک افق صحافت پر چمکتا دمکتا رہا ہے اور جس کے کل 42 شمارے شائع ہونے کے بعد بند ہوگیا تھا، طلسم ایک ہفت روزہ اخبار تھا اس زمانے میں عموماً اخبارات ہفت روزہ ہی ہوتے تھے۔

دفتر طلسم لکھنؤ کی جانب سے ایک مرصع و مسجع کاروباری اشتہار شائع ہوتا تھا، جس میں طلسم کے خریداروں کے نام جاری اور موقوف کرنے کے اصول وضابطے بیان کیے جاتے تھے اور اس کے دوسرے مسائل ومشکلات پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔

طلسم لکھنؤ میں لکھنؤ اور اس کے اطراف میں پیش آمدہ واقعات، چوری، ڈکیتی اور قتل وغارت گری کی واردات اور تقرری، برطرفی اور تبادلہ کے سرکاری اعلانات بھی شائع ہوتے تھے۔ طلسم میں معزول بادشاہ واجد علی شاہ اور ان کے خاندان کی خبریں بھی بڑے اہتمام کے ساتھ چھپتی تھیں، اودھ کے زمینداروں، تعلقہ داروں، صنعت کاروں کی بے روزگاری وغربت اور بدحالی کا بھی ذکر ہوتا تھا۔

طلسم میں لکھنؤ اور خطہ اودھ کے علاوہ، دہلی، کلکتہ، ممبئی، پنجاب، کشمیر، گجرات اور مدراس کی خبروں کے ساتھ افغانستان، روس، ایران، مصر، حجاز، برطانیہ، امریکہ، آسٹریلیا، فرانس اور جرمنی وغیرہ کی خبریں بھی نمایاں طور پر شائع ہوتی تھیں۔ اس کے قارئین کا دائرہ وسیع تھا، اس کے خریدار دہلی، لاہور، الور گوالیار میں موجود تھے، عام قارئین کے علاوہ اس کے خریداروں میں اودھ کے شاہی گھرانے کے افراد جیسے محمد علی شاہ کے فرزندان، مہاراجہ بنارس، مہاراجہ الور اور نواب رامپور شامل تھے۔ برطانوی افسر سر جان لارنس کا نام بھی خریداروں میں آتا ہے، طلسم کی زبان شستہ وشگفتہ اور تحریر مقفی و مسجع ہوا کرتی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس پر رجب علی بیگ سرور کے اسلوب تحریر کا عکس ہے جو مولوی محمد یعقوب علی فرنگی محلّی کے قریبی دوست تھے، غالباً طلسم کی ترتیب واشاعت میں رجب علی بیگ سرور کا قلمی تعاون اور مشورہ شامل رہا ہے۔

طلسم میں ایک خبر بلخ کے بارے میں ان لفظوں میں شائع ہوئی ہے:

''وہاں بھی فساد پیدا ہوا، سنا ہے کہ ایک بڑا بلوا ہوا، لوگوں کا اتفاق امیر دوست محمد خاں کے مقابلے پر ہے۔ اس نواح میں اور قوموں کو بھی امیر کی مخالفت مدنظر ہے'' طلسم 62

طلسم میں ایک خبر ایران کے متعلق شائع ہوئی ہے:

''وہاں بہرصورت امان ہے، کچھ کھٹکا نہیں اطمینان ہے، سفیر انگریزی کہ وہاں سے اٹھ کر بغداد میں آیا تھا، پھر طہران کو جائے گا، کچھ خلاف نہ رہے گا اگلی شکر رنجی کا عنقریب تصفیہ ہوجائے گا کہ سلطنت ایران وانگریزی میں بہرصورت آشتی پیدا ہوگئی، روابط اتحاد کی تجدید ہوئی پھر موافقت، محبت ہویدا ہوگئی۔ طلسم 92

ہفت روزہ طلسم لکھنؤ کے فاضل مرتب ومدون اقبال حسین صاحب ہیں اور ناشر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ہے۔ اقبال حسین نے طلسم کے شماروں کو ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہونے کی اطلاع دی ہے۔ لیکن اس کے زیادہ تر شمارے مفتی محمد رضا انصاری صاحب فرنگی کی ذاتی لائبریری میں تھے۔ جن کو مشہور تاریخ داں پروفیسر عرفان حبیب نے شعبہ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لیے حاصل کیا تھا ان ہی شماروں کو اقبال حسین نے مرتب کیا ہے۔ ہفت روزہ طلسم کی اشاعت سے نہ صرف الحاق اودھ اور اس کے بعد پیدا شدہ صورت حال کے بارے میں واقفیت ہوتی ہے۔ بلکہ لکھنؤ کی تہذیب وثقافت اور زبان وادب کے زوال وانحطاط کا بھی بخوبی علم ہوتا ہے۔ قومی اردو کونسل اس کے قابل مبارکباد ہے جو اس قسم کی تاریخی اور ثقافتی چیزوں کو منظر عام پر لانے کی سعی کررہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ علمی وادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

فطری علاج

مصنف: حسن الدین احمد، غلام احمد
صفحات: 144، قیمت: 64 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ریحانہ فاطمہ، شاہین باغ، نئی دہلی

پیش نظر کتاب پندرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں 144 صفحات ہیں۔

پہلے باب میں فطری علاج کے طریقے اور اس کی ابتدا جرمنی کو بنایا گیا۔ وہاں کے ایک کسان نے اس طریقے کی ابتدا کی۔ فطری علاج میں دواؤں کی بجائے ورزش، تازہ ہوا، چشمے کا پانی اور منتخب غذا کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس باب میں ان سبھی معالجین کا ذکر ہے جنھوں نے فطری علاج کی شروعات کی اور عمل بھی کیا جیسے ابنِ سینا، ابنِ زہر، تھیوڈر ہان، لوئی کوہنس، جوہانس، ڈاکٹر کیلاگ وغیرہ نے اپنا لوہا منوایا۔ انگلستان میں جارج برناڈ شا نے ایک عالمانہ طریقے سے فطری علاج کی جو خامیاں تھیں ان کو دور کیا، ہندوستان میں پر مہاتما گاندھی نے فطری علاج کو عام کیا۔ کئی ہندوستانیوں نے روشنی کے ذریعے علاج کو شروع کیا۔ دوسرے باب میں فطری علاج کی اصطلاحات کے اصول، مرض، صحت، صحت کے اصول شامل کیے گئے ہیں۔ رہائش اور علاج کے فطری طریقے کی بھی تفصیلات درج ہیں۔ تیسرے باب میں علاج کے فطری نظریات کے بارے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ چونکہ انسان کی تخلیق میں پانی، مٹی، ہوا، آگ کا عنصر موجود ہے۔ تو علاج بھی ان ہی عناصر کے ذریعے ہونا چاہیے۔ چوتھے باب میں طبی علاج اور فطری علاج کا ذکر ہے۔ طبی علاج میں ہومیوپیتھی، ایلوپیتھی کو شامل کیا گیا ہے۔ اس باب میں مصنف نے آگاہ کیا ہے کہ کیسے دواؤں کے علاج سے انسانی زندگی کو نقصان پہنچتا ہے اور مرض کی علامتیں دب جاتی ہیں، اس کے برعکس فطری علاج کا فلسفہ بالکل جدا ہے اور انسان کو فطرت کے اصولوں پر عمل کرنا چاہیے۔

پانچویں باب میں قانون شفا کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ یعنی صحت کا دار ومدار کھانے پینے، سوچنے کے طریقوں پر ہے۔ جب یہ کام فطری اصولوں کے برعکس ہوتا ہے تو بیماری لاحق ہوتی ہے۔ کیونکہ انسانی جسم بھی ایک فطری ڈسپلن چاہتا ہے۔ انسانی اعضاء ڈسپلن کے

دائرے میں کام کرتے ہیں۔ مرض اصل میں قانون فطرت کی خلافت ورزی ہے، چھٹے باب میں فطری علاج کا ذکر ہے ان طریقوں میں ہوا، ورزش، سانس لینے کے طریقے مالش، روشنی، پانی، غسل تیرنا، غذا راگ، ہومیوپیتھی، بایوکیمک وغیرہ شامل ہے۔ یہ زیادہ طویل باب ہے۔

ساتواں باب فطری علاج کے نظریات اور سوال و جواب پر مبنی ہے، اس میں 15 سوالات مع جوابات کے دیے گئے ہیں۔ مثلاً فطری علاج میں کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لا علاج مریض بھی شفا پا سکتا ہے۔ فطری علاج کا مقصد کیا ہے وغیرہ۔

آٹھواں باب پانی کے ذریعے علاج، سوال و جواب کے بارے میں ہے۔ اس میں 75 سوالات جوابات کے ساتھ درج ہیں۔ اس میں زیادہ سوالات 'پانی کے ذریعے علاج کیسے ممکن ہے' کے متعلق ہے۔ فاقہ، مڈ پلاسٹر، عام غسل کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔

نواں باب سورج کی کرنوں کی شفا بخش قوت پر مشتمل ہے۔ ہندوستان میں اس علم حصول اور سورج کی کرنوں سے کیسے علاج ممکن ہے۔ سورج کی کرنیں کیسے انسانی زندگی کو متاثر کرتی ہیں۔ مصنّفین نے مختلف تجربوں کے ذریعے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ سورج میں سرخ کرن، زرد کرن، نیلی کرن، نارنجی کرن، بنفشی کرن، ان سبھی پانچوں کرنوں میں قدرت نے مختلف گیسوں اور کیمیائی اجزا کو مرکب کیا ہے۔

دسواں باب نویں باب سے کافی مشابہ ہے۔ اس میں سورج کے ذریعے غسل، غسل کا مقام، غسل کا وقت، کن بیماریوں میں، غسل دیا جاتا ہے اور کن میں منع ہے اور بچوں کے لیے کتنا مفید ہے۔ گیارہویں باب میں سورج سے نکلنے والے رنگوں کے ذریعے علاج کیسے ممکن ہے اور سورج کی کرنوں میں کون کون سے رنگ ہوتے ہیں۔ رنگوں کا تعلق جسم سے کیسے ہوتا ہے، جسم کے مختلف حصوں پر رنگوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔

بارہویں، تیرہویں باب میں کروموپیتھی یعنی رنگین پانی سے علاج کا تذکرہ ہے، رنگین پانی کیسے تیار کرتے ہیں۔ رنگین پانی کے استعمال کا طریقہ کیا ہے، کم عمر کے بچوں کے لیے کیا طریقہ ہے۔ رنگوں کی کیا خاصیت ہے۔ ہر رنگ کی خوبی بیان کی گئی ہے۔ رنگین بوتل کیسے تیار کی جاتی ہے۔ مصری اور نیل کے کیا اثرات ہیں اور اس کے ذریعے علاج کب تک جاری رہے گا۔

چودہویں باب میں رنگوں کے ذریعے مرض کی تشخیص کا ذکر ہے، مثلاً مریض جس رنگ کو پسند کرتا ہے اسی رنگ کی اس کے جسم میں کمی ہے۔ آخری اور پندرہواں باب ورزش سے متعلق ہے۔ یہ قدرتی علاج کا ابتدائی مرحلہ ہے، کیونکہ ورزش کرنے سے جسم تندرست رہتا ہے، اور انسان کے سبھی اعضا چست رہتے ہیں۔

کتاب کا موضوع قابل تحسین اور دیدہ زیب ہے۔ پروف کی غلیاں بہت کم ہیں بلکہ نہ کے برابر ہیں۔ عام لوگوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

تیزاب میں تیرتے پھول (شعری کلیات جلد دوم)

شاعر: پروفیسر مظفر حنفی، ترتیب و تدوین: فیروز مظفر
صفحات: 466، قیمت: 500، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: محبوب راہی، بارسی ٹاکلی، ضلع اکولہ 444401

مظفر حنفی دو سال بعد آٹھ دہائیاں مکمل کر کے طبعی توانائیوں اور ذہنی و فکری جولانیوں کے ساتھ عمر کی ایک صدی کی تکمیل کی جانب رواں دواں ہیں۔ سال رواں میں ان کی چار ضخیم کتابوں کی یکے بعد دیگرے اشاعت کی مجموعی ضخامت ایک ہزار سات سو بیس صفحات پر محیط ہے جن میں ٹی وی اور اخبارات و رسائل کے لیے مشاہیر سے لیے گئے انٹرویوز اور ادبی شخصیات سے متعلق ان کے ذاتی تجربات کی روشنی میں پرلطف واقعات پر مبنی 'گفتگو، دو بدو' فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کی مالی اعانت سے نیز 'کتاب شماری' اور 'کمان' (شعری کلیات جلد اوّل) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے مالی تعاون سے حال ہی میں منصۂ شہود پر آئی ہیں۔ زیر تبصرہ 'تیزاب میں تیرتے پھول' (شعری کلیات حصۂ دوم) کی اشاعت بھی متذکرہ بالا تصانیف کے ساتھ ہی عمل میں آئی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے عالمانہ دیباچے کے ساتھ حصہ اوّل میں حنفی صاحب کے ابتدائی چھ شعری مجموعوں کے علاوہ چند غیر مطبوعہ شعری تخلیقات بھی شامل ہیں۔

'تیزاب میں تیرتے پھول' کی معنی آفرینی رنگ و آہنگ اور لب و لہجے سے مترشح ہے۔ طرز اظہار و بیان اور موضوع و مواد کی تیزابیت میں پھول جیسے لہجہ و آہنگ کی خوشبو، تازگی اور ملائمت کا متوازن امتزاج ان اشعار کو دو آتشہ کی کیفیت سے معمور کرنے کا موجب ہے۔ ان اشعار میں تخلیقی اظہار کے غالب اخلاقی اور معنوی عنصر کی بنا پر ان میں خلوص اور سچائی کے طاقتور تاثر کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر شمیم حنفی نے مظفر حنفی کے لیے ان کی شعرگوئی کو نہ تو برائے تفریح کہا ہے اور نہ صرف عادت کا جبر قرار دیا ہے بلکہ اسے ایک اخلاقی فریضے کی ادائیگی کے وسیلے سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے ''اپنے ماحول میں، واقعات میں، اشخاص میں، تجربوں میں انھیں جہاں کہیں بھی ناہمواری، نقص اور بدہیئتی دکھائی دیتی ہے وہ اس پر اپنے آپ عمل سے بالاتر نہیں رہتے... اپنے دل کی بات پر کسی طرح کی مصلحت، منافعت اور مجبوری کا پردہ بھی آنے نہیں دیتے۔ اپنی بات وہ دوٹوک انداز میں کہتے ہیں اور عام طور سے استعارے علامت اور ابہام کے بغیر کہتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے مظفر صاحب کی شاعری میں تخلیقیت پر تفکر کا طور غالب آ گیا ہے۔'' (پیش لفظ)

زیر تبصرہ کلیات میں مظفر صاحب کے سات مجموعوں کے علاوہ 56 نئی غزلوں کے بشمول 862 غزلیات، 23 رباعیات، ایک لغت اور چار حمد یہ منظومات شامل ہیں۔ پہلے فلیپ پر گوپی چند نارنگ کی رائے درج ہے جس میں مظفر حنفی کے اپنے استاد شاد عارفی کی کاٹ دار تیکھی غزل کی راہ پا کر بوقلمونی، تہہ داری اور طرح داری کی اپنی فضا بنانے کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے بھیڑ بھاڑ میں اپنے لہجے اور اپنے تیور سے پہچانے جانے کی سعادت کو تخلیق کا سب سے بڑا اعزاز و افتخار قرار دیا ہے۔ دوسرے فلیپ پر درج فرمان فتح پوری کی رائے کے مطابق ان غزلوں کو سچے تجربات و مشاہدات کے ایک ایسے آئینے سے تعبیر کیا گیا ہے جس میں ہمارے عہد کی زندگی اپنی جملہ رعنائیوں اور ریاکاریوں کے ساتھ صاف نظر آتی ہے۔ زندگی کی اس روش کی بنا پر فرمان مرحوم نے اس مجموعے کو مردانہ لب و لہجے سے ہمکنار قرار دیا ہے۔

حنفی صاحب کی شاعری کے بحر ذخار سے سرسری گزرنے کے اپنے تجربے کی بنا پر ایک تعجب خیز حقیقت کا انکشاف ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ اس قدر کثیر الکلامی اور بسیار گوئی کے نتیجے میں تخلیقات کے ذخیرے میں چند مقامات آہ و فغاں یعنی رطب و یابس کا در آنا فطری امر ہے لیکن استعجاب انگیز حسرت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ دیکھ کر کہ موصوف کے ہزارہا ہزار اشعار میں اگر تکرار و اعادہ کی اکا دکا مثالیں ملتی بھی ہیں تو ذرا سا غور کرنے پر ان میں بھی معنی و مفہوم کا کوئی نیا گوشہ، کوئی نیا نکتہ یا طرز اظہار کا کوئی منفرد پہلو برآمد کرنے کی شعوری کوشش صاف جھلکتی ہے جب کہ خدائے سخن میر کے ہاں تک 'بلندش بلند پستش پست' والی صورتِ حال درپیش ہے۔

نفسا نفسی، خودنمائی اور خود پسندی کے اس دور میں کہ تسلیم و اعتراف اور قدردانی و عقیدت مندی کی سابقہ روایتیں دم توڑ چکی ہیں ورنہ کوئی دم نہیں کہ میر، غالب اور اقبال کے بعد شہرت و مقبولیت کی بلند مسندوں میں مظفر حنفی کے لیے ایک مسند پیش کرنے میں کوئی دشواری ہو جب کہ موصوف کے تخلیقی استحکام، استقامت اور جوش و دفور کے متعلق زیر تبصرہ کلیات میں شامل اپنے مقدمے میں پروفیسر شمیم حنفی معترف ہیں کہ:

''سب سے خوش آئند بات ہے یہ ہے کہ تجربوں اور خیالوں کی پختگی اور سن رسیدگی کے باوصف مظفر صاحب کے یہاں کہنگی اور تھکن کے آثار نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وہ اپنے پرانے جوش اور وفور کے ساتھ شعر کہہ رہے ہیں۔''

مظفر حنفی کے تخلیقی جوش اور وفور پر انھیں کا ایک حقیقت افروز شعر یاد آگیا:

سبھی ہم عصر سرچشمے ہوئے خشک　　مظفر ہے کہ دریا بہہ رہا ہے

اللہ کرے مظفر حنفی کا یہ تخلیقی جوش، یہ فکری وجدان کی روانی مدتوں یونہی قائم و دائم رہے۔ یہ دریا یونہی رواں دواں رہے۔ بہتا رہے، بہتا رہے۔

خیال قلم

مصنف: غلام نبی خیال

صفحات: 480، قیمت: 800 روپے

ناشر: میزان پبلی کیشنز، سری نگر، جموں و کشمیر

مبصر: سلمان فیصل، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ

جموں و کشمیر کے معاصر ادبی منظر نامے پر جناب غلام نبی خیال بحیثیت شاعر، صحافی اور محقق و مترجم مشہور و معروف ہیں۔ کشمیری ادب کے ساتھ ساتھ اردو ادب پر بھی آپ کو دسترس حاصل ہے۔ آپ بیک وقت اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں اپنے مافی الضمیر کو ادبی پیرایے اور ایک خاص اسلوب بیان میں ظاہر کرتے ہیں۔ آپ کی اب تک کئی کتابیں اردو، کشمیری اور انگریزی زبان میں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ کئی کتابوں کو اعزازات و انعامات سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ آپ کی مشہور کتابوں میں 'اقبال اور تحریک آزادی کشمیر' کے علاوہ 'کاروان خیال'، 'خیابان کشمیر'، 'فکر خیال' اور 'خیالات' قابل ذکر ہیں۔

'خیال قلم' آپ کی تازہ ترین تصنیف ہے جس میں ایسے مختلف ادیبوں پر آپ نے مضامین تحریر فرمائیں ہیں جو کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں یا کسی بھی حیثیت سے کبھی کشمیر سے ان کا واسطہ رہا ہو۔ اس کے علاوہ اردو زبان اور کشمیر کے تعلق پر بھی خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ اردو کے جن ادیبوں پر موصوف نے قلم اٹھایا ہے ان میں علامہ اقبال، فیض احمد فیض، سعادت حسن منٹو، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری اور مجاز قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ رومی، گوئٹے اور مقبول فدا حسین بھی شامل ہیں۔ خیال صاحب نے کچھ کشمیری شخصیات اور ادیبوں پر بھی مضامین قلمبند کیے ہیں جن میں شیخ یعقوب صرفی، غنی کشمیری، شورش کاشمیری، مولانا محمد سعید سعودی، سنتوش کشمیری اور کشمیری لال ذاکر ہیں۔ شخصیات کے علاوہ زبان و ادب پر بھی مضامین شاملِ کتاب ہیں جیسے کشمیری زبان میں تحقیقی ادب، اردو اور جنوب ایشائی ہم آہنگی، انگریزی اور کشمیری کا لین دین اور عقیدتی ادب کے کشمیری تراجم وغیرہ ہیں۔ گویا کہ اس کتاب میں مصنف نے اپنے نقش ہائے رنگ رنگ یکجا کرنے کی بہترین سعی کی ہے اور چونکہ مصنف خود بھی شاعر ہیں اس لیے ان کی ترجیحات اور پسندیدگی میں شاعری کا دخل ہے۔ لہٰذا ان ادیبوں کی فہرست میں شعرا کی کثرت ہے جن پر مصنف نے قلم اٹھایا ہے۔ اس کتاب کو مصنف نے بریکٹ میں ''مصوّر'' سے بھی تعبیر کیا ہے اور مضامین کی مناسبت سے دو درجن سے زائد تصویروں سے کتاب کو مزین کیا ہے۔

الگ الگ موقع سے لکھے گئے مضامین کو مصنف نے یکجا کر کے 'خیال قلم' کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ان میں کچھ مضامین ایسے ہیں جو خاکہ اور رپورتاژ کے عناصر سے بھی مملو ہیں۔ کچھ مضامین تنقیدی نوعیت کے ہیں اور کچھ مضامین یادوں کے سہارے لکھے گئے ہیں۔ زبان و ادب پر لکھے گئے مضامین میں تنقید و تحقیق کے عناصر صاف طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اردو زبان پر بھرپور دسترس رکھتے ہیں۔ آپ کا اسلوب اور پیرایہ اظہار سادگی کا حامل، سلیس اور دلچسپ ہے۔ آپ کی تحریروں میں اکتاہٹ نہیں ہے۔ آپ کا اسلوب نگارش قاری کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں دو مضامین مصنف پر بھی شامل ہیں۔ ایک مضمون 'جشن خیال' ہے جس میں مراد آباد اتر پردیش میں منعقد 'شام خیال' پر مبنی ایک رپورتاژ ہے۔ دوسرا مضمون فاروق ارگلی کا ہے جو روزنامہ راشٹریہ سہارا میں بعنوان ''کشمیریات کا مجسم فکری زعفران زار: غلام نبی خیال'' شائع ہو چکا ہے۔ ایک طویل مضمون 'خیال نامہ' کے نام سے بھی شامل ہے جس میں مصنف نے اپنی ادبی زندگی کی روداد پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک طویل مضمون ہے اور آپ کی زندگی کی مختلف پرتوں کو کھولتا ہے۔ اس مضمون میں خیال صاحب نے کئی ادبا و شعرا کا ذکر کیا ہے اور کئی ایسے واقعات بیان کیے ہیں جو دلچسپ بھی ہیں اور کشمیری و اردو ادب میں تحقیق کی رہ گزر سے ہو کر جانے والوں کے لیے سامان عقدہ کشائی بھی ہیں۔ مصنف نے مختلف ادیبوں سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر اور بزم علم و داب کے متعدد واقعات کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ آپ کی ادبی زندگی پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے یہ مضمون بہت اہمیت کا حامل ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب اردو اور کشمیری ادب اور کشمیر سے اردو کے تعلق کو سمجھنے میں اہمیت رکھتی ہے۔ گرچہ یہ کتاب مختلف مضامین کا مجموعہ ہے لیکن کشمیریت نے ان سب کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ کتاب کی طباعت بہت دیدہ زیب ہے۔ چھپائی اور کاغذ بہت عمدہ استعمال کیے گئے ہیں۔ امید قوی ہے کہ خیال صاحب کی دیگر کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوگی۔

اردو کا شعری اثاثہ اور نئے وارث

(ولی سے عہد حاضر تک)

مصنف/ ناشر: انور ظہیر انصاری

صفحات: 336، قیمت: 155 روپے، سنہ اشاعت: 2013

مبصر: علی احمد فاطمی، شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد

ممتاز ترقی پسند ادیب و ناقد انور ظہیر اپنی بے حد اہم کتاب 'ساحر لدھیانوی حیات اور کارنامے' (2004) کے ذریعے اردو دنیا میں عمدہ طریقے سے جانے پہچانے گئے۔ ان کے ادبی و تنقیدی نوعیت کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ اس کے بعد ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ 'شعور ادب' (2007) میں شائع ہوا۔ زیر نظر کتاب 'اردو کا شعری اثاثہ اور نئے وارث' حال میں منظر عام پر آئی ہے۔ جس میں پندرہ مضامین ہیں۔ ان مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیجیے تو کتاب کا عنوان آسان ہو جائے گا اور اس کی معنویت واضح ہو جائے گی۔ اگر اثاثہ کے طور پر رومی، ولی، نظیر، داغ، فراق، فیض، مخدوم، مجاز اور ساحر ہیں تو نئے ورثا میں مغنی تبسم، اثر انصاری، مشتاق شبنم، جاوید ندیم، جلیل شاد وغیرہ ہیں۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ شعری اثاثے کا حصہ بھاری بھرکم ہے کئی اعتبار سے اوّل تو خود ان شاعروں کی عظمت اور حیثیت دوم خود مصنف نے ولی، نظیر، داغ اور فراق پر جس قدر محنت و بصیرت سے مضامین لکھے ہیں وہ حق بعد کے شعرا کے ساتھ ادا نہیں کر سکے۔ ایسا فطری ہے کہ بڑی شاعری از خود بڑی تنقید کو جنم دیتی ہے اس لیے کہ تنقید کا تخلیق سے فطری رشتہ تو ہوتا ہی ہے اس سے زیادہ فکری ہوتا ہے۔ اب میں چند سطریں مصنف کی پیش کروں گا جس سے نہ صرف اس مصنف کی لیاقت و علمیت پر روشنی پڑے گی بلکہ اس کتاب کی اہمیت کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔ ولی کے بارے میں مصنف کا خیال ملاحظہ ہو:

''ولی کی بصیرتِ شعری نے علاقائی حدود کو پھلانگتے ہوئے جس طرح اپنا امتیاز قائم کیا ہے اس کی مثال پوری اردو شاعری میں شاید ہی کہیں ہے۔''

پورا مضمون لفظیات اور اسلوبیات میں ڈوبا ہوا جو اس الزام کی تردید کرتا ہے کہ

ترقی پسند ادیب صرف مواد کی باتیں کرتے ہیں۔ ولی پر لکھنا آسان نہیں لیکن انور ظہیر نے بے حد عرق ریزی سے یہ مضمون قلم بند کیا ہے۔ اسی طرح نظیرا کبرآبادی پر ان کا مضمون بھی بے حد اہم ہے جو ہندوستانی کلچر کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ ''ادب شعوری تخلیقی عمل ہے اور شعور تابع ہے معاشی و معاشرتی حالات، سیاسی صورتِ حال اور تہذیبی و ادبی ماحول کے۔'' پورا مضمون عہدِ نظیر کے حالات کے تناظر میں لکھا گیا ہے اور کلچر پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ داغ پر بھی لکھنا آسان نہیں لیکن انور ظہیر نے بے حد عمدہ مضمون رقم کر ڈالا اس سے انور ظہیر کی شاعری سے متعلق ان کی فہم تو ظاہر ہوتی ہی ہے ساتھ ہی تہذیب و معاشرت سے ان کی واقفیت نیز ادب وتہذیبی کی ہم آہنگی پر ایک نیا عکس جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ ترقی پسند شاعری تو انور ظہیر کا خاص میدان ہے۔ اسی لیے پانچ ترقی پسند شاعروں پر گراں قدر مضامین ملتے ہیں لیکن ان میں بھی سب سے اہم مضمون فراق سے متعلق ہے۔ احساسِ جمال اور مشترکہ تہذیب کو ہم آہنگ کرنا آسان بات نہیں لیکن انور ظہیر نے بڑے سلیقے اور عرق ریزی سے عمدہ مضمون لکھ ڈالا۔ اِس مضمون کا تناظر بڑا ہے۔ اسی طرح مخدوم جنھیں محض مزاحمت اور احتجاج کا شاعر کہا جاتا ہے۔ اس کی شاعری میں رومان اور جمال کی تلاش مشکل کام تھا۔ یہ مشکل کام بھی انور ظہیر نے سلیقے سے انجام دیا ہے۔ فیض، مجاز پر لکھے گئے مضامین ترقی پسند شعری جمالیات کی تفہیم میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔

دوسرے حصے کے مضامین میں بھی مصنف نے محنت تو کی ہے لیکن وہ بات بنتی نظر نہیں آتی ہے وراثت بھی بکھرتی نظر آتی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ مضامین بھی محنت سے لکھے گئے ہیں۔ سارے مضامین کا تعلق شاعری سے ہے۔ انور ظہیر شعریات پر بہتر نظر رکھتے ہیں اور سماجی اور تہذیبی سیاق وسباق میں تنقیدات کو پیش کرتے ہیں۔ کتابوں کی بھیڑ میں یہ ایک اہم کتاب ہے۔ 326 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت محض 155 روپے ہے جسے الہدیٰ پبلی کیشنز دریا گنج دہلی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

نظیر ثانی اشک امرتسری: تعارف ، تنقید اور تدوین کلام

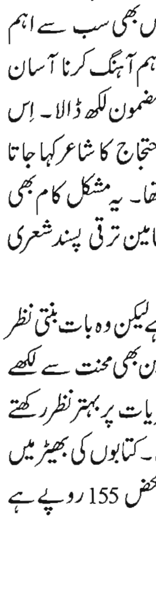

مصنف: ڈاکٹر معصوم شرقی

صفحات: 407، قیمت 400 روپے

ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

مبصر ڈاکٹر علاء الدین خاں

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

کم وبیش دنیا کی تمام زبانوں میں کچھ شاعر و ادیب ایسے [illegible] جاتے ہیں [illegible] پذیرائی جیسی ہونی چاہیے نہیں ہوئی۔ اردو ادب اس سے مبرّا نہیں۔ اگر تخلیق کار اپنا ناقد یا قاری پیدا نہ کرسکا تو وہ گمنامی کے اندھیرے میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ انھیں از سرِ نو تحقیق کے بعد متعارف کرنا مشکل امر ہے۔ لیکن معصوم شرقی نے اپنی بلند ہمتی، جہدِ مسلسل، وسعت مطالعہ سے اشک امرتسری پر تحقیقی کام کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ آج بھی اسکالر کے اندر محنت ولگن، صبر واستقلال اور ایمانداری کی چنگاری باقی ہے تو اپنی منزلِ مقصود کو پایا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر معصوم شرقی کی کتاب 'نظیرِ ثانی اشک امرتسری: تعارف، تنقید اور تدوین کلام' پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے لکھا گیا مقالہ ہے۔ جامعاتی سطح پر عصر حاضر میں اس نوعیت کا کام شاذ ونادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ کیونکہ نگراں اور مقالہ نگار دونوں ہی محنت سے جی چراتے ہیں۔ نتیجتاً معیاری تحقیق وتدوین کا کام منظر عام پر نہیں آتا ہے۔ اشک امرتسری بنیادی طور پر امرتسر کے رہنے والے تھے اسی مناسبت سے امرتسری کہلائے لیکن انھوں نے اپنی زندگی کا بیش تر حصہ کلکتے میں گزارا۔ کلکتے کے مشہور شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کی مقبولیت اور اہمیت کا یہ عالم تھا کہ کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب میں سونمبر کا ایک پرچہ اشک امرتسری کے کلام پر مشتمل ہے۔ اشک امرتسری 'نظیرِ ثانی' کے لقب سے کلکتے میں اس لیے معروف تھے کہ نظیرا کبرآبادی کا نمایاں رنگ ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔ مثلاً نظیرا کبرآبادی کی نظمیں 'آدمی نامہ، فقیر کی صدا، بنجارہ نامہ، تب دیکھ بہاریں ہولی کی' کے نام سے کلیات میں ملتی ہیں انھیں عناوین سے اشک امرتسری کے یہاں بھی نظمیں ملتی ہیں۔ گرچہ دونوں کے زمانے میں تقریباً ڈیڑھ سو سال کا فرق ہے۔ نظیر اکبرآبادی عوامی شاعر تھے اور اشک امرتسری بھی ترقی پسند تحریک سے وابستگی کی بنا پر عوامی شاعری کررہے تھے۔ لیکن دونوں کے پلیٹ فارم جدا تھے۔ ایک نے اپنے فن کی ترسیل کے لیے عوام کو ذریعہ بنایا تو دوسرے نے مشاعرے کو۔ لفظیات کی سطح پر دونوں کے یہاں واضح فرق ہے اور ایسا ہونا فطری عمل ہے۔

اشک امرتسری بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں اور وہ بھی پابند نظمیں جو کہ گیت کے فارم میں ہیں۔ انھوں نے غزلیں اور قطعات بھی کہے ہیں۔

یہ کتاب چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں ایک صفحے پر مشتمل مختصر مگر جامع انداز میں اشک امرتسری کے حوالے سے ڈاکٹر محمد حسن کی تحریر ہے، جس میں ان کی شاعری اور معیار ومقام سے بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر کرامت علی کرامت نے بھرپور انداز میں نظیرا کبرآبادی اور اشک امرتسری کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہوئے ان دونوں کی شاعری کے فرق اور مماثلت کو بیان کیا ہے۔ دوسرا حصہ 'تعارف وتنقید' کا ہے۔ جس میں ڈاکٹر معصوم شرقی نے کلکتے کے ادبی پس منظر اور منظر، اشک کے حالاتِ زندگی، ترقی پسند ادبی تحریک اور اشک، اشک بحیثیت نظم نگار، اشک بحیثیت غزل گو، اشک بحیثیت قطعہ گو، نظیر اور اشک کی نظم گوئی کے امتیازی پہلو اور ہم عصر شاعروں کے درمیان اشک کا مقام' پر بھرپور انداز میں تحقیقی وتنقیدی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

تیسرے حصے میں کلیات اشک کا واحد نسخہ جو علقمہ شبلی کے توسط سے انھیں ملا اس کی تفصیل رقم کی ہے۔ اور اسی حصے میں اشک کا ایک خط بنام مظہر امام شامل ہے۔ آخر میں دو سو انتیس صفحات پر مشتمل کلیات اشک امرتسری ہے جس میں 94 نظمیں، 17 غزلیں، 30 قطعات، ایک تضمین اور تین تین شعر پر مشتمل 'اشک' اور 'کابینی وفد' کے عنوان سے نظم شامل ہے۔ سب سے آخر میں چھ متفرق اشعار ہیں۔

ڈاکٹر معصوم شرقی نے کلیات اشک امرتسری کے واحد نسخے کو بنیاد بنا کر تحقیق وتدوین کا کام حسن وخوبی سے انجام دیا ہے۔ طباعت عمدہ ہے۔

مقالات مولانا شہودی

مرتب: فرد الحسن فرد

صفحات: 128

قیمت: 100 روپے

مبصر: طیب فرقانی:

محمد عربیؐ کے بعد علماء اور صوفیاء نے عالم انسانیت کی رہنمائی کی۔ ہندوستان بھی برگزیدہ ہندوؤں کے فیوض و برکات سے فیض یاب ہوا۔ زیر تبصرہ کتاب مولانا انوار الحق شہودی نازش سہسرامی کے ارشادات وفرمودات پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے جس نے سرزمین بہار سے اپنے دعوتی مشن کو جاری رکھا۔

مولانا صوبۂ بہار سہسرام کے صوفی عالم، استاد، مقرر، شاعر اور نثر نگار تھے جنھوں نے اپنے پیچھے متعدد ادبی، دینی، شعری اور نثری مطبوعہ وغیر مطبوعہ شہ پارے چھوڑے ہیں۔ اب تک ان کی آٹھ مطبوعہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور تین درجن کے قریب

غیر مطبوعہ ہیں۔ 'مقالات مولانا شہودی' الجیب الجمعیۃ دہلی، سیرت بنارس اور الجماعت لاہور جیسے رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ مولانا کے قابل علمی وارث اور نبیرہ فرد الحسن فرد نے ان مضامین کی ترتیب و تزئین کر کے افادۂ عام کے لیے پیش کیا ہے۔ یہ مضامین اپنے موضوعات کے لحاظ سے اسلامی، دینی اور دعوتی ہیں۔ چھوٹے سائز میں کل دس مضامین کا یہ انتخاب بظاہر رسالے کی شکل میں ہے لیکن امت مسلمہ کے لیے یہ گراں قدر خزینۂ غور وفکر ہے۔ مضامین کے مندرجہ ذیل عنوانات سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔'امت مسلمہ اور اس کے دینی فرائض، اسلامی معاشرہ اور اس کی چند اہم خصوصیات، اسلامی تصور حیات، مسلمانوں کی عوامی زندگی اور وقت کے جدید تقاضے، رہبانیت کی حقیقت کتاب و سنت کی روشنی میں، وحدت الہ، معراج انسانی اور قرآن حکیم، مساوات اسلامی کا ایک ورق، تلاش منزل اور مسلمان اور عمل جیسے عنوانات ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتے ہیں کہ مولانا امت مسلمہ کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور ان سے کس بات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے کے بعد فرد الحسن فرد کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ

''فرد، خاندان اور سماج جس انتشار کا شکار ہے۔ اس کے سدباب کے لیے حضرت نازش کے یہ مضامین ایسی راہ ہموار کرتے ہیں جس پر اگر عمل کیا جائے اور خود احتسابی کے مرحلے سے خود کو گزارنے کی کوشش کی جائے تو یقیناً کامیابی و کامرانی ہمارا مقدر بن سکتی ہے اور ہم رسوائی سے یہاں بھی اور وہاں بھی بچ سکتے ہیں۔''

128 صفحے کی اس کتاب میں مولانا شہودی کے مضامین کی ابتدا انیسویں صفحے سے ہوتی ہے۔ اس سے قبل تقریباً دس صفحوں پر 'حضرت مولانا شہودی: علم و روحانیت کے امتزاج کا ایک خوب صورت نمونہ' کے عنوان سے فرد الحسن فرد کی تحریر ہے جس میں مرتب نے مولانا شہودی کی شخصیت، علمی و روحانی وجاہت اور مولانا کے نثری اسلوب پر روشنی ڈالی ہے۔ مرتب نے مولانا کے نثری اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''ان کی نثر پرشکوہ نثر ہے، عالی شان نثر ہے، رمز و ایما اور تشبیہ و استعارہ سے پر نثر ہے، یہ خالص ادبی نثر ہے، اخباری نثر نہیں ہے، عوامی نثر نہیں ہے، میرے لیے بھی یہ بہت آسان نثر نہیں ہے، جیسے غالب کی شاعری محمد حسین آزاد کے حلق سے نہیں اترتی تھی اسی طرح مولانا شہودی کی نثر بھی آپ سے تقاضا کرتی ہے کہ آپ اپنی علمی اور لسانی سطح کچھ بلند کر لیں۔'' یہ دعویٰ صرف اسی وقت تک نادرست ٹھہرایا جاسکتا ہے جب تک آپ مولانا شہودی کے مضامین کا مطالعہ نہیں کر لیتے۔ ان کی نثر پر مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر کا اثر نمایاں ہے۔ تمام مضامین قرآن و حدیث کے حوالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان کے مضمون 'وحدت الہ' میں ساٹھ سے زائد آیات و احادیث کا حوالہ ہے۔ کہیں فارسی اشعار بھی ملتے ہیں۔ مولانا خود شاعر تھے اور جگر مرادآبادی کی شاگردی اختیار کی تھی۔ ثمر اور نازش تخلص اختیار کرتے تھے۔ شاعری کے تین مجموعے 'حرف تمنا، حریم شوق، اور نازش سہسرامی کے سو اشعار منظر عام پر آچکے ہیں۔ ایسے میں ان کی نثر میں جو رنگینی و رعنائی ہے اس کا اندازہ تو قارئین کتاب کے مطالعے کے بعد ہی لگا سکتے ہیں لیکن ایک جھلک یہاں ملاحظہ کریں:

''یہ عالم رنگ و بو، رنگہ برنگ کے بے شمار تصورات زندگی کی دل آویز مثالیں پیش کرتا ہے۔ چمن زار حیات میں یہ حسین گل کاریاں ہر زمانے میں دعوت قبول دیتی رہی ہیں۔ موسم بہار کی طرح یہاں بھی باغ و بہاراں کی رعنائیاں حسن و دل کشی کا سودا چکانے میں ہمیشہ آزاد رہی ہیں۔''

مولانا شہودی نے اپنے مضامین میں جابجا قرآنی آیات و عربی مقولات کو اس طرح استعمال کیا ہے گویا وہ اردو کا حصہ ہوں اس لیے ان کے مضامین کے مطالعے کے لیے علمی سطح کا بلند ہونا ضروری ہے۔ بسا اوقات کسی جملے یا اقتباس کو سمجھنے کے لیے دوبارہ اور سہ بارہ پڑھنا پڑتا ہے۔ یہ مضامین ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کے ہیں۔ بلند خیالی سے پر علمی نثر کی یہی خصوصیت ہوتی ہے لیکن ایک بات جو شدت سے کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ بہت سے مقامات پر آیات و احادیث غیر مترجم چھوڑ دیے گئے ہیں۔ یہ مرتب کی ذمے داری تھی کہ وہ ان کا ترجمہ بھی کرتے تاکہ غیر عربی داں بھی ان مضامین سے استفادہ کر سکیں۔ ساتھ ہی تخریج بھی کی جانی تھی تاکہ حوالوں کے جدید تقاضوں کو پورا کیا جاسکے اور جہاں مولانا نے آیات ادھوری چھوڑ دی ہے وہاں قوسین میں آیات کو مکمل کیا جانا تھا۔ کمپوزنگ کی غلطیاں کم ہیں۔ مجموعی طور سے کتاب علمی اور ادبی تمام جہتوں سے مفید ہے۔ امید کی جاتی ہے۔ اہل علم و ادب اس سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

سفر گزار

مصنف: جمنا پرشاد راہی

صفحات: 216، قیمت: 350 روپے

ناشر: مصنف

مبصر: رئیس الدین رئیس، 10/1725، دہلی گیٹ، علی گڑھ

جمنا پرشاد راہی اکابرین سخن کے کلاسیکی مزاج و انداز سے متاثر تو ضرور نظر آتے ہیں مگر ان کا لب ولہجہ اور اسلوب جدیدیت کا حامل ہے۔ وہ راست طور پر بات کہنے کے بجائے تراکیب و استعارات اور رموز و کنایات کے وسیلے سے ایک الگ ہی انداز میں کہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے کلام پر نہ تو فرسودگی و کہنگی کی چھاپ ہے اور نہ ہی ان کا کلام عدم ابلاغ کا مسئلہ کھڑا کرتا ہے۔ ان کا اپنا ڈکشن ہے اپنے موضوعات ہیں اپنے تجربات و اکتسابات ہیں یہی وجہ ہے دنیائے شعر و سخن میں راہی کی آواز نئی اور سب سے جدا آواز ہے اور وہ ایک منفرد صاحب اسلوب شاعر ہیں۔ وہ خود بھی اپنی شاعری کے بارے میں کلی طور پر درک و آگہی رکھتے ہیں۔ قدیم عہد سے اپنی شاعری کے مربوط ہونے کا اعتراف کرنے کے باوجود انھیں خود فخر ہے کہ انھوں نے نو بہ نو زمینیں تراش خراش کر کے ان میں بڑے انمول گل بوٹے اگائے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ ان کی شاعری عہد رفتگاں کا مرثیہ بن کر رہ جائے۔ اس سے بچنے کے لیے تو وہ نت نئی بندشوں اور ترکیبوں سے اپنے اشعار میں جدت و ندرت کے رنگ بھرتے رہتے ہیں اور نئے نئے معانی و مفاہیم سے اشعار کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتے ہیں اور جب وہ فن شعر و سخن کے لیے اتنا سب کچھ کرتے ہیں تو ارباب نقد سے داد خواہی کی تمنا کو غلط نہیں مانتے اپنا حق سمجھتے ہیں۔ یہ بات میں نے اپنی طرف سے نہیں کہی ہے۔ یہ خیالات بذات خود میرے استاد جمنا پرشاد راہی کے ہیں جو ان کے درج ذیل اشعار سے بھی مترشح ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

قدیم عہد سے میرے سخن کا رشتہ ہے — مگر تراش رہا ہوں نئی زمینوں کو
شعر و نغمہ کو نئی بندش نئے ایام دو — ورنہ عہد رفتگاں کا مرثیہ کہلاؤ گے
نو بہ نو تازہ مفاہیم کا مظہر ہوگی — میرے الفاظ کی بوسیدہ قبا میرے بعد
امیرِ نقد و نظر میرا حوصلہ دیکھیں — کہاں سے ڈھونڈ کے لایا ہوں ان نگینوں کو

راہی بات میں وسعت، تہہ داری اور گہرائی و گیرائی پیدا کرنے اور شعر کو باوقار بنانے کے لیے غایت درجہ نادر الوضع تراکیب مرتب کرنے میں فقید المثال ہیں۔ ان کی چند تراکیب و استعارات ملاحظہ ہوں۔

پس پردہ ترتیب عناصر، ضارب سنگ آزما، رخش قدم انداز زخم زار سینہ صد چاک، بے گمان نطق سوزاں، وادی خواب سحر، شکست و ریخت، بحر کوچہ گریاں، پروردگار شب وغیرہ راہی ذات سے آگے حیات و کائنات تک کا سفر کرتے ہیں۔ ان کی آپ بیتی جگ بیتی بھی ہوتی ہے۔ وہ نہایت حساس شخصیت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حسی کیفیات بڑی رعنائی و زیبائی اور جمالیاتی شعور و وفور کے ساتھ ان کے فنی پیکروں میں مجسم ہو جاتی ہیں۔ اس

ذیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حاصل جو کرب ذات کی بے چارگی کا ہے　　صفحاتِ زندگی سے وہ قصہ تلف نہ کر
رفتہ رفتہ موسموں کے رنگ یوں بکھرے کہ بس　　ہے مرے اندر کوئی زندہ مگر ٹوٹا ہوا
ہم تنہا معتوب سفر اُس موڑ پہ آپہنچے کہ جہاں　　اپنے کاندھوں پر خود اپنی ارتھی ڈھونا لگتا ہے
تمام عمر سرابوں کی فصل کاٹی ہے　　عجب زمین میں بویا تھا خواب دریا کا
بکھر رہا ہوں شکستہ خیال کی صورت　　نہیں ہے لمحہ کوئی انتشار سے خالی
گھٹ کے مرجاؤں گا للہ بچا لو مجھ کو　　میں سمندر ہوں سرابوں سے نکالو مجھ کو

راہی خوں خرابہ اور جنگ وجدل کو زندگی کا دشمن مانتے ہیں۔ وہ خیر سگالی و یکجہتی اور امن و آشتی کے پیغامبر ہیں۔ وہ دلوں میں بھڑکتی ہوئی آتش حسد و انتقام کو بجھا کر اس کی جگہ دلوں میں انسانیت کا درد جگا دینا چاہتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ جھوٹ اور دروغ گوئی کے خلاف جہاد کرنے پر بھی ہمہ وقت کمر بستہ رہتے ہیں:

اگاؤ درد کی فصلیں کہ زندگی جاگے　　لہو کی فصلیں اُگاتے ہوئے زمانہ ہوا
اگر یہ آئینہ سچ بولنے سے ہے قاصر　　تو میرے ہاتھ کا پتھر اچھلنے والا ہے

راہی کی فکر کا انداز فلسفیانہ ہوتا ہے۔ وہ موضوع کے اعماق میں اُتر کر فکر کے گوہر آبدار پا کر ہی سطح آب پر واپسی پسند کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں فکر و آگہی کے خزانے بھرے پڑے ہیں:

ہر روح پسِ پردہ ترتیب عناصر　　ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہی ہے
بے آگہی ذات سفر میں ہے زندگی　　صحرائے بے خودی ہے ہمارا ٹھکانہ کیا
پھر زمیں چوس رہی ہے مرے تلووں سے لہو　　تم جو ارجن ہو تو تیروں پہ اٹھا لو مجھ کو

راہی کی شاعری کی ایک نمایاں جہت ان کے عزائم اور ان کا حوصلہ بھی ہے:

اٹھو کہ منزلیں آواز دے رہی ہیں تمھیں　　بڑھو کہ صرف نظر کا بھرم ہیں دیواریں

غزل کی طرح راہی کو رباعی پر بھی قدرت کاملہ حاصل ہے۔ انھوں نے ابتدا اور صدر میں ارکان کی الٹ پھیر سے 84 اوزان میں رباعی کہہ کر یقیناً کارنامہ کر دکھایا ہے۔ ان کے اس کام کو سراہا جائے گا اور سفر گزار کو دنیائے ادب میں نمایاں مقام حاصل ہوگا۔

غزل کی تنقید

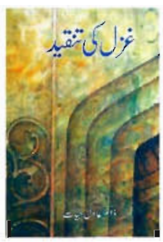

مصنف: ڈاکٹر عادل حیات
صفحات: 543، قیمت: 245 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، کوہسار، بھیکن پور 3، بھاگلپور

تنقید میں تحلیلی رویے کو اہمیت حاصل ہے۔ Value Judgement کی وجہ سے جذبات اور انانیت پر یہ براہ راست اثر انداز ہوتی ہے اور فن پارے کی صفات کو معروضی طور پر بیان کرنے اور معنی کی تہیں تلاش کرنے کا عمل سامنے لاتی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع اس کتاب میں ڈاکٹر عادل حیات نے غزل کی تنقید کے تمام ممکنہ پہلوؤں پر گہری نظر ڈالی ہے اور نئے نکات بھی پیش کیے ہیں۔ چھ ابواب پر مشتمل یہ کتاب اردو غزل کی تقریباً تمام جہات و سرمایے کو سمیٹے ہوئے ہے۔ تاریخی تناظر، تنقید کی تعریف، غزل تنقید کیا ہے، غزل تنقید کے بنیادی مراحل، غزل تنقید 1857 کے بعد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، امداد امام اثر، نیاز فتح پوری، مسعود حسین رضوی ادیب، غزل تنقید اور دو متوازی میلانات، ترقی پسند تحریک، حلقۂ ارباب ذوق، غزل تنقید اور جدیدیت، غزل اور نئی تنقید، صنف غزل کے چند معروف نکتہ چیں، الطاف حسین حالی، نظم طباطبائی، عظمت اللہ خاں، جوش ملیح آبادی، کلیم الدین احمد، ظ انصاری اور اختر الایمان جیسے عنوانات کے تحت اور ذیلی سرخیاں قائم کر کے، ان سے بحث کر کے نیز ماخذوں اور روایتوں کو کھنگال کر ڈاکٹر عادل حیات نے غزل کی تنقید کا حق ادا کیا ہے۔ انھوں نے فنی و فکری اور ہیئتی خصوصیات کو موضوع بحث بنا کر انفرادیت کو اجاگر کیا ہے اور گوناگوں پہلوؤں پر کئی زاویے سے روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح رسوم و عقائد کے ساتھ تہذیب و ثقافت کی غمازی ہوتی ہے اور معنوی جہات کے مراحل کی تفہیم سامنے آتی ہے۔

ضخامت کے اعتبار سے 543 صفحات پر مشتمل کتاب 'غزل کی تنقید' اپنے متعین عنوان کے ساتھ توضیحاتی اوصاف سے متصف ہے۔ ہر موضوع کو اقتباسات و دلائل سے مصدق و محقق صورت میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ بلا ضرورت بحث کو طول دینے سے احتراز کیا گیا ہے۔ تاہم جو مباحث طویل ہیں وہ تقاضائے حال کے مطابق ہیں۔ اقتباسات کے ضمن میں بیشتر مورخین ادب کے اقوال و تحریریں نقل کی گئی ہیں۔ نثری انتخابات کے ساتھ اشعار بھی درج کیے گئے ہیں لیکن خال خال ہیں۔

اثنائے تبصرہ یہ محسوس ہوا کہ مصنف نے غزل کے موضوع کو سمجھنے کے لیے غزل کی تاریخ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ ان کا دائرۂ غزل فہمی کافی وسیع ہے۔ غزل کے مزاج کے اعتبار سے انھوں نے غزل کے توسیعی و امکاناتی رویے کی تفہیم پر تسلی بخش گفتگو کی ہے۔ نیز نقاد شعرا و ائمہ غزل کی نادر تحریروں کا محاکمہ ہے۔

غزل تنقید کے بنیادی تصورات اور لائحہ عمل کا ذکر کرتے ہوئے عادل حیات لکھتے ہیں:

''غزل تنقید میں ناقد کا ذہن غزل کے تمام تصورات اور اس کی صنفی تشکیل سے پوری طرح ہم آہنگ ہونا چاہیے تاکہ اس کی تنقید میں گہرائی و گیرائی کے ساتھ توازن بھی پیدا ہوسکے۔ غزل کی اس خصوصیت سے واقفیت کے بغیر تنقید میں وہ گیرائی پیدا نہیں ہوسکتی جو معیاری تنقید کے لیے لازمی ہے۔'' (ص29)

غزل کی تنقید کے ناقدین کے لیے روایت سے واقفیت بھی ضروری ہے تاکہ آغاز کے محرکات، مجموعی مزاج، تشکیلی عناصر اور عہد بہ عہد رونما ہونے والی تبدیلیوں سے آگہی ہوسکے۔ ساتھ ہی اس عہد سے واقفیت کی بھی اہمیت ہے جس عہد میں زیر گفتگو غزل اپنے تخلیقی مراحل سے گزری ہے۔ عادل حیات نے ماضی اور حال کی مضبوط روایت سے مدلل بحث کی ہے اور غزل کے بیشتر سرمایے پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے جس میں تحقیق سے بھی کام لیا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے نمائندہ افسانے

مرتبہ: ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ
صفحات: 280، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: عبدالکریم رضوان، بی 114 یادو بلڈنگ، نئی دہلی

قرۃ العین حیدر کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن و دل میں ان کی خوبصورت تصویر اور دلکش تحریر اپنی تمام رنگارنگی کے ساتھ گردش کرنے لگتی ہے۔ دوسروں کے بارے میں مجھے علم نہیں لیکن قرۃ العین حیدر کو میں نے تحریر و تصویر سے ہی جانا پہچانا اور سمجھا ہے۔ قرۃ العین حیدر نامور شہرت یافتہ رومان پسند ادیب سید سجاد حیدر یلدرم کی بیٹی ہونے کے علاوہ خود بھی ایک ادب فہم، ادب نواز اور ادب ساز ادیبہ تھیں۔ انھوں نے نہ صرف ناول نگاری، ترجمہ نگاری، رپورتاژ سفرنامہ اور صحافتی تحریروں سے اردو زبان و ادب کی خدمت کی بلکہ افسانہ نویسی کے میدان میں بھی اردو ادب کو باوقار اور باعظمت بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ خواتین افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر کا نام بہت ہی پرکشش اور بڑا نام ہے۔ ان کے افسانے انسانی زندگی و انسانی سماج کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ ہندو پاک کے

تہذیب وتمدن اور خود ان کی حقیقی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں جس کے اندر تقسیمِ ہند سے قبل اور بعد کے منظر نامے، ہندو مسلم گھرانوں کی تہذیب، مرد د عورت کے جذباتِ واحساسات کی عکاسی اور نسوانی کرداروں کی بے باکانہ نمائندگی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے بہت کچھ لکھا، ان پر بہت کچھ لکھا گیا اور آئندہ بھی ان پر لکھنے والے بہت کچھ لکھیں گے۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی 'قرۃ العین حیدر کے نمائندہ افسانے' بھی ہے۔ جسے ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ نے ترتیب دیا۔

ریحانہ سلطانہ اردو زبان وادب کی اسکالر ہونے کے ساتھ ساتھ گوتم بدھ یونیورسٹی نوئیڈا کے شعبۂ اردو میں بحیثیت استاد اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے رہی ہیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ محترمہ نے اپنے طالب علمانہ تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے استادانہ شعور کا جامہ پہنایا ہے کیونکہ اس کتاب میں دس ایسے افسانوں کا انتخاب کیا گیا ہے جو مختلف یونیورسٹیز و جامعات کے علاوہ کئی مقابلہ جاتی امتحانات کے نصاب میں ہوتے ہیں۔ ممکن ہے محترمہ ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ ادب کے قارئین کی آسانی اور طلبا و طالبات کی اشد ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کتاب ترتیب دی ہو۔ کتاب میں شامل پہلا افسانہ 'جلاوطن' چالیس صفحوں پر مشتمل اپنے اندر ہندو مسلم، تہذیب، قومی یکجہتی تقسیم وطن کے اسباب و جوہات، شعبہ گھرانوں کے رسم و رواج کو سمیٹے ہوئے ایک تاریخ بیان کرتا ہے۔ افسانے کے خاتمے کے فوراً بعد ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ کا افسانے پر کیا ہوا تجزیہ شامل ہے جسے پڑھ کر افسانے کو سمجھنے میں آسانی اور کئی مبہم سوالات کے جوابات ہمیں مل جاتے ہیں۔ دوسرا افسانہ 'ستاروں سے آگے' جو علامہ اقبال کے شعر کے ایک مصرعے سے اخذ کیا گیا ہے جس کے عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ نوجوان نسل اپنی سوچ، فکر، ارادے اور مقاصد کے ذریعے مادّی دنیا کے ساتھ غیر مادّی دنیا میں بھی کمندیں ڈالنے کا جذبہ اور حوصلہ رکھتی ہے، جس کی مزید وضاحت اس افسانے کے اخیر میں شامل تجزیے سے ہو جاتی ہے۔

مندرجہ بالا افسانوں کے علاوہ کیکٹس لینڈ، پت جھڑ کی آواز، کارمن، قلندر، روشنی کی رفتار، فوٹوگرافر، حسب نسب اور نظارہ درمیاں جیسے شاہکار افسانے اور ان کا تجزیہ بھی اس کتاب میں شامل ہے جس میں ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ نے اپنی علمی صلاحیت اور ناقدانہ بصیرت کو بروئے کار لاتے ہوئے بے باکانہ رائے بھی قائم کی ہے۔ کہیں کہیں انھوں نے دوسرے ناقدین کے حوالے اور اقوال کو پیش کر کے اپنے تجزیے کو مدلل اور تحقیقی بنا دیا، جو افسانے کی تفہیم میں معاون ثابت ہوگا۔ افسانوں اور تجزیوں کے بعد قرۃ العین حیدر کے سوانحی کوائف اور ادبی کاوشوں کی مختصر تاریخی فہرست بھی شامل کی گئی ہے جسے پڑھ کر قارئین قرۃ العین حیدر کی اسی سالہ زندگی (1927 تا 2007) کے علمی، تخلیقی اور ادبی کارناموں سے واقف ہو سکیں گے۔

دو سو اسّی صفحات پر مشتمل یہ کتاب اپنے موضوع و مواد کے ساتھ خوبصورت طباعت اور رنگین سرورق جس کے ایک جانب قرۃ العین حیدر کی یادگار تصویر اور دوسری طرف اسلم جمشید پوری صاحب کے تبصراتی کلمات چھپے ہیں جو قارئین اور ادب شناس کو مطالعے کی دعوت دینے کے لیے کافی ہے۔ ایک خاص اور اہم بات جس کی وجہ سے میں حیرت میں ہوں کہ محترمہ ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ نے تمام افسانوں پر تحقیقی اور تنقیدی انداز کا عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے لیکن کتاب کے سرورق پر اور اپنے پیش لفظ میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ کتاب کے ٹائٹل پیج پر 'ترتیب و انتخاب' کے ساتھ لفظ 'تجزیہ' بھی شامل کرنا چاہیے تھا۔ بہرحال امید ہے کہ اردو زبان و ادب سے تعلق رکھنے والے طلبا و طالبات اسے قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور ادبی حلقوں میں اس کتاب کی مزید پزیرائی ہوگی۔

اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے اہم انشائیہ نگار

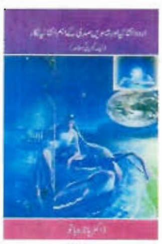

(ایک تجزیاتی مطالعہ)

مصنفہ: ڈاکٹر ہاجرہ بانو

صفحات: 306، قیمت 300 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔ 95

مبصر: محمد نوشاد عالم ندوی

A - 128، تھرڈ فلور، شاہین باغ، نئی دہلی

اردو انشائیہ نے بہت قلیل عرصے میں انتہائی برق رفتاری سے اپنے تخلیقی سفر کو کامیابیوں سے ہمکنار کیا ہے۔ یہ ایک سچ ہے کہ اردو میں اگرچہ ہر ادبی موضوع پر تحقیقی وتنقیدی کتب کی بڑی تعداد دستیاب ہیں، لیکن انشائیہ نگاری ایک ایسا موضوع ہے جس پر کم ہی کتابیں ملتی ہیں۔ اس کا اندازہ ڈاکٹر ہاجرہ بانو کی کتاب 'اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے اہم انشائیہ نگار' کے مطالعے سے بخوبی ہو رہا ہے۔ واقعی زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب کتاب نے اس کی پوری کوشش کی ہے کہ وہ اردو انشائیہ کو ایک الگ مقام دلا سکے۔ ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے نہ صرف اردو میں انشائیہ نگاری کی تاریخ کا گہرائی وگیرائی سے تجزیہ کیا ہے بلکہ یوروپی بالخصوص انگریزی وفرانسیسی زبانوں کی تاریخ انشائیہ نگاری پر بھی ان کی اچھی اور گہری نظر ہے۔ یقیناً صاحب کتاب نے اپنی تحقیق وتدوین سے انشائیہ کی تقدیر کو تابندہ کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریر کے ذریعے انشائیہ کی انفرادیت کو پوری طرح سے ابھارا ہے۔ ان کی یہ کتاب کئی معنوں میں اہمیت کی حامل ہے ان میں سے ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے 105 انشائیہ نگاروں پر روشنی ڈالتے ہوئے پاکستان کے 30 انشائیہ نگاروں پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے انشائیہ کے خدوخال، فنی، فکری، سماجی اور سیاسی سروکار کو پرکشش بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے زیر مطالعہ کتاب میں انگریزی اور فرانسیسی انشائیہ نگاروں اور مغرب کی دیگر زبانوں کے انشائیہ نگاروں کے حوالے بھی دیے ہیں، جو اس کتاب کی مقبولیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر ہاجرہ بانو کا انشائیہ اپنے میزان پر پورا اُترتا ہے، کیونکہ انھوں نے اپنے تخلیقی عمل کو سوچ سمجھ کر اس کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر پورا کیا ہے۔ اس میں اسلوب کی تازہ کاری، معانی کے نئے اُفق اور انسانی شعور کی نئی سمتیں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا یہ انشائیہ ہماری ذہنی بالیدگی میں اضافہ کرے گا اور ہمارے تہذیبی شعور کو ضرور بالضرور جلا بخشے گا۔ انھوں نے ابواب کی ترتیب جو دی ہے وہ بھی لائق تحسین ہے۔ ان کی یہ تحریر 6 ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی کتاب کی مقبولیت کے لیے اس کے ابواب کی تقسیم بنیادی مرحلہ ہوتا ہے۔ اس میں اگر کجی رہ جاتی ہے تو پوری کتاب میں اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ہاجرہ بانو کی ترتیب ان کے ذہنی آفاق اور وسعت مطالعہ پر غماز ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کا پہلا باب انشائیہ کے خدوخال پر قائم ہے، جس میں انھوں نے انشائیہ کی انفرادیت پر مفصل بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس پر بھی بحث کی ہے کہ آخر انشائیہ نثر کی دوسری اصناف یعنی افسانہ اور مضمون وغیرہ سے کس حد تک مختلف ہے۔ انھوں نے ان اوصاف کا بھی احاطہ کیا ہے جو انشائیے کو دوسری اصناف سے الگ کر دیتا ہے۔ دوسرا باب 'انشائیہ ایک منفرد اسلوب نگارش' میں انھوں نے ایک منفرد اسلوب نگار کے طور پر انشائیہ کا ناقدانہ ومحققانہ جائزہ لیا ہے۔ باب سوم میں انشائیے کی اہمیت وافادیت پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے، جس میں انھوں نے مفصل ومدلل بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہی وہ واحد صنف ادب ہے جس کے بارے میں بڑے نزاعی نظریات اور جذباتی مقالات لکھے جاتے ہیں۔ اس کی تعریف اور آغاز دونوں پر کافی بحث ہوتی رہی ہے اور

صاحب کتاب نے بھی انشائیوں کا احاطہ کر کے اپنے نتائج اخذ کیے ہیں اور ان ہی آراء و نتائج کی روشنی میں انھوں نے انشائیہ کے مستقبل کے بارے میں رائے قائم کردی ہے۔ باب چہارم بیسویں صدی کی انشائیہ نگاری پر محیط ہے۔ باب پنجم میں پاکستان میں انشائیہ پر طائرانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ آخری باب یعنی ششم میں مغرب کی انشائیہ نگاری پر نظر ڈالی گئی ہے۔

کچھ دانشوروں نے انشائیہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انشائیہ زندگی کے موجودہ مظاہر، تجربات اور معمولات کو آزادروی، خوش خیالی اور زندہ دلی سے دیکھنے اور اس کے انوکھے گوشوں کو نثر کے تخلیقی اسلوب، کفایت لفظی، غیر رسمی انداز اور دوستانہ ماحول میں پیش کرنے سے عبارت ہے۔ انشائیے کے ابتدائی نقوش قدماء کے یہاں کچھ اس طرح نظر آتے ہیں مثلاً ملاوجہی کی سب رس، غالب کے خطوط کے چند ٹکڑے، مضامین سرسید، ابولکلام آزاد کی کتاب غبار خاطر' کے کچھ حصے اور کرشن چندر کے چند مضامین میں انشائیے کی خوبیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے ملاوجہی کی سب رس، نیرنگ خیال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کے جن جن مضامین میں انشائیہ کی جھلکیاں ملتی ہیں اس کا تجزیہ بھی کیا ہے اور انھوں نے اس سے یہ ثابت کیا ہے کہ انشائیہ عہد بہ عہد کس طرح منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے اردو کی تخلیق 'سب رس' میں بھی انشائیہ کے عناصر پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو کی اس کتاب میں بھی انشائیہ کے عناصر ملتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہماری اردو زبان انشائیہ کے لحاظ سے دنیا کی کسی دیگر زبان سے پیچھے نہیں ہے۔ انشائیہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انشائیہ نگار کی توجہ مغز و مضمون سے ہٹ کر حسن عبارت پر ہونی چاہیے، جس کا ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے خاص خیال رکھا ہے۔

ماهنامه نیادور 'والی آسی نمبر'

ایڈیٹر: ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی
صفحات: 200، قیمت: 50 روپے، سنہ اشاعت: جنوری 2013
ناشر: محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش
مبصر: عادل فراز، مدرسہ سلطان المدارس، نزد میڈیکل کالج، لکھنؤ

ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کی ادارت میں شائع ہونے والے خصوصی نمبروں کی فہرست میں ایک اور قابل قدر اضافہ ہوا۔ اس بار نیادور کا والی آسی نمبر ان کی حیات اور شعری خدمات پر مبنی ہے۔ اس نمبر کے تمام مشمولات اردو ادب کے کچھ اہم دانشوروں کے افکار و نظریات سے آراستہ ہیں۔ آغاز والی آسی کے ایک مضمون 'نعت کا ارتقا' سے ہوا ہے جو ان کی تخلیقی اور تحقیقی کاوش کا ایک نمونہ ہے، والی آسی مرحوم نے نعت جیسی مقدس صنف سخن کا تاریخی جائزہ پیش کیا ہے۔ مضمون پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ مصنف نے خود کو تحقیقی الجھنوں سے بچانے کے لیے محض کچھ متردد اور متشکک بیانات کی روشنی میں پورا مضمون قلم بند کردیا جس کی وجہ سے ان کا قلم کچھ اہم تاریخی غلطیوں کا مرتکب ہوگیا۔

مصنف مرحوم نے اس مضمون میں پہلا نعت گو شاعر 'میمون بن قیس اعشیٰ' کو قرار دیا ہے جو تاریخی حقیقت کے برعکس ہے۔ میمون بن قیس اعشیٰ زمانۂ جاہلیت کا شاعر تھا اور سبع معلقات میں اس کا قصیدہ بھی شامل ہے۔ لیکن وہ نعت کہنے والا پہلا شاعر نہیں ہے۔ اس کا واقعہ تاریخی کتب میں یوں ہے "اعلان رسالت کے بعد جب اعشیٰ کو حضور کی بعثت کی خبر ملی تو وہ آپ کی شان اقدس میں ایک قصیدہ کہہ کر درہم و دینار کی حرص میں حجاز کی طرف روانہ ہوا۔ ادھر ابوسفیان کو یہ اطلاع مل گئی کہ اعشیٰ نے محمد عربیؐ کی شان میں اشعار کہے ہیں۔ ابوسفیان نے اپنے ساتھیوں اور قبیلے کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "بخدا اگر اعشیٰ محمد کے پاس پہنچ گیا یا کہیں ان کی اتباع کرلی تو وہ اپنے اشعار سے سارے عرب کی آگ تمھارے خلاف بھڑکا دے گا۔ چنانچہ قریش نے سو اونٹ جمع کیے اور حجاز و نجد کی درمیانی راہ میں ہی اعشیٰ کو جالیا۔ سو اونٹ اس کی نذر کیے اور واپس چلے جانے کے لیے خوشامدیں کرنے لگے۔ اعشیٰ نے مقصدؐ رسول کی مدح سرائی سے حصول دولت تھا لہٰذا وہ سو اونٹ اور کچھ مال و اسباب لے کر نعمت اسلام سے محروم واپس لوٹ گیا۔ مگر قدرت خدا کا کمال دیکھیے ابھی وہ راستے میں ہی تھا کہ اس کی اونٹنی نے اسے اپنی پشت سے گرادیا اور سینے سے زمین پر رگڑ رگڑ کر ہلاک کردیا۔" (عربی میں نعتیہ کلام، مقالہ اعشیٰ کی نعت ص 44-43)۔ اس طرح کا تسامح ذکی مبارک کو بھی ہوا تھا جنھوں نے ایک رسالہ بعنوان 'المدائح النبویہ فی الادب العربی' تحریر کیا۔ جس میں اس نے اعشیٰ کو ہی پہلا نعت گو شاعر کہا ہے۔ جب کہ اعشیٰ نے حضور کی شان اقدس میں اشعار کہے تھے۔ لیکن اعلان نبوت سے پہلے جس نے حضور ختم مرتبتؐ کی شان میں اشعار کہے جو بعد میں نعت کہلائے۔ جناب ابوطالبؑ کی ذات والا صفات تھی۔ اس بات کا ذکر خود محقق بصیر عبداللہ عباس ندوی "نے بھی کیا ہے انھوں نے عربی نعت گوئی پر ایک مستند رسالہ 'عربی میں نعتیہ کلام' تحریر کیا جس پر نابغہ روزگار مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ایک مبسوط تقریظ بھی تحریر کی ہے۔

اس نمبر میں معروف صحافی حفیظ نعمانی کی تحریر 'درویش صفت شاعر' ایک تاثراتی اور ذاتی تعلقات پر مبنی عمدہ تحریر ہے۔ حفیظ نعمانی بڑے سلیقے کے ساتھ والی آسی کی ادبی، سماجی اور خانگی مشغولیات کے ساتھ ان کی کلفتوں اور ذہنی اذیتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ جس میں والی آسی کی شخصیت کے کئی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

رباب رشیدی 'والی آسی کچھ یادیں کچھ باتیں' فیاض رفعت 'ہمارے والی بھائی' مسعود الحسن عثمانی 'ایک درویش کی کہانی' انور جلالپوری 'ادب کی شخصیات کا مرکز' ڈاکٹر رضوان احمد 'والی آسی یادوں کے آئینہ میں' شاہنواز قریشی 'والی آسی کچھ پہلو چند خصوصیات' شافع قدوائی 'ہم نے اک شام چراغوں سے سجا رکھی ہے' خوشبیر سنگھ شاد 'مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا' عبیداللہ ناصر ایڈیٹر قومی خبریں 'والی آسی شاعر اور شاعر گر' ڈاکٹر شاہدہ صدیقی 'آہ! والی بھائی' نافع قدوائی 'دھوم مچانے والے شاعر والی آسی' اور قطب اللہ 'فقیر سب کے لیے انتظام رکھتے ہیں' جیسی تمام تحریروں میں والی آسی کی ذات سے عقیدت کا اظہار اور دیرینہ ملاقاتوں کا رسمی بیان ہے۔ ملک زادہ جاوید کا مضمون 'والی آسی، یادوں کے تناظر میں' سنجے مصرا شوق 'ذات والی، دین وادب کا حسین سنگم' عائشہ صدیقی کی تحریر 'میرا بھائی والی آسی' مرحوم کی حیات اور ان کے کارنامے اور مکتبہ دین وادب کی نشستوں اور ذاتی ملاقاتوں پر مبنی تحریریں ہیں۔ رئیس انصاری کا مضمون 'والی آسی یاد تجھ کو کر رہا ہے لکھنؤ' میں والی آسی کی شاعری اور شخصیت کے کئی امتیازی اور انفرادی پہلو ہیں۔ اگر شمارہ میں والی آسی کی حیات و خدمات پر محترم حفیظ نعمانی اور رئیس انصاری کے ہی مضامین ہوتے تو شاید دیگر مضامین کی کمی محسوس نہ ہوتی۔

ڈاکٹر رضوان احمد نے اپنے مضمون 'والی آسی یادوں کے آئینہ میں' کی آخری سطور میں، احمد ابراہیم علوی 'حقیقتوں کا ترجمان شاعر' میں اور حسین امین کے مضمون 'شہد اور موم کے خالق والی آسی' میں بڑی حد تک موصوف کے کلام کے فنی محاسن کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مرزا شفیق حسین کی تحریر 'والی آسی کی غزل میں کربلا کی عصری معنویت سے تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی کا یہ جملہ والی آسی کا ادبی قد متعین کرنے کے لیے کافی ہے 'والی بھائی بہت بڑے شاعروں میں نہیں تھے لیکن زندگی وفا کرتی تو بڑے شاعر ضرور ہوجاتے' کیونکہ ان کے کلام میں زبان و بیان کا رچاؤ بہت خوبصورت ہے جسے پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ واقعی لکھنؤ بول رہا ہے"۔ عصمت ملیح آبادی کا یہ فرمودہ حقیقت پر مبنی ہے۔ اس خصوصی شمارے میں نئی نسل کے قلمکار اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے میں کامیاب ہیں اور والی آسی کے فنی ابعاد و جہات پر کئی لطیف اشارے کرتے ہیں۔ نئی نسل کے یہ تمام قلمکار لائق مبارکباد ہیں۔ ■

عالمی اردو نامہ

کویت میں انجمن تہذیب کا عالمی مشاعرہ

کویت: انجمن تہذیب اردو، کویت کی جانب سے ہر سال کی طرح اس سال بھی ایک عالمی مشاعرہ کویت میڈیکل ایسوسی ایشن کے آڈیٹوریم میں منعقد کیا گیا جس کی صدارت کلیم قیصر نے کی جب کہ نظامت کے فرائض انور جلال پوری نے انجام دیے۔ مشاعرے کے پہلے حصے کی نظامت فیاض وردگ نے کی۔ کنوینر مشاعرہ عامر قدوائی نے مہمانوں اور شعرا کا استقبال کیا۔ انھوں نے کہا کہ کویت میں یہ ان کی انجمن کا تیسرا مشاعرہ ہے اور وہ ہر سال اس مشاعرے کو منعقد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کویت میں مقیم اردو کے سرپرستوں اور شائقین کی دلچسپی کی بنا یہ مشاعرہ ممکن نہیں تھا۔ اس دوران مشاعرے کے سووینیر اور فاض وردگ کے تازہ شعری مجموعہ 'شہر حروف' کی رسم اجرا انور جلال پوری، کلیم قیصر اور ڈاکٹر ماجد دیوبندی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

جن شعرا نے شرکت فرمائی ان میں کویت میں مقیم شعرا عامر قدوائی، فیاض وردگ، عیسیٰ بلوچ، بدر سیماب، افروز عالم، صابر عمر، شکل جمشید پوری، نظر کڑپوی اور شاعرات میں شاہین رضوی، تاجور سلطانہ اور شاہجہاں جعفری کے علاوہ ہندوستان سے انور جلالپوری، کلیم قیصر، ڈاکٹر ماجد دیوبندی، اسیر برہانپوری، انجم بارہ بنکوی، رشید قریشی، اختر گوالیاری، اسرار جامعی، تشنہ عالمی، مجاہد فراز کے علاوہ شیاما سنگھ صبا اور نزہت انجم کے نام شامل ہیں۔

کویت میں انجمن تہذیب اردو کے تحت عالمی مشاعرے میں شعرائے کرام ودیگر

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 18 فروری 2014

دستکوں کا نشاں

دوحہ قطر: ممتاز اردو شاعر ندیم ماہر قطر کی تازہ ترین شعری مجموعہ دستکوں کا نشاں کی رونمائی دوحہ میں عالمی شہرت یافتہ شاعر منورانا کے ہاتھوں میں عمل میں لائی گئی، اس موقعے پر ہندوستان کے ممتاز شاعر و اردو اکادمی اتر پردیش کے صدر منورانا نے کتاب کی اہمیت اور عالمی پیمانے پر اردو زبان کے ہو رہے فروغ پر تبادلہ خیال کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت پوری دنیا میں اردو شاعری کے ذریعے اس زبان اور ادب کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ منور رانا نے کہا کہ اردو ادب اور تہذیب کے لیے یہ بات قابل اطمینان ہے کہ قطر کی سرزمین پر بھی اس زبان کے چاہنے والے ہندوستان کی طرح سے موجود ہیں، برصغیر بالخصوص ہندو پاک کی اہم و ممتاز شخصیات کی موجودگی میں منورانا کی تقریر کو بہت پسند کیا گیا۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 24 فروری 2014

اوم پوری کا لاہور میں فیض کے گھر کا دورہ

لاہور: اداکار اوم پوری لاہور میں فیض احمد فیض کے گھر گئے، فیض کی بیٹیوں نے ان کا استقبال کیا۔ اداکار اوم پوری نے فیض کے گھر میں فیض کی کتابوں، ان کی تاریخی تصاویر اور استعمال کی اشیا دیکھیں۔ اداکارہ دیویا دتہ اور ان کی اہلیہ بھی ہمراہ تھیں۔ فیض کی صاحبزادیوں منزہ ہاشمی اور سلیمہ ہاشمی نے معزز مہمانوں کے ساتھ نشست کا اہتمام کیا۔ اوم پوری نے اپنی زندگی کے کچھ متاثر کن گوشوں سے پردہ اٹھایا۔ اسکول آف ڈرامہ سے فلم انسٹی ٹیوٹ تک پہنچنے میں غربت اور محنت کے قصوں نے شرکا کو خاصا متاثر کیا۔ اداکار نے بتایا کہ وہ اپنی پہلی کمائی سے آج تک 40 فیصد بچت کرتے آرہے ہیں، اگر کوئی کام نہ بھی کرنا پڑے تو باقی زندگی آرام سے گزار سکتے ہیں۔ اوم پوری کی اہلیہ سیما نے ایک نظم بھی ترنم کے ساتھ سنائی جس سے شرکا بہت محظوظ ہوئے۔ نشست کے اختتام پر مہمانوں کو فیض ٹرسٹ فاؤنڈیشن کی طرف سے پھول اور تحائف پیش کیے گئے۔

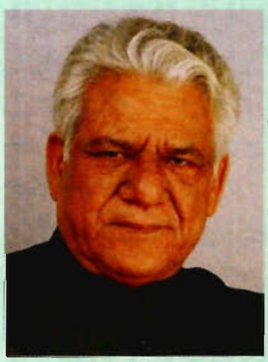

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 16 مارچ 2014

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

ممتاز نوجوان شاعر، صحافی و نقاد عزیز نبیل کی کتاب کا اجرا

فراق کی شاعری و شخصیت کے حوالے سے عزیز نبیل کا کام قابل ستائش ہے: خواجہ محمد اکرام الدین

دائیں سے فیروز عالم، معین شاداب، شکیل شمسی، پروفیسر محمد اکرام الدین، آصف اعظمی، معید رشیدی اور کمل سنگھ

نئی دھلی: مارچ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں دوحہ قطر کے معروف نوجوان شاعر عزیز نبیل کی مرتب کردہ کتاب 'فراق گورکھپوری، شخصیت، شاعری اور شناخت' کا اجرا قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، روزنامہ انقلاب کے مدیر شکیل حسن شمسی، معروف ناظم اور شاعر معین شاداب، جناب آصف اعظمی اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر قومی اردو کونسل جناب کمل سنگھ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس تقریب رونمائی کی صدارت کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کی جبکہ نظامت کے فرائض نوجوان شاعر و ناقد معید رشیدی نے انجام دیے۔

اس موقع پر معین شاداب نے عزیز نبیل کی شخصیت، شاعری اور صحافتی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کا بنیادی مزاج دستاویزی ہے اور یہ کتاب دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے فراق کی تمام تحریروں کو ایک جگہ سمیٹ کر ریسرچ اسکالروں کا کام آسان کردیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ فراق کی شاعری کے انتخاب میں انھوں نے صحت متن کا خاصا خیال رکھا ہے۔ شکیل حسن شمسی نے اپنی علمی گفتگو میں کہا کہ عزیز نبیل کو مشقت بھرا کام کرنے میں مہارت حاصل ہے اور ان سے ایسے ہی مزید کام کی توقع کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں عزیز نبیل نے فراق کی شاعری کی کئی جہتوں کو یکجا کیا ہے۔ اس موقع پر عزیز نبیل نے قومی اردو کونسل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ میرے لیے باعث فخر ہے کہ اس کا اجرا کونسل میں ہو رہا ہے جو فروغ اردو کی سمت میں سب سے بڑا ادارے کے طور پر فعال ہے۔ میں نے اس کتاب کے لیے ہندوستان کے مختلف گوشوں سے فراق سے متعلق مضامین اور تحریروں کو جمع کیا ہے، مجلس فخر ادب بحرین کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے جن کا تعاون اس کتاب میں شامل حال رہا اور فراق پر یادگاری مشاعرے میں اس کتاب کے حوالے سے فیصلہ کیا گیا تھا، اب میں عرفان صدیقی کی شخصیت اور شاعری پر کام کر رہا ہوں۔

اپنی صدارتی تقریر میں کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے عزیز نبیل کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ یہ قومی اردو کونسل کے لیے فال نیک ہے کہ یہ کتاب قطر کی وادیوں میں ترتیب دی گئی ہے اور اس کا اجرا قومی اردو کونسل میں کیا جارہا ہے۔ یہ کام فراق کی شاعری اور شخصیت کو سمجھنے میں معاون ہوگا۔ انھوں نے اس موقع پر اس بات کا بھی اعادہ کیا کہ قومی اردو کونسل اب اپنے دائرہ کار کو اردو کی نئی بستیوں تک جوڑنے کا ارادہ رکھتی ہے اور اس سمت میں پیش رفت ہو رہی ہے۔

اس تقریب رونمائی میں مولانا راشد حامدی، ڈاکٹر کلیم اللہ، محمد عصیم، شاہنواز محمد خرم، فیروز عالم، ڈاکٹر توقیر راہی، انتظامی امور کے افسر محمد احمد، منیر انجم، احمد خان، محمد انصر، مجیب عالم، ڈاکٹر عبدالحی اور ڈاکٹر شاہد اختر کے علاوہ کونسل کے دوسرے اراکین بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 مارچ 2014

اعتذار

'اردو دنیا' کے گزشتہ شمارے (اپریل 2014) میں صفحہ 73 پر کمپوزنگ کی ایک غلطی در آئی ہے۔ میٹنگ کی روداد کے پوائنٹ 1 کی تیسری سطر میں 60 کروڑ کی بجائے 100 کروڑ شائع ہوگیا۔ براہِ کرم اسے 60 کروڑ پڑھا جائے۔
(ادارہ)

قومی اردو کونسل کا ڈریم پروجیکٹ اردو طلبا کے لیے نادر تحفہ

پٹنہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے زیراہتمام مولانا مظہرالحق عربی و فارسی یونیورسٹی پٹنہ میں ایک ریاستی سطح کی نشست کا انعقاد ہوا جس میں کونسل کے ذریعے شروع کیے گئے ڈریم پروجیکٹ پر این سی پی یو ایل اور این آئی ای ایل آئی ٹی کے ذمے داران نے اس کورس کی اہمیت اور افادیت اور اس کی نوعیت پر روشنی ڈالی۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ یہ کورس خاص طور پر اردو طلبا کے لیے تیار کیا گیا ہے جو اقتصادی اور معاشی طور پر کمزور ہیں اور میٹرک کے بعد تعلیم ترک کردیتے ہیں۔ بڑے شہروں میں شروع کرنے کے بجائے اسے ریاستوں کے دو دراز اور پسماندہ علاقوں میں اپنے کمپیوٹر مراکز کے ذریعے متعارف کیا ہے تاکہ جو بچے انجینئرنگ اور دیگر تکنیکی کورس نہیں حاصل کرسکیں وہ محض 250 روپے فیس ادا کرکے یہ پیشہ ورانہ کورس کرسکتے ہیں تاکہ انھیں روزگار کے بہتر مواقع حاصل ہوجائیں۔ اس کورس میں طلبا کو ٹی وی سیٹ اَپ باکس، واشنگ مشین، جوسر، مکسچر، سولر لائٹ، یو پی ایس، انورٹر اور واٹر پیوریفائر جیسی چھوٹی چھوٹی مشینیں مرمت کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ ریاست کے دس مراکز میں یہ کورس شروع کیا گیا۔ داخلہ کے لیے طلبا کو اردو کی جانکاری ہونا لازمی ہے۔ داخلہ پہلے آؤ پہلے پاؤ کی طرز پر دیا جارہا ہے۔ سال میں دو دفعہ یہ کورس چلے گا۔ پہلا بیچ جنوری اور دوسرا جون ہے۔ ملک کے دیگر شہروں: جموں، سری نگر، دہلی اور لکھنؤ میں بھی ڈریم پروجیکٹ سے متعلق میٹنگیں کی گئیں۔

میٹنگ میں شرکت کرتے ہوئے قومی کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین ودیگر شرکا

روزنامہ 'پندار' پٹنہ، 8 اپریل 2014

صغرا مہدی کی یاد میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تعزیتی نشست

نئی دھلی: قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین اور کونسل کے دوسرے اراکین کے ساتھ صغرا مہدی کی وفات پر فروغ اردو بھون میں ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ صغریٰ مہدی ہندوستان کے ایک جید علمی، ادبی اور سیاسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ڈاکٹر عابد حسین اور صالحہ عابد حسین کی منہ بولی بیٹی تھیں۔ علم وادب ان کے گھر کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ انھوں نے کہانیاں لکھیں، ناول اور سفرنامے لکھے۔ 1939 کے بھوپال میں آنکھ کھولی۔ زندگی دلی میں گزاری۔ اکبرالہ آبادی پر پی ایچ ڈی کی۔ وہ جامعہ ملیہ میں پروفیسر رہیں۔ ادبی محفل میں آتیں تو اس کی رونق دوبالا ہوجاتی۔ ساہتیہ اکادمی کے اردو بورڈ میں ایڈوائزر رہیں۔ اسی طرح ہریانہ اکیڈمی اور دوسرے اہم علمی اور ادبی اداروں سے وابستہ رہیں۔ امتیاز میر ایوارڈ، دہلی اردو اکیڈمی ایوارڈ اور کئی دوسرے اعزازات ان کے حصے میں آئے۔ خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ ان کی تصانیف ان کے ادبی مرتبے کے تعین میں ہمیشہ اولین ترجیح ہوں گی۔ کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کمل سنگھ نے مرحومہ کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقعے سے کونسل کے دوسرے اراکین نے بھی رنج و غم کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر کلیم اللہ، جناب محمد عصیم، جناب شاہنواز خرم، جناب اجمل سعید، جناب فیروز عالم اور ڈاکٹر شاہد اختر نے کہا کہ اردو دنیا میں ان کی کمی ہمیشہ رہے گی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 19 مارچ 2014

ممتاز ادیب ونقاد پروفیسر محمود الٰہی کے سانحہ ارتحال پر فروغ اردو بھون میں تعزیتی نشست

نئی دھلی: اردو کے نامور نقاد و ادیب پروفیسر محمود الٰہی کے انتقال پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کے زیراہتمام ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں اردو زبان وادب کے تئیں ان کی نمایاں خدمات کو یاد کیا گیا، ان کے اہل خانہ سے اظہار ہمدردی اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔ اس موقعے پر کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ پروفیسر محمود الٰہی عہد حاضر کے ایک بڑے اور معتبر نقاد تھے۔ انھوں نے ہر سطح پر اپنے فن اور اسلوب سے اردو زبان وادب کو ایک نئی سمت عطا کی۔ انھوں نے ان کی موت کو اردو زبان وادب کے لیے ایک بڑا خسارہ قرار دیا اور کہا کہ یہ ایک ایسا خسارہ ہے جس کی تلافی مستقبل قریب میں ممکن نہیں۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر محمود الٰہی کے متعدد تصانیف ہیں جن میں اردو میں قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، فسانۂ عجائب کا بنیادی متن، اردو کا پہلا ناول، خط تقدیر کی بازیافت، افادات مہدی قابل ذکر ہیں۔ کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ پروفیسر محمود الٰہی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اردو ادب کے تئیں ان کی خدمات قابل احترام ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان کی ذات صاف گوئی اور سادگی سے عبارت تھی۔ اس تعزیتی جلسے میں کونسل کے دوسرے اراکین نے بھی رنج وغم کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر کلیم اللہ، محمد عصیم، شاہنواز محمد خرم، اجمل سعید، فیروز عالم، انتظامی امور کے افسر محمد احمد، ڈاکٹر عبدالحیٔ اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی اظہارِ تعزیت کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 20 مارچ 2014

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

عربی زبان وادب کا فروغ اور ہندوستانی یونیورسٹیاں

نئی دھلی: عربی زبان وادب کے اندر غیر معمولی اظہار بیان کی خوبی موجود ہے، یہ زبان دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں سے ایک ہے اور تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے، تو یہ زبان دنیا کی سب سے قدیم زبان ہے۔ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے زیراہتمام 'عربی زبان و ادب کے فروغ میں ہندوستانی یونیورسٹیوں کا حصہ' کے موضوع پر منعقدہ دوروزہ سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں مقررین نے مذکورہ باتیں کہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ولی اختر نے استقبالیہ کلمات میں سیمینار کے اغراض ومقاصد کو اجاگر کیا۔ کلیدی خطبے میں پروفیسر زبیر احمد فاروقی نے ہندوستان میں عربی زبان وادب کی خدمات کا احاطہ کیا۔ افتتاحی پروگرام میں صدارتی کلمات پروفیسر احتشام احمد ندوی نے پیش کیے۔ قبل ازیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون نے منعقدہ 'عربی زبان وادب کے فروغ میں حیدرآباد دکن کا حصہ' کے موضوع پر 'خورشید احمد فارق یادگاری خطبہ (سیریز 7)' دیتے ہوئے سابق صدر شعبہ عربی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد پروفیسر محمد عبدالمجید نے کہا کہ ہندوستان کے تمام خطوں سے کہیں زیادہ حیدرآباد میں عربی زبان وادب کے حوالے سے کام ہوا ہے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر بدرالدین الحافظ نے کی۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر محمد نعمان خان نے کہا کہ ہندوستان میں عربی زبان وادب کے حوالے سے ناقابل فراموش کام ہوا ہے۔ یہاں اب بھی بہت زیادہ مخطوطے اور عربی کے یادگار نقوش مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے صدر پروفیسر عبدالمعز نے خصوصی مقرر کا تعارف پیش کیا جب کہ ڈاکٹر محمد اکرم نے ہدیہ تشکر پیش کیا۔

ظہرانہ کے بعد منعقدہ سیشن کی صدارت پروفیسر حسان خان نے کی جب کہ نظامت پروفیسر عبدالمعز نے کی۔ اس سیشن میں ڈاکٹر عبدالمجید، ڈاکٹر محمد قطب الدین، ڈاکٹر عبدالمجید اندرابی، ڈاکٹر مسرت بانو، ڈاکٹر عائشہ کمال، ڈاکٹر شمس کمال انجم اور ڈاکٹر محمود مرزا نے مقالے پیش کیے۔ دوسرے سیشن کی صدارت پروفیسر مصطفیٰ شریف نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 مارچ 2014

مسلم طلبا وطالبات کو مرکزی وزیر کپل سبل کے ذریعے ٹیبلٹ کی تقسیم

نئی دھلی: اردو کو جدید ٹیکنالوجی سے جوڑنے کے لیے ہم نے نوکیا فون میں اردو فونٹ تیار کرایا تاکہ اردو داں اس سے مستفید ہوسکیں۔ ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر برائے ٹیکنالوجی کپل سبل نے پرانی دہلی کے بارہ دری شیر افگن میں آل انڈیا شیخ جمعیت العباس کے زیراہتمام ہونہار طلبا وطالبات کے بیچ ٹیبلٹ تقسیم پروگرام میں کیا۔ کپل سبل نے مزید کہا کہ اردو کے فروغ اور اس کو روزگار سے جوڑنے کے لیے ہم نے ڈپلومہ اور انجینئرنگ کورس کے طلبا کے لیے اردو کورس

مرکزی وزیر کپل سبل بلیماران کے بارہ دری شیر افگن میں پروگرام کے دوران طلبا وطالبات کو ٹیبلیٹ تقسیم کرتے ہوئے

مہیا کرانے کو کہا تاکہ اردو پڑھنے والے طلبا وطالبات ان کورسوں سے جڑ کر روزگار سے جڑ سکیں۔ انھوں نے کہا کہ آکاش ٹیبلیٹ اگر بچوں کے ہاتھ میں آئے گا تو سمجھو دنیا ان کے ہاتھ میں آگئی۔ کپل سبل نے اردو کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اردو بہت ہی دلچسپ زبان ہے۔ میرے والد اردو داں تھے۔ اس موقع پر پڑوسی ملک پاکستان سے آئے مشہور قوال ارمان عزیز و ہمنواؤں نے صوفیانہ کلام پیش کرکے سامعین سے داد وتحسین حاصل کی۔ آل انڈیا شیخ جمعیت العباس کے جنرل سکریٹری اور پروگرام کے کنوینر شیخ علیم الدین اسعدی نے کپل سبل کے کاموں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ کپل سبل نے اقلیتوں کی ترقی کے لیے اردو کو ٹیکنالوجی کے ساتھ جوڑ کر انھیں آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیے۔ علاقائی معززین میں محمد صغیر، محمد حنیف، محمد شعیب، محمد مجاہد، سابق میونسپل کونسلر ضمیر احمد، سعیدہ بیگم، زلیخا، فہیم الدین اسعدی، محمد طیب، حاجی محمد سعید اور عابدہ بیگم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 مارچ 2014

اردو زبان کی تدریس

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے اشتراک سے اکادمی برائے فروغ استعدادِ اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے زیراہتمام اردو زبان کی تدریس کے موضوع پر دو روزہ قومی سیمینار کے افتتاحی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے اپنے خیر مقدمی کلمات میں اکادمی کے ڈائریکٹر پروفیسر غضنفر علی نے اردو زبان کی تدریس میں منصوبہ بندی کی اہمیت و وقعت کو اجاگر کیا۔ انھوں نے کہا کہ لفظ کے اندرون میں ایک جہان معنی نہاں ہوتا ہے جس کی پرتوں کو کھولنے کے لیے بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی درکار ہے۔ انھوں نے درس و تدریس کے اغراض ومقاصد پر اجمالی روشنی ڈالتے ہوئے اس سے وابستہ افراد کی ذمے داریوں کا بھی احساس دلایا۔ اس موقعے پر ماہر لسانیات اے آر فتیحی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے درس وتدریس میں لسانیات کے رول پر اہم نکات کی طرف اشارے کیے۔ سیمینار کے مہمان خصوصی پروفیسر عتیق اللہ نے طلبا اور اساتذہ میں مطالعے کی کمی اور اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں تساہلی وکوتاہی کو سماج میں بڑھتے صارفیت کے رجحان سے منسلک کرتے ہوئے اس کو عہد حاضر کا عظیم خسارہ بتایا۔ انھوں نے مزید کہا کہ دنیا میں دیگر تمام زبانوں کے مقابلے اردو واحد زبان ہے جو اصوات کی رنگارنگی اور بوقلمونی کی وجہ سے نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ افتتاحی جلسے کے صدر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ آج ایک نئی زبان وضع ہورہی ہے اور ضرورت ہے، اردو زبان اس نئی زبان سے خود کو ہم آہنگ کرے۔ کلاس میں بلند خوانی کو بہتر تلفظ

ادائیگی اور لہجے کی کامیابی کی کنجی بتاتے ہوئے انھوں نے شرکا کو اس پہلو پر غور وخوض کرنے کا مشورہ دیا۔ نظامت سیمینار کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر واحد نظیر نے کی۔ سیمینار کے پہلے اجلاس کی مجلسِ صدارت میں پروفیسر شعیب عبداللہ، پروفیسر شہناز انجم اور پروفیسر محمد فاروق انصاری شامل تھے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر صفدر امام قادری، ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی اور ڈاکٹر نوشاد عالم اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے کی۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر خالد محمود اور ڈاکٹر صفدر امام قادری نے مشترکہ طور پر کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر شعیب عبداللہ، ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر مشتاق صدف اور ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے مقالات پیش کیے۔ اجلاس کی نظامت ڈاکٹر مشتاق صدف نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 مارچ 2014

اردو کی بقا و ترویج میں مدارس کا کردار

چمپارن: اردو زبان و ادب کی بقا و ترویج میں سب سے نمایاں کردار مدارس کا ہی رہا ہے، یہ الگ بات ہے کہ وقت کے ساتھ مدارس کے نصاب میں کچھ تبدیلیاں ناگزیر ہوگئی ہیں۔ تاکہ جب یہ طلبہ مدارس سے فارغ التحصیل ہوکر نکلیں تو کسی مقام پر انھیں احساس کم تری کا شکار نہ ہونا پڑے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر مزمل حسین قاسمی اسسٹنٹ پروفیسر ایجوکیشنل فیکلٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے محمد یہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام 'اردو کی بقا و ترویج میں مدارس کا کردار' کے عنوان سے منعقد ہونے والے سیمینار میں کیا۔ یہ سیمینار دو نشستوں میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے منعقد کیا گیا تھا۔ سیمینار میں شرکت کرنے والے تقریباً تمام ہی مقالہ نگاروں نے اس بات پر زور دیا کہ اردو زبان و ادب کے فروغ کے تعلق سے مدارس کی جانب سے ہونے والی کوششوں کو اجاگر کیا جانا چاہیے۔ ٹرسٹ کے جنرل سکریٹری عبدالحق اثری نے ٹرسٹ کا تعارف پیش کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر حدیث انصاری نے اس ضمن میں زبانوں کے ابتدائی ادوار اور مرحلہ وار ان کی تبدیلیوں اور مدارس کے وجود کے تعلق سے ایک فکر انگیز کلیدی خطبہ پیش کیا۔ مولانا مظہر اعظمی نے کہا کہ تقریباً تمام ہی مدارس سے کوئی نہ کوئی ماہانہ یا دو ماہی یا سہ ماہی مجلّہ شائع ہوتا ہے، چونکہ یہ مجلّات اردو زبان ہی میں شائع ہوتے ہیں اس لیے بہرحال یہ اردو زبان و ادب کی ایک خاموش خدمت ہے جس کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔ رفیع اللہ مسعود تیمی نے مدارس کے فارغ التحصیل شعرا پر تفصیلی روشنی الٹتے ہوئے ان تمام شعرا کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جنھوں نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں اپنی ذمے داریاں نبھائی ہیں۔ صدر محفل شیخ صلاح الدین مقبول احمد مدنی نے اس حوالے سے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اگر ہم جنگ آزادی اور اس ضمن میں ہونے والی نوے سالہ مسلسل جدوجہد کا جائزہ لیں تو ہمیں علم ہوگا کہ اس جنگ آزادی میں قلم کا نمایاں کردار رہا ہے۔ زیادہ تر شعرا اور صحافی مدارس کے فارغین ہی تھے۔ سیمینار کے اختتام پر ٹرسٹ کے جنرل سکریٹری عبدالحق اثری نے کلمات تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 مارچ 2014

اردو میں بچوں کا ادب

رامپور: کیئر ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کی جانب سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے منعقد سیمینار میں 'اردو میں بچوں کا ادب' (ماضی، حال اور مستقبل) کے موضوع پر گورنمنٹ خورشید گرلس انٹر کالج میں ڈائریکٹر رضا لائبریری پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی اور ڈائریکٹر آکاش وانی رام پور ثروت عثمانی کی صدارت اور ڈاکٹر رباب انجم کی نظامت میں ہوا،

دورِ حاضر میں داستان کے مطالعہ کی اہمیت

کانپور: شعبہ اردو، حلیم مسلم پی جی کالج، کانپور میں قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے منعقد تیسرے منشی دیا نرائن نگم توسیعی خطبہ کے موقع پر بعنوان 'آج کے زمانہ میں داستان کے مطالعہ کی اہمیت' پر معروف دانشور، نقاد اور فکشن نگار پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ 'داستان امیر حمزہ' پر کام کرتے ہوئے مجھے تقریباً بتیس برس ہوگئے ہیں۔ اس مدت میں داستان کی مقبولیت اور اور نفوذ میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہوا ہے۔ داستان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دو دہائی پہلے کولمبیا یونیورسٹی کی پروفیسر فرنسس پریچٹ نے داستان کی (یک جلدی) غالب لکھنوی ربلگرامی روایت کے کچھ حصے کا ترجمہ ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا اور اس کے بعد مشرف فاروقی

منشی دیا نرائن نگم توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی

نے کینیڈا سے اسی جلد کا مکمل ترجمہ پیش کیا تو اہل علم نے اس کی اہمیت کا اعتراف کیا اور اس کی بے حد پذیرائی ہوئی اور اس کو پڑھ کر انگریز مبصر اس بات کی امید کرتے ہیں کہ یہ داستان بھی 'الف لیلہ' کے برابر معروف ہوگی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس داستان (یک جلدی) کی اصل داستان امیر حمزہ کے سامنے کچھ حقیقت نہیں ہے۔ اصل داستان امیر حمزہ زندگی اور فن کے مظاہر کی پیشکش اور تخیل کی غیر معمولی بلکہ بے مثال کارفرمائیوں کا ایسا کارنامہ ہے جس کا جواب دنیا کے ادب میں کہیں نہیں ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ آج کے زمانہ کا تقاضہ یہ ہے کہ داستان کو اپنے مطالعہ کا حصہ بنا کر ہندوستانی تہذیب اور دانشورانہ میراث اور خاص کر ہند مسلم میراث کو از سر نو بحال کیا جائے۔ اس جلسے کی صدارت کرتے ہوئے مشہور اور معزز شخصیت قاضی نور السلام نے کہا کہ زبانیں دیا نرائن نگم اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسے ادیبوں سے ہی پہنچانی جاتی ہیں۔

منتظمہ کمیٹی کے سکریٹری ڈاکٹر وسیم رضوی نے اپنے افتتاحیہ خطبہ میں کہا کہ اردو میں اس طرح کے سلسلہ کی بہت ضرورت ہے۔ کیونکہ اردو کا نقصان اردو والوں کی طرف سے ہی زیادہ ہوتا ہے۔ پرنسپل ڈاکٹر شکیل احمد نے خطبہ استقبالیہ میں کہا کہ منشی دیا نرائن نگم سے منسوب یہ توسیعی خطبہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ جلسہ کی نظامت کنوینر اور صدر شعبہ اردو خان احمد فاروق نے کی۔ ڈاکٹر معراج رعنا نے مہمان گرامی پروفیسر فاروقی کا تعارف پیش کیا اور ڈاکٹر نصرت جہاں نے شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور قاضی نور السلام کو شعبہ اردو کی جانب سے یادگاری نشان بھی پیش کیے گئے۔

پریس ریلیز، ملک العزیز، تمل ناڈو، 1 اپریل 2014

'اردو کا عوامی ادب- مسائل اور امکانات' سیمینار کے دوران کتاب کا اجرا

جس میں انجینئر فرقان سنبھلی، ڈاکٹر شعیب رضا خاں وارثی، ڈاکٹر ظہیر رحمتی، مرتضیٰ ساحل تسلیمی، ڈاکٹر اطہر مسعود خاں، فرح شبیر، شاذیہ، انوشا ملک، ڈاکٹر زرنگار، نصرت شمسی، ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی، فہیم بسمل، س ش عالم اور شجاع الرحمٰن شمسی نے اپنے مقالات پیش کیے۔ پروفیسر ہمدانی نے کہا کہ ادب اطفال پر جو کام ہو رہا ہے وہ بہت اہم ہے کیوں کہ تہذیب بچوں کی بنیادوں کو مضبوط کرتی ہے۔ پروفیسر عزیز الدین نے کہا کہ ہمارے نبی بچوں سے بے پناہ پیار کرتے تھے جس کی مثال ہے کہ ان کے نواسے حسن اور حسین نماز کے دوران ان کے کاندھوں پر چڑھ جاتے تھے۔ مشہور مصنف ایس فضیلت شاہ نے کہا کہ آج کے دور میں ماؤں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کے کیریئر پر نظر رکھیں اور انھیں نیک سیرت اور با کردار بنائیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 مارچ 2014

اردو کے فروغ میں مدارس دینیہ کا کردار

کٹک: مدنی ویمنس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے بھونیشور ریڈ کراس ہال میں منعقدہ سیمینار 'اردو کے فروغ میں

مدارس دینیہ کا کردار' مورخہ 27 فروری 14 کو انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے جامع مسجد حبیبیہ کے امام صاحب نے کیا سیمینار کی صدارت اڈیشا اسٹیٹ بورڈ آف مدرسہ ایجوکیشن کے سابق سکریٹری جناب الحاج سید عطا محی الدین حبیبی نے کی اور نظامت جناب شیخ عزیز الباری نے کی۔ اڈیشا کے کم و بیش 10 ضلعوں سے اردو کے شیدائی اور اہل ذوق حضرات نے اپنے مقالے پیش کیے جن میں جناب سعید رحمانی، جناب الحاج سید عطا محی الدین حبیبی، جناب خاور نقیب، جناب مولانا محمد مطیع اللہ، جناب ارشد جمیل کٹکی، جناب سید اقبال رضوی، جناب سید انظر ندیم، محترمہ ریحانہ خانم صاحبہ، جناب مولانا شیخ نواب علی، جناب فیض الباری، جناب نور الٰہی ناطق وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مہمانِ خصوصی جناب پرسن پاٹھ سانی ممبر لوک سبھا نے کہا کہ اردو ایک شیریں زبان ہے جو ہندوستان میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں دھوم مچائی ہے اور اس کے بغیر ہندوستان کی فلم جگت ادھورا ہے، ہم سب کو مل کر اس زبان کی ترقی کرنی چاہیے اور مذکورہ عنوان پر موصوف نے کہا مدارس دینیہ اردو ادب کے فروغ میں جو اہم کردار ادا کر رہے ہیں یہ ہمارے لیے ایک مثال ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اڈیشا جیسی ریاست میں سیمینار منعقد کرنے پر ہم اس کے ممنون ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے اردو اور عربی زبان میں ڈپلوما کے امتحانات میں کامیاب ہونے والے طلبا کو جناب پرسن پاٹھ سانی ممبر لوک سبھا نے اپنے ہاتھوں سے سند تقسیم کیا۔ سیمینار کے اختتام پر اظہار تشکر جناب عزیز الباری نے کیا۔

پریس ریلیز، عزیز الباری، سکریٹری، مدنی ویمنس ویلفیئر ایسوسی ایشن، اوڈیشا، 18 مارچ 2014

اردو غزل: ماضی اور حال

وارانسی: شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے مالویہ لیکچر سیریز کے تحت 'اردو غزل: ماضی اور حال' کے عنوان سے ایک خصوصی لیکچر کا انعقاد کیا گیا جس میں معروف شاعر اور ادیب پروفیسر مظفر حنفی نے اردو غزل کی تاریخ پر سیر حاصل روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ غزل کو جملہ شعری اصناف میں اس اعتبار سے تفوق حاصل ہے کہ یہ اردو کی سب سے بڑی پہچان بن چکی ہے۔ اس صنف نے ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب بلکہ علاقائی زبانوں پر بھی اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ غزل ہماری برسہا برس کی قدیم تہذیب اور روایت کی پاسدار اور امین ہے۔ غزل اپنی بحروں کی موسیقی، قافیوں کی جھنکار اور ردیفوں کی تکرار کی وجہ سے کانوں میں رس گھولتی ہے، سبک اور سجل لفظوں کا استعمال اس میں جادوئی اثر پیدا کرتا ہے اور اشاراتی، علامتی انداز اس کے شعروں کو اتنا پہلو دار اور پرت دار بناتا ہے کہ ہر شعر گنجینۂ معنی کا طلسم نظر آتا ہے۔ پروفیسر مظفر حنفی نے ترقی پسند، جدیدیت اور ما بعد جدید تخلیقی رویوں بالخصوص غزل کے طرز و تیور پر بھرپور روشنی ڈالی۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر یعقوب یاور کے تعارفی کلمات کے ساتھ شعری نشست منعقد کی گئی۔

پریس ریلیز، آفتاب احمد آفاقی، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، 21 مارچ 2014

اردو کا عوامی ادب، مسائل اور امکانات

میل وشارم: شعبہ اردو سی عبدالحکیم کالج میل وشارم نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے 19 اور 20 مارچ 2014 کو دو روزہ بین الاقوامی اردو سیمینار کا انعقاد کیا جس میں ملک و بیرون ملک سے کثیر تعداد میں مندوبین شریک ہوئے۔ اس سیمینار کا موضوع 'اردو کا عوامی ادب- مسائل اور امکانات' تھا۔ اس موضوع پر 35 مقالے پڑھے گئے۔

سیمینار کا افتتاحی اجلاس 19 مارچ 2014 کو جس کی صدارت جناب الحاج ضیاء الدین احمد، جنرل سکریٹری، میل وشارم مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی نے کی۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایس وائی انور شریف نے خطبہ استقبالیہ اور سیمینار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر قاضی حبیب احمد، پروفیسر آف اردو، مدراس یونی ورسٹی نے تعارفی خطبہ پیش کیا۔ مہمان خصوصی عالی جناب اے محمد اشرف صاحب، سکریٹری و کرسپانڈنٹ، دی نیو کالج، چنئی نے اپنے خطاب میں اردو کی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے شہ نشین پر تشریف فرما ڈاکٹر جی وسواناتھن، چانسلر، وی آئی ٹی یونی ورسٹی سے درخواست کی کہ وہ اپنی یونی ورسٹی میں اردو اور عربی کے شعبے قائم کریں۔ اس پر مثبت رویہ اختیار کرتے ہوئے چانسلر نے اپنے خطاب میں اعلان کیا کہ اگلے سال سے وہ وی ائی ٹی، یونی ورسٹی ویلور میں عربی اور اردو کے الگ الگ شعبے قائم کرنے والے ہیں۔ ڈاکٹر جی وشواناتھن نے اردو زبان کو ایک ہندوستانی اور سیکولر زبان قرار دیا اور اسے قومی تہذیب کی علامت بتایا۔ ڈاکٹر سید سجاد حسین، صدر شعبہ

عربی فارسی و اردو نے اپنے خطاب میں اردو زبان کا ریاست میں منظرنامہ پیش کرتے ہوئے اس زبان کے روشن امکانات پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر محمد نورالدین سعید ، سابق صدر شعبہ اردو، بنگلور یونی ورسٹی و سابق چیرمین کرناٹک اردو اکاڈمی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔

صدر اجلاس عالی جناب ایس ضیاء الدین احمد نے روزنامہ 'مسلمان' کی شاندار اور دیرینہ صحافتی خدمات کے اعتراف میں 'نواب سی عبد الحکیم ایوارڈ برائے 2013' پیش کیا۔ اس موقع پر میل وشارم کے ماہنامے 'ندائے نیر' اور وانمباڑی کے ماہنامے 'نشان منزل' کو بھی ایوارڈ پیش کیے گئے۔ اسی اجلاس میں ڈاکٹر قاضی حبیب احمد اور ڈاکٹر محمد یاسر کی مرتب کردہ کتاب 'اردو اور تمل کا ادبی اشتراک' اور ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری کی مرتب کردہ کتاب 'نظر نظر کے چراغ' کا رسم اجرا بھی عمل میں آیا۔ دوروزہ بین الاقوامی سیمینار کے کل چھ اجلاس منعقد ہوئے جن میں ملک و بیرون ملک سے مقتدر علمائے ادب نے نہایت پرمغز اور وقیع مقالے عوامی ادب کے آغاز، ارتقا، مقبولیت، معنویت، مسائل اور امکانات پر پیش کیے۔ اختتامی اجلاس سے ڈاکٹر کلیم ضیاء، ممبئی نے خصوصی خطاب فرمایا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شمس الہدیٰ، حیدرآباد، ڈاکٹر قمر جمالی، حیدرآباد اور ڈاکٹر الطاف انجم، سری نگر، کشمیر نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر امان اللہ ایم بی، شعبہ عربک، پرشین و اردو، مدراس یونیورسٹی، چینئی، 27 مارچ 2014

اردو کے فروغ میں دہلی کی تنظیموں اور اداروں کا حصہ

نئی دھلی: منارا ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، دہلی کے زیراہتمام 'اردو کے فروغ میں دہلی کی مختلف تنظیموں کا حصہ' کے عنوان سے یک روزہ قومی سیمینار کا انعقاد شاہین پبلک اسکول، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی میں کیا گیا۔ قاری عبدالمنان نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے مذہبی اور دینی سرمایے کا بیشتر حصہ اردو میں ہے اور اس طرح اردو کے فروغ میں مختلف مذہبی تنظیموں کا اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ تمام مہمانان گرامی کا خیرمقدم صغیر احمد نے کیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت شاہین پبلک اسکول کے ڈائرکٹر شارق انصار اللہ نے کی۔ پہلے اجلاس میں صغیر احمد، طفیل احمد، ڈاکٹر صہیب احمد نے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر محمد عمر فاروق، استاد شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے کی۔ ڈاکٹر عزیز احمد خان نے نظامت کی۔ دوسرے اجلاس میں اسرار احمد، ڈاکٹر عزیز احمد خان، ڈاکٹر عباد احمد اور حافظ عبدالکریم رضوان نے مقالے پڑھے۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر عبدالحق نے اور نظامت اسرار احمد نے کی۔ اس کے بعد تیسرا اجلاس شروع ہوا جس میں عبدالرحمان اور عارف، فیضان شاہد، فضل الرحمٰن، ڈاکٹر عبدالحق اور سعید احمد نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر عزیز احمد خان اور نظامت ڈاکٹر عباد احمد نے کی۔ اس سیمینار میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، جے این یو، اور ڈی یو کے ریسرچ اسکالرس سمیت متعدد لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 مارچ 2014

ساگر یونیورسٹی میں اقبال لیکچر سیریز کے دوران اسٹیج پر موجود شرکا

ساگر یونیورسٹی میں اقبال لیکچر سیریز

ساگر: ڈاکٹر ہری سنگھ گور سنٹرل یونیورسٹی، ساگر مدھیہ پردیش کے شعبۂ اردو میں قومی اردو کونسل (وزارت برائے فروغ انسانی وسائل) کے تعاون سے 'اقبال لیکچر سیریز' کے تحت 'اقبال ماورائے دیروحرم' موضوع پر خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر مظفر شہ میری، صدر شعبۂ اردو سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد کا تعارف شعبہ کے استاذ ڈاکٹر ابوشہیم خان نے کرایا اور علامہ اقبال کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔ پروگرام کے اغراض ومقاصد کو شعبۂ اردو و فارسی کے صدر پروفیسر فداء المصطفیٰ فدوی نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس موضوع پر خصوصی لیکچر کا اہتمام اس لیے کیا گیا کہ بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ وہ صرف اسلامی شاعر تھے۔ انھوں نے کہا کہ علامہ اقبال سچے محبّ وطن تھے اور انھوں نے ہندوستانیوں کو بیدار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ مقرر خصوصی پروفیسر مظفر شہ میری نے انتہائی معلوماتی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اقبال ایک سمندر ہے، منتھن کے بعد کنفیوزن کا زہر نکال دیا جائے تو جو امرت حاصل ہوتا ہے، وہی 'اقبال ماورائے دیروحرم' ہے۔ علامہ اقبال کس طرح ماورائے دیروحرم ہیں، اس کو انھوں نے متعدد حوالوں سے بھی ثابت کیا۔ پروگرام کے صدر قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر پی کے مہتا نے شعبۂ اردو کی اس کوشش کو سراہا اور اس پر مبارکباد دی۔ ڈاکٹر وسیم انور نے مہمانوں کا خیرمقدم کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر افضل مصباحی نے کی۔ ہدیہ تشکر ڈاکٹر صفوان صفوی نے پیش کیا۔

پریس ریلیز، فداء المصطفیٰ فدوی، صدر شعبۂ اردو، ڈاکٹر ہری سنگھ گور سینٹرل یونیورسٹی ساگر، مدھیہ پردیش، 9 اپریل 2014

حفیظ میرٹھی کی شائستگی ہی ان کی غزل کی انفرادیت

میرٹھ: سی سی ایس یونیورسٹی، کے شعبۂ اردو اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے مولوی اسماعیل میرٹھی یادگار خطبہ بعنوان حفیظ میرٹھی کی غزل گوئی کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کی۔ خصوصی مقرر کی حیثیت سے پروفیسر شہپر رسول شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر اندو شرما (پرنسپل اسماعیل نیشنل پی جی گرلز کالج، میرٹھ) اور مہمانان ذی وقار کی حیثیت سے معروف ادیب وشاعر طالب زیدی اور حاجی جی ایم مصطفیٰ شریک ہوئے جب کہ نظامت ڈاکٹر آصف علی نے کی۔ تقریب کا آغاز حافظ محمد خالد کی تلاوت کلام پاک اور مسرور علی کی نعت سے ہوا۔ ذیشان خان نے استقبالیہ کی رسم ادا کی جب کہ مولوی اسماعیل میرٹھی و دیگر شرکا کا مختصر تعارف شعبہ کی استانی ڈاکٹر شاداب علیم نے پیش کی۔ مسعود اختر نے بتایا کہ علامہ اقبال کے بعد اسلامی اخلاقیات و روایات پر مبنی شاعری کی سب سے عمدہ مثال حفیظ میرٹھی کے یہاں ملتی ہے۔ پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ حفیظ میرٹھی نے غزل کے ہر شعر کو ایک نظم قرار دیا ہے اور غزل کی مقبولیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سچائی یہ ہے کہ یہاں پہنچ کر حفیظ میرٹھی کے مزاج کی شائستگی، احساس کی نزاکت اور جذبات کی داخلیت نے غزل گوئی میں اظہار کی سچی راہ تلاش کر لی تھی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر اندو شرما نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اسماعیل میرٹھی کی بالغ النظری کی اس سے عمدہ مثال کیا ہوسکتی ہے کہ انھوں نے عورتوں کی تعلیم کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا اور ان کے لیے الگ اسکول قائم کیے تھے۔ طالب زیدی نے کہا

کہ حفیظ میرٹھی کی شاعری کی آواز مدھم مگر دل میں اترنے والی تھی۔ وہ غالب کی طرح حیوانِ ظریف تھے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ مولوی اسماعیل میرٹھی اور حفیظ میرٹھی نہ صرف عمدہ ادیب و شاعر تھے بلکہ عظیم مفکر و ماہر تعلیم بھی تھے۔ اس موقعے پر پروفیسر وائی وملا، ڈاکٹر آرادھنا، ڈاکٹر فرحت خاتون، ڈاکٹر اسلم صدیقی، ڈاکٹر مہر عالم خاں، ڈاکٹر صبیحہ، ڈاکٹر عفت ذکیہ، انیس میرٹھی، نذیر میرٹھی، محمد دانش، ابراہیم، عدیل ساکھنوی، شاہ ویز زیدی، قمرالحق، اطہر، شبستاں، گلناز، شوبی رانی، گلستاں، گلناز روبی خان وغیرہ نے شرکت کی۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 مارچ 2014

خواجہ احمد عباس: ایک کثیر جہت تخلیقی نابغہ

ڈاکٹر سیدہ حمید

نئی دهلی: آج کے بحرانی دور میں خواجہ احمد عباس کو از سرِ نو یاد کرنا نہایت معنی خیز عمل ہے۔ روٹی، حسن اور انقلاب کو ان کی حیات کا نچوڑ قرار دیا جا سکتا ہے۔ علم، عشق اور عقل کا جیسا حسین سنگم خواجہ احمد عباس کی شخصیت میں نظر آتا ہے وہ ان ہی کی ذات سے مخصوص ہے۔ آج جب کہ خواجہ احمد عباس کی پیدائش کے سو سال مکمل ہو چکے ہیں اور انھیں تقریباً علمی اور ادبی دنیا نے فراموش کر دیا ہے لیکن سماج، ادب اور جدید تر قومی و عالمی مسائل کے پیشِ نظر ان کے خیالات، نظریات اور خدمات کی معنویت و افادیت فزوں تر ہو جاتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف دانشور، ادیب، حقوقِ نسواں کی علم بردار اور ممبر پلاننگ کمیشن حکومتِ ہند ڈاکٹر سیّدہ حمید نے شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے منعقدہ پروقار فراق یادگاری خطبے میں کیا۔ خواجہ احمد عباس کو ایک کثیر جہت تخلیقی نابغہ قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر سیدہ حمید نے فراق یادگاری خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ عباس صاحب نے اپنی 73 سالہ زندگی میں 74 کتابیں تصنیف کیں اور کمال یہ ہے کہ ان کتابوں کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں اور ادب کی مختلف اصناف سے ہے۔ میدانِ صحافت میں قدم رکھا تو ہزاروں کالموں کا سرمایہ نئی نسل کی رہنمائی کے لیے چھوڑ گئے۔ فلمی دنیا کی طرف رخ کیا تو بحیثیت فلم ساز اور اسکرپٹ رائٹر بالی ووڈ پر ایسے چھا گئے کہ فلمستان کے تمام درخشاں ستاروں نے انھیں اپنا سورج تسلیم کیا۔ ملینیم اسٹار امیتابھ بچن انھیں اپنا سرپرست، استاد اور اتالیق کہتے نہیں تھکتے۔ اردو ناول اور افسانے میں موضوع، مواد، اسلوب اور تکنیک کی سطح پر جس قسم کے متنوع تجربات خواجہ احمد عباس نے کیے اس

موضوع 'خواجہ احمد عباس: ایک کثیر جہت تخلیقی نابغہ' فراق یادگاری خطبہ کے اسٹیج کا منظر

بنا پر اردو فکشن میں ان کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

فراق یادگاری خطبے میں صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر ایمریٹس پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ خواجہ احمد عباس ایک دبلے پتلے انسان تھے لیکن ان کا باطن ایک آتش فشاں تھا۔ ان کے سینے میں ایک آگ بھری ہوئی تھی جس کے اظہار کے لیے انھوں نے کئی راستے اختیار کیے۔ پروفیسر حنفی نے ان کے سو سال مکمل ہونے پر طلبا کو ترغیب دیتے ہوئے کہا کہ وہ ان کی تخلیقات کا مطالعہ کریں کیوں کہ اسی طور پر خواجہ احمد عباس کو صحیح معنوں میں خراجِ عقیدت پیش کیا جا سکتا ہے۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر وہاج الدین علوی نے ڈاکٹر سیدہ حمید اور پروفیسر شمیم حنفی کا تعارف اور ان کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر سیدہ حمید کی شخصیت کئی جہتوں کا احاطہ کرتی ہے حکومتِ ہند نے آپ کو پدم شری کے باوقار خطاب سے نوازا ہے۔ ڈاکٹر احمد محفوظ نے اس موقع پر فراق گورکھ پوری کے تخلیقی امتیازات پر اپنا پرمغز مقالہ پیش کیا۔ اس خطبے کی نظامت اور اظہارِ تشکر کا فریضہ پروفیسر شہپر رسول نے بحسن و خوبی انجام دیا۔

پریس ریلیز ڈاکٹر خالد مبشر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 29 مارچ 2014

پروفیسر عتیق اللہ کا دارالقرأت کلیمیہ میں استقبال

اورنگ آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو کی جانب سے عالی جناب پروفیسر عتیق اللہ ادارہ کی کارکردگی کا جائزہ لینے کی غرض سے بتاریخ 14 مارچ کو تشریف لائے۔ ادارہ کی جانب سے مہمانِ خصوصی کا استقبال کیا گیا۔ جلسے کی صدارت قاری عشرہ محمد نثار احمد کلیمی فضلی نے کی اور مہمانِ خصوصی عالیجناب پروفیسر

عتیق اللہ رہے جب کہ نظامت محمد کلیم الدین ندوی نے کی۔ سکریٹری ادارہ قاری محمد محب اللہ نے ادارہ کے قیام اور کارکردگی کے متعلق تفصیلات پیش کی۔ عبدالعزیز بدوی نے علمِ عربی اور اردو کی اہمیت اور افادیت پر اپنے تاثرات پیش کیے۔ محمد نثار احمد کلیمی فضلی صدر دارالقرأت کلیمیہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ حکومت ہند کا یہ اقدام دنیا و آخرت کے اعتبار سے نہایت ہی مفید ثابت ہوا۔ اس لیے کہ قرآن و حدیث عربی میں ہے۔ حضورﷺ عربی النسل ہیں اور جنتیوں کی زبان بھی عربی رہے گی۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کو حاصل کرے۔ حکومت ہند نے فنکشنل عربی کورس کو ترتیب دے کر اس اہم کام میں معاونت کا کردار ادا کیا۔ قومی کونسل سے درخواست کی کہ فنکشنل عربی اور دو سالہ، پلوما کورس میں طلبا کی تعداد کو بڑھا کر 300 کیا جائے۔ مہمان خصوصی پروفیسر عتیق اللہ نے دوسری کئی زبانیں مثلاً عبرانی، سریانی وغیرہ بھی موجود تھیں۔ لیکن ان میں ہر دور کے تقاضوں کو جذب کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ لیکن عربی زبان ایک ایسی جاودانی زبان ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہر علاقے میں ہر دور میں Ready Reckoner کی طرح کام کرتی ہے اور دورِ حاضر کے جدید تقاضے جیسے کمپیوٹر، انجینیرنگ، میڈیکل، ٹکنالوجی، جغرافیہ، کمپیوٹر سائنس وغیرہ تمام علوم میں عربی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ جب سے ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو کے کاموں میں برق رفتاری آ گئی اور گزشتہ چھ سات سالوں میں جو کام نہیں ہو سکے اسے خواجہ اکرام الدین نے بہت ہی قلیل عرصے میں انجام دیا ہے۔ انھوں نے ادارہ کی کارکردگی اور جمیع اساتذہ و طلبا و طالبات کے اخلاص کو سراہا اور ادارے کی مزید ترقی کے لیے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ آخر میں صدر ادارہ قاری عشرہ سید یحییٰ قادری نے مہمانِ خصوصی، اساتذہ، طلبا و شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، محمد محب اللہ، سکریٹری، دارالقرأت کلیمیہ، اورنگ آباد، مہاراشٹر، 15 مارچ 2014

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

امیر خسرو پر عالمی سیمینار

علی گڑھ: امیر خسرو پر تین روزہ عالمی سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے ایرانی پارلیمنٹ کے سابق اسپیکر ڈاکٹر غلام علی حدّاد عادل نے کہا کہ خسرو نے اپنی شاعری میں اپنی زبان کا تعین خود کیا تھا اور فارسی شاعری میں ان کا شمار دنیا کے عظیم شعرا میں کیا جاتا ہے۔ ان کے ہم عصر ایرانی شاعر سعدی بھی ان کی شاعری سے متاثر تھے۔ لندن کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کے پروفیسر ڈیوڈ میتھیوز نے کہا کہ ہندوستان میں بالمیکی اور کالی داس کی طرح امیر خسرو کا شمار بھی عظیم شعرا میں کیا جاتا ہے۔ وہ ہندوستان کے اولین ہندی اور اردو کے قلم کار ہیں جنھوں نے کھڑی بولی کا استعمال کیا اور اسے ہندوی کا نام دیا۔ اس عالمی سیمینار کی کنوینر اور مرکز برائے تحقیقاتِ فارسی کی ڈائریکٹر پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ خسرو نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کو فروغ دیا۔ انھیں 'طوطیِ ہند' کہا جاتا تھا اور ہندوستان میں قوالی کی روایت بھی خسرو سے شروع ہوئی۔ پرو وائس چانسلر بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) ایس احمد علی نے کہا کہ خسرو کے عظیم دانشور اور موسیقار تھے۔ انھوں نے راگ، خیال، ترانے کو شروع کیا اور طبلہ کے موجد ہیں۔ ہندوستان میں واقع ایرانی سفارت خانہ کے کلچرل کونسلر ڈاکٹر علی فولادی نے کہا کہ وہ گرونانک اور سنت کبیر سے کافی متاثر تھے اور انھوں نے ہندوستان کی سیکولر روایات کو فروغ دیا اور ایران کے عظیم فارسی دانشور سعدی کی طرح انھوں نے ہندوستان میں فارسی زبان کو فروغ دیا۔ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ضمیر الدین شاہ نے کہا کہ خسرو نے ہندوستان میں انسانیت کا پیغام عوام تک پہنچایا اور 2 ہزار سے زائد غزلیات کہیں، جسے ہندوی زبان کا نام دیا گیا۔ سیمینار کے افتتاحی اجلاس سے لندن سے آئے ممتاز دانشور ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب، تہران (ایران) کی المصطفیٰ انٹرنیشنل یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر غلام رضی مہدوی نے بھی خطاب کیا۔ اس موقعے پر مرکز برائے تحقیقاتِ فارسی کے زیرِ اہتمام شائع 9 کتابوں کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

امیر خسرو پر منعقد عالمی سیمینار میں مندوبین مرکز برائے تحقیقات فارسی کے زیر اہتمام شائع کتابوں کا اجرا کرتے ہوئے

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 مارچ 2014

اردو عالمی زبان بن چکی ہے: نائب صدر جمہوریہ

نئی دھلی: ہندوستان کے نائب صدر جمہوریہ عزت مآب محمد حامد انصاری نے ملک کے بہترین صحافتی ادارہ آئی آئی ایم سی کے اردو صحافت کے طلبہ سے ملاقات کی۔ آئی آئی ایم سی کے ڈائرکٹر جنرل سنیت ٹنڈن، اوایس ڈی جے دیپ بھٹناگر

نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری سے آئی آئی ایم سی اردو جرنلزم کے طلبا ملاقات کرتے ہوئے

اور پروفیسر کے ایم شریواستو کی سربراہی میں 8 طالب علموں اور کورآرڈی نیٹر راجندر پرساد نے نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری سے ملاقات کی۔ آئی آئی ایم سی کے ڈائرکٹر جنرل سنیت ٹنڈن نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے 'اردو صحافت' کے کورس کے بارے میں نائب صدر کو آگاہ کیا اور نائب صدر جمہوریہ کو طلبہ کے 'لیب جرنل' کی ایک کاپی پیش کی۔ طلبہ کے ساتھ اپنی گفتگو کے دوران حامد انصاری نے اردو صحافت کو عالمی معیار تک لانے میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ انھوں نے اس بات پر تشویش ظاہر کی کہ آج جب کہ یہ عالم ہے کہ اردو اخبارات کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ دوسری جانب اردو اخبارات کے پڑھنے والوں کی تعداد دن بہ دن گھٹتی جارہی ہے۔ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے ایک طالب علم نے کہا کہ ایسا نہیں ہے کہ آج اردو پڑھنے والے نہیں ہیں بلکہ اردو پڑھنے والے موجود ہیں، مگر اردو اخبارات انھیں وہ معیار نہیں دے رہے ہیں جو ایک قاری روز صبح کے اخبار سے توقع کرتا ہے۔ اردو اخباروں میں کام کرنے والوں کو اتنی تنخواہیں نہیں دی جاتی ہیں کہ بہتر علم رکھنے والا شخص اردو صحافت کا پیشہ اختیار کر سکے۔ اس وجہ سے ایسے لوگ اس پیشے سے منسلک ہو گئے ہیں جنھیں صحافت کی پیشہ ورانہ تعلیم نہیں ہے۔ ایک طالب علم نے کہا کہ ہمارے پاس خبر رساں ایجنسیاں نہیں ہیں جو اردو میں خبریں دیں، صرف یو این آئی ہے جو اردو کا مواد فراہم کرتی ہے۔ حامد انصاری نے اپنی گفتگو کے دوران کہا کہ آج اردو عالمی زبان بن چکی ہے۔ امریکہ، کنیڈا، یوکے، جرمنی اور دیگر ممالک میں اردو کی نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں۔ ان کے یہاں سے بھی جرائد اور رسالے نکلتے ہیں۔ حامد انصاری نے آئی آئی ایم سی کے ڈائرکٹر جنرل سنیت ٹنڈن سے طلبہ کے کریئر سے متعلق سوال کیا جس کے جواب میں ڈی جی نے کہا کہ ہم کئی اخبارات اور ٹی وی والوں سے رابطے میں ہیں۔ ابھی ان بچوں کا انٹرن شپ شروع ہو رہا ہے، اس کے بعد ان کے امتحان ہوں گے اور ہمیں امید ہے کہ انھیں کہیں اچھی جگہ ملازمت مل جائے گی۔ پروفیسر کے ایم شریواستو نے امید ظاہر کی کہ کچھ بچے تو بہتر کارکردگی کے ذریعے انٹرن شپ کرنے کے بعد وہیں منتخب کر لیے جائیں گے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 مارچ 2014

ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا تاریخی پس منظر اور اردو ادب

نئی دھلی: 'ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا تاریخی پس منظر اور اردو ادب' کے موضوع پر انجمن ترقی اردو (ہند) کے سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار کا افتتاحی جلسہ انجمن کے مرکزی دفتر اردو گھر میں پروفیسر شمیم حنفی کی صدارت میں منعقد ہوا، انجمن کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے استقبالیہ کلمات میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی تاریخ اور اس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ انجمن اپنے قیام سے ہی اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے اہم خدمات انجام دیتی آ رہی ہے۔ ممتاز ناقد شمس الرحمٰن فاروقی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اردو کبھی بھی صرف فوج اور لشکر کی زبان نہیں رہی اور نہ ہی اس معنی میں اس کا استعمال ہے، اس سے تو منفی رویہ ابھرتا ہے۔ ورجینیا یونیورسٹی (امریکہ) کی ڈاکٹر مہر افشاں فاروقی نے اردو زبان کی خوبیوں کا اور خصوصیات کا ذکر کیا۔ اردو ویب سائٹ ریختہ ڈوٹ آرگ (rekhta.org) کے موجد سنجیو صراف

سیمینار میں (دائیں سے) سنجیو صراف، پروفیسر ظل الرحمٰن، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر شمس ارحمٰن فاروقی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، مہر افشاں فاروقی اور گیتا پٹیل

نے بھی اپنے خیالات پیش کیے اور کہا کہ میں اردو زبان و ادب کا عالم نہیں ہوں لیکن اردو سے محبت ضرور کرتا ہوں۔ ورجینیا یونیورسٹی (امریکہ) کی ڈاکٹر گیتا پٹیل نے اردو کو شیریں اور دلکش زبان قرار دیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ میں اتنے اہم موضوع پر سیمینار منعقد کرنے کے لیے ڈاکٹر اطہر فاروقی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس کے مختلف اجلاس میں باہم نکات پر مقالے پیش ہوں گے اور گفتگو ہوگی۔ حکیم سید ظل الرحمٰن نے کہا کہ ہندوستان میں مختلف زبانوں، رسوم اور مذاہب کے ماننے والے ہیں اور یہی اس کا سب سے اہم امتیاز ہے۔ پروفیسر اختر الواسع کمشنر برائے لسانی اقلیت نے کہا کہ دہلی میں اردو کے مسائل کو جمہوری طریقے سے حل کرنے کی ضرورت ہے۔ اجلاس کے صدر پروفیسر شمیم حنفی نے کہا اردو زبان ہندستان کی آئینہ دار اور ہندستان کی جمہوریت کو راستہ دکھانے والی زبان ہے۔ آخر میں ڈاکٹر اطہر فاروقی نے اپنے تشکراتی کلمات میں تمام مندوبین اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس اجلاس کی نظامت غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے بہ حسن و خوبی انجام دی۔ افتتاحی اجلاس کے بعد ڈاکٹر محمد سجاد کی صدارت میں دوسرا اجلاس 'مشترکہ تہذیب پر اردو شاعری کا عکس' کے عنوان سے منعقد ہوا، جس میں مہر افشاں فاروقی، ثاقب عمران نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اجلاس کے صدر ڈاکٹر محمد سجاد نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ پیش کیے گئے تمام مقالے اہم موضوعات کو محیط ہیں۔ صبح ساڑھے دس بجے مورخ ڈاکٹر ہتیندر پٹیل (کولکاتا) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پروفیسر تصدق حسین، ڈاکٹر شاہد حسن کمال (پاکستان، ڈاکٹر گریش چند پانڈے نے پہلے اجلاس میں مقالے پڑھے۔ صدر پروفیسر ہتیندر پٹیل نے پیش کیے گئے تمام مقالوں پر عالمانہ گفتگو کی۔ دوسرے اجلاس میں ڈاکٹر گیتا پٹیل (امریکہ) ڈاکٹر باراں فاروقی، ثانیہ اقبال ہاشمی، اینڈریو ایمسٹز نے مقالے پیش کیے۔ صدر جلسہ پروفیسر سچن تیواری نے اپنے صدارتی کلمات میں تمام مقالوں پر مختصراً روشنی ڈالی۔ تیسرے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر ہتیندر پٹیل نے کی۔ ڈاکٹر محمد سجاد، ڈاکٹر مظفر حسین سید، ڈاکٹر جاوید رحمانی، ڈاکٹر قمر عالم، عبدالسمیع، اور نوشاد منظر نے مقالے پیش کیے۔ آخر میں صدر جلسہ نے تمام مقالوں پر گفتگو کی۔ انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام آخری دن کے اجلاس میں ٹام آلٹر نے نہ صرف شرکت کی بلکہ بہت ہی شستہ زبان میں تھیٹر اور فلم کی دنیا کے اپنے بہت سے تجربات اور مشاہدات سے روبرو کرایا۔ پروفیسر سچن تیواری، دانش اقبال، ڈاکٹر اشلے این پی نے مقالے پڑھے۔ اس اجلاس کی صدارت ورجینیا یونیورسٹی (امریکہ) کی ڈاکٹر گیتا پٹیل نے کی۔ آخری دن کا دوسرا اجلاس پروفیسر علی احمد فاطمی کی صدارت میں ہوا۔ سیف الدین احمد، رعنا صدیقی زماں نے اپنے مقالے پیش کیے۔ سیمینار کے اختتامی اجلاس میں ممتاز مورخ اور ٹفٹس یونی ورسٹی، امریکہ کی پروفیسر عائشہ جلال نے اختتامی خطبہ پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8، 9، 10 مارچ 2014

ڈی ڈی اردو کا اپنا اسٹوڈیو

نئی دھلی: اردو اور غیر اردو داں حلقہ میں اپنے کو مقبول کرانے کے لیے ڈی ڈی اردو کی توجہ اب ان ہاؤس پروڈکشن پر مرکوز ہوئی ہے کیونکہ کسی بھی چینل کی مقبولیت کا انحصار اس کے ان ہاؤس پروڈکشن پر ہی ہوتا ہے۔ اس کوشش کے تحت ڈی ڈی اردو نے اب سی پی سی میں اپنا اسٹوڈیو بھی قائم کرلیا ہے اور ان ہاؤس پروڈکشن کو کامیاب کرنے کے لیے معروف ڈراما نگار اور ہدایت کار عزیز قریشی کو اس کا انچارج مقرر کیا ہے۔ ڈی ڈی اردو پر فرنگی، باغ و بہار، آنگن، گیسٹ ہاؤس، عزیزن بائی، نونگوں کا ہار، میری روح میں بسا ہے تو آخر کب تک جیسے درجنوں سیریلس اور پروگرام چل رہے ہیں۔ دراصل کمیشنگ کے ذریعہ تیار کرائے گئے درجنوں پروگراموں اور سیریلس کو ملنے والی مقبولیت کے بعد ڈی ڈی اردو کے حوصلے کافی بلند ہیں، یہی وجہ ہے کہ اب وہ اپنے پیروں پر پوری طرح سے کھڑے ہونے کے لیے ان ہاؤس پروڈکشن پر توجہ دے رہا ہے۔ واضح رہے کہ حکومت ہند کی جانب سے 2006 میں اعلان یا گیا تھا کہ بہت جلد اردو کو فروغ دینے کے لیے ڈی ڈی اردو چینل لانچ کیا جائے گا، وعدہ کے مطابق ڈی ڈی اردو کی بنیاد رکھ دی گئی لیکن یہ سلسلہ برائے نام ہی شروع ہوا۔ ترپراری شرن نے کہا ہے کہ مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ آج ڈی ڈی اردو نے تاریخ رقم کی ہے کہ اس کے پاس ایک ہزار پروگراموں کے پرپوزلس آئے تھے جن میں سے ضرورت کے مطابق پروگرام کا انتخاب کرنا ہمارے لیے بہت بڑا چیلنج تھا لیکن وہ ہوا۔ انھوں نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر اور اسکالر پروفیسر سید شاہد مہدی جیسی شخصیات کی چیئرمین شپ میں ہم نے تین کمیٹیاں تشکیل دی تھیں تاکہ وہ اچھے پروگرام کا انتخاب کریں۔ ان ہاؤس پروڈکشن کے لیے ہم نے عزیز قریشی کو انچارج بنایا ہے تاکہ اچھے پروگرام تیار ہوں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 مارچ 2014

اردو پبلشر اور قارئین کے مابین فاصلے کم کرنے کی ضرورت

نئی دھلی: سہ لسانی انجمن قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جو علیحدہ علیحدہ زبانیں ہیں ان کو ایک جگہ جوڑنا وہ گنگا جمنی تہذیب جو کہ ہندوستان کا طرۂ امتیاز تھی، اس کو زندہ کرنا نئے لوگوں اور پرانے لوگوں کے درمیان جو فاصلہ ہے، اس کو ہٹانا تھا۔ ان خیالات کا اظہار کرتے

ہوئے ڈاکٹر ظفر نے کہا کہ جب ہم کسی چیز میں ماہر ہوجاتے ہیں تو ہمارے یہاں ایک تکبر پیدا ہوجاتی ہے اور ہم نئے لوگوں کو مسترد کرنا شروع کردیتے ہیں۔ جب کہ نئے لوگ ہمارے وارث ہیں۔ ہماری وراثت کے نگہبان ہیں۔ ڈاکٹر ظفر نے کہا کہ ہمارا ارادہ قلم کار اور پبلشر کے درمیان فاصلے کو دور کرنے کا ہی ہے اچھی تخلیق دور تک جانی چاہیے، اس کے لیے ہمارے پبلشران کو شائع کریں۔ اس سلسلے میں بہت سخت جدوجہد کی ضرورت ہے، تاکہ قلم کار کا رشتہ براہِ راست پبلشر سے قائم ہو۔ یوں بھی صنعتی ترقی میں ادبی ترقیاں زوال کا شکار ہوجاتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہم نے مشترکہ سہ لسانی انجمن قائم کی، تاکہ صرف ایک زبان کے پبلشر نہیں تینوں زبانوں کے پبلشر سے ہمارا اثر بڑھ سکے۔ محفل گنگ و جمن نے اس کے مدنظر مجاز لکھنوی کا شعری مجموعہ 2012 میں ہندی میں شائع کیا ہے۔ 2010 میں انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ 2012 سے باقاعدگی سے انجمن کی کارروائی کی شروعات ہوئی۔ ڈاکٹر کنول نے انجمن کے بارے میں اظہارِ خیال پیش کرتے ہوئے کہا کہ مشترکہ لسانی ماحول صحت مند معاشرے کی علامت ہے جو موجودہ ماحول کی ضرورت بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ محفل گنگ و جمن جیسے ادارے ہندوستان کے ہر خطے میں ہونے چاہئیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 مارچ 2014

تحریکِ آزادی میں مسلمانوں کی قربانیوں کو دانستہ طور پر نظر انداز کیا گیا

نئی دھلی: دہلی کی ایک رضا کار تنظیم مانو ایکتا ایجوکیشنل ٹرسٹ اور مشہور اشاعتی ادارہ فرید بک ڈپو کی جانب سے ایوانِ غالب میں منعقدہ فخرِ وطن کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے سید شہاب الدین نے کہا کہ ہندوستان کو برطانوی غلامی سے آزاد کرانے کے لیے اگرچہ تمام ہندوستانی اقوام نے جدوجہد کی ہے لیکن سب سے زیادہ مسلمانوں نے اپنا خون بہایا ہے، انھوں نے کہا کہ یہ ایک المیہ ہی ہے کہ ایک خاص تنگ نظر ذہنیت جان بوجھ کر مسلم مجاہدین آزادی کی خدمات کو آنے والی نسلوں کے ذہنوں سے محو کردینے کے درپے رہی ہے۔ نامور ملی دانشور پروفیسر طاہر محمود نے بنگال کے نواب سراج الدولہ، ٹیپو سلطان، سید احمد شہید اور بہادر شاہ ظفر سے لے کر 1857 کی فیصلہ کن جنگِ آزادی کی طویل مدت میں لاکھوں مسلمانوں کی لازوال قربانیوں کا ذکر کیا۔

اسٹیج پر طاہر محمود و دیگر شرکا، جب کہ مائک پر پروفیسر اختر الواسع خطاب کرتے ہوئے

سینئر صحافی اور سیاسی رہنما م افضل نے کہا کہ ہندوستان کی تاریخ آزادی خصوصاً مسلم مجاہدین آزادی پر مبنی کتابوں کو مدرسوں اور اسکولوں کے نصاب میں شامل کیا جانا چاہیے۔ اس سے قبل فاروق ارگلی کی مقبول ترین کتاب 'فخرِ وطن' کے چوتھے ایڈیشن کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ مرد تو مرد مسلم خواتین نے بھی آزادیٔ وطن کی لڑائی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، انھوں نے بیگم حضرت محل، مولانا محمد علی جوہر کی والدہ بی اماں، مولانا حسرت موہانی کی اہلیہ نشاط النساء بیگم، مولانا ابوالکلام آزاد کی بیگم زلیخا اور دوسری بہادر مسلم خواتین کا ذکر کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، شعبۂ سیاسیات کے پروفیسر محب الحق اور جامعہ اردو کے کوآرڈی نیٹر مساعد محمد قدوائی نے مسلم مجاہدین آزادی کی شاندار تاریخ پر گراں قدر مقالات پیش کیے۔ اس موقعے پر نوجوان صحافی خالد انور اور معصوم مرادآبادی کے علاوہ مولانا محمد رحمانی نے مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی، مفتی نادر القاسمی، صحافی منور حسن کمال، خواجہ خلیل اللہ، نصرت ظہیر، بزرگ صحافی وسیم الحق اور نامور مفسر قرآن مولانا فاروق واصفی نے بھی خطاب کیا۔ آخر میں مہمانِ خصوصی ڈاکٹر سید فاروق نے اپنے خطاب میں اس طرح کی کانفرنسوں کو ملک گیر سطح پر منعقد کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے فاروق ارگلی کی کوششوں کو آگے بڑھانے میں مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ ادارہ فرید بک ڈپو کے روحِ رواں الحاج محمد ناصر خاں کے شکریہ کے ساتھ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ کانفرنس میں دہلی اور بیرون دہلی کی معزز شخصیات بڑی تعداد میں شریک تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 مارچ 2014

شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیرِ اہتمام توسیعی خطبہ

نئی دھلی: میر نے ایک دلچسپ ادبی جعل سازی کی، جس کا ذکر میر کے ناقدین نے نہیں کیا ہے۔ اپنے ایک مخطوطے میں انھوں نے خان آرزو کے ذکر کو بڑے سلیقے سے شامل کیا ہے۔ میر تقی میر اور خان آرزو کا رشتہ عجیب وغریب تھا۔ میر نے ایسا کیوں کیا اس کے لیے میر کی نفسیاتی کشمکش کو سمجھنے اور جاننے کی ضرورت ہے۔ میر کی اس دلچسپ ادبی جعل سازی کی بڑی اہمیت ہے جس پر میر کے محققین اور ناقدین کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں میر پر توسیعی خطبہ کا منظر

یہ بات ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ کے زیرِ اہتمام منعقد توسیعی خطبے میں شکاگو یونیورسٹی (امریکہ) کے پروفیسر ایمریٹس چودھری محمد نعیم نے کہی۔ چودھری محمد نعیم نے کہا کہ میر نے روایتیں گڑھیں، جس سے انھیں ذہنی تسکین حاصل ہوئی ہوگی۔ میر خطاط تو نہیں تھے لیکن خوش نویس ضرور تھے اور اس فن سے بخوبی واقف تھے، اسی لیے انھوں نے مخطوطے میں چند صفحات مناسب اور موزوں جگہ پر شامل کرلیے۔ یہ واقعات کتابوں میں موجود ہیں۔ انھوں نے کہا کہ غالب کا فارسی کلام فارسی غزل گوئی کے باب میں اہم اضافہ ثابت ہوا لیکن میر کی فارسی شاعری سے ایسا نہیں ہوا۔ میر بلاشبہ بڑے شاعر تھے لیکن ان کی اس ادبی جعل سازی کا ذکر ہونا ہی چاہیے۔ اس موقعے پر معروف نقاد اور محقق شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ چودھری محمد نعیم نے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے، جس پر کبھی غور نہیں کیا گیا۔ میر کو خان آرزو کی عظمت کا احساس تھا۔ اٹھارہویں صدی خان آرزو کی صدی ہے۔ میر زمانہ شناس تھے۔ میر نے خان آرزو

پر ناموری اور شہرت کے لیے لکھا۔ میر کی علمیت میں کوئی شک نہیں لیکن میری کی فارسی شاعری کی استعداد اچھی نہیں۔ سودا کا فارسی کلام یقیناً میر سے بہتر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غالب نے میر کے بہت سارے مضامین اٹھائے۔ انھوں نے کہا کہ یہ توسیعی خطبہ بے حد عمدہ تھا جس میں نعیم نے شگفتہ انداز میں تمام پہلوؤں کو روشن کر دیا۔

مہمان خصوصی پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ ادب کی دنیا میں علمی مباحث کے دروازے وا رہتے ہیں۔ میر کا جن لوگوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے انھیں ان پہلوؤں پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ٹیگور پروجیکٹ کے کورڈینیٹر پروفیسر شہزاد انجم نے نظامت جبکہ پروفیسر شہپر رسول نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 مارچ 2014

غالب کی زندگی پر ڈرامہ کا انعقاد

نئی دہلی: شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سالانہ انٹر یونیورسٹی مقابلے کے دوران جامعہ شعبہ اردو ڈرامہ گروپ نے غالب کی زندگی کے حوالے سے ایک اہم ڈرامہ 'غالب کون ہے' پیش کیا۔ سید محمد مہدی کی تحریر کردہ اسکرپٹ کو طلبہ نے اس خوبی سے پیش کیا جس سے غالب کی زندگی، اس کے حالات، اس دور کی پر آشوب زندگی، غالب کے دوست، مصاحبین، اس دور کے مشاعرے، مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر، بادشاہ اور شہزادوں کی شاعری اور شعر گوئی، انگریزوں کی یلغار کے بارے میں سمجھنے کا موقع ملا۔ غالب کی شاہ خرچی کی وجہ سے ان کی تنگی، شراب نوشی کے باوجود معزز علمائے کرام اور شرفا سے غالب کی دوستی اور نیازمندانہ قربت غالب کی زندگی میں ان کی مقبولیت اور پذیرائی کی بہت بڑی دلیل ہے۔ ڈرامہ میں شعبہ اردو کے طلبہ و طالبات نے اہم کردار ادا کیے۔ پورے ڈرامہ کے دوران جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبہ اردو کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی کے ساتھ شعبہ کے اساتذہ اور بڑی تعداد میں طلبہ موجود تھے۔ پروفیسر وہاج الدین علوی نے اس ڈرامہ کے کامیاب انعقاد پر ڈرامہ میں شریک تمام طلبہ اور بزم جامعہ کے ایڈوائزر ڈاکٹر سرورالہدیٰ کو مبارکباد پیش کی۔ اخیر میں ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے تمام سامعین، اساتذہ، طلبہ اور انتظامیہ کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 مارچ 2014

شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں غالب کی زندگی پر ڈراما 'غالب کون ہے' کے اداکار

کنور مہندر سنگھ بیدی کا 105واں یوم ولادت

رہنمائے تعلیم جدید کے کنور مہندر سنگھ بیدی نمبر کا اجرا کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ، گلزار دہلوی و دیگر

نئی دہلی: اردو ہماری تہذیبی شعار میں اس درجہ رچی بسی ہے کہ ہندوستان کا کوئی تصور اردو کے بغیر نہیں ہوسکتا اور برصغیر کا تصور ہندوستان کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ آج اردو اقلیتی طبقہ کی زبان بن کر رہ گئی ہے مگر آج بھی اردو ہندستانی زبانوں کی جڑ ہے اگر اردو کو ہم اپنی ثقافت اور بول چال کی زبان سے نکال دیں تو ہمارا ملک گونگا اور بہرا بن کر رہ جائے گا۔ مذکورہ خیالات کا اظہار کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے 105 ویں یوم ولادت کے موقعے پر غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کیا۔ سیمینار کا انعقاد کنور مہندر سنگھ لٹریری ٹرسٹ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں نہایت پرسوز انداز میں کنور مہندر سنگھ بیدی کے یادگار لطیفے، واقعات، اصلاحی کارنامے، گنگا جمنی تہذیب کی بقا کے لیے جدوجہد، دلی اور دلی والوں کے سوز دروں اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا ذکر کیا۔ اس موقعے پر نوجوان شاعر جتیندر پرواز کو ایوارڈ سے بھی نوازا گیا اور 'رہنمائے تعلیم جدید' کا کنور مہندر سنگھ بیدی نمبر کا اجرا بھی پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ہاتھوں میں عمل میں آیا۔ قبل ازیں ڈاکٹر عقیل احمد، پروفیسر شریف حسین قاسمی، کشمیری لال ذاکر، ڈاکٹر مولا بخش، ڈاکٹر محمد اقبال، عمرانہ خاتون، جمیل الرحمٰن نے مقالے پیش کیے۔ اس موقعے پر پنڈت آنند موہن موہن زتشی گلزار دہلوی نے کنور صاحب کے حوالے سے مقالہ پیش کیا۔ نظامت شمیم عثمانی نے کی۔ متین امروہوی اور کمال جعفری نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 مارچ 2014

ماس میڈیا اور تنقیدی جائزہ

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی کے ذاکر حسین دہلی کالج ایوننگ میں بزم ادب کے زیر اہتمام 'ماس میڈیا اور تنقیدی جائزہ' کے عنوان سے ایک روزہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس پروگرام کی صدارت ڈاکٹر نوشاد عالم نے کی۔ پروگرام کا باضابطہ آغاز شعبہ اردو کی استاد اور 'بزم ادب' کی صدر ڈاکٹر شاہینہ تبسم نے اپنے خیر مقدمی کلمات سے کیا۔ اس موقعے پر مختلف کالجوں کے اساتذہ کرام نے اردو ادب کی مختلف اصناف کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی کے سابق صدر پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ داستانوں کے واقعات کے پس پردہ ایک پوری تہذیب کارفرما ہوتی ہے اور اس میں الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ داستانیں اردو نثر کے سفر کا اہم سنگ میل ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد ڈاکٹر کوثر مظہری نے نظم نگاری کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں درجات میں طلبہ و طالبات سے نظم و غزل کی قرأت کرانی چاہیے تاکہ ان کے تلفظ اور پڑھنے کے انداز کی تربیت ممکن ہوسکے۔ دیال سنگھ کالج کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر مولا بخش نے پریم چند کے افسانہ 'کفن' کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ پریم چند نے جو افسانے لکھے وہ معاشرے کی اصلاح کے لیے تھے، کفن میں جو کردار ہیں وہ اپنے کردار کے ناموں سے بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں، کردار کے ذریعے وہ اپنی فکر کو بھی ظاہر کردیتے ہیں، مثلاً بدھیا جو کردار ہے وہ مہاتما بدھ سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے۔ گھیسو اور مادھو ایسے کردار ہیں جو اب تک زندہ جاوید ہیں۔ ڈاکٹر احمد محفوظ نے غزل

کے حوالے سے پرمغز گفتگو کی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر خالد جاوید نے ماس میڈیا کے حوالے سے گفتگو کی۔ پروگرام کے اختتام پر شعبہ کے صدر ڈاکٹر ظہیر رحمتی نے اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 مارچ 2014

دھلی :

اقبال کی شاعری کا فکری اور ثقافتی منظرنامہ

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی کے معروف تعلیمی ادارے سینٹ اسٹیفن کالج میں دوروزہ سیمینار بعنوان 'اقبال کی شاعری کا فکری اور ثقافتی منظرنامہ' کا افتتاح ہوا۔ اقبال اکادمی انڈیا کے چیئرمین ڈاکٹر سید ظفر محمود نے افتتاحی

اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے نوجوانوں کا اقبال کے پیغام کی طرف متوجہ ہونا ناگزیر ہوگیا ہے تاکہ وہ اپنی خودی کو بیدار کریں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر محمد ذاکر نے اپنے افتتاحی کلمات میں اقبال کے تصورِ انسان پر بصیرت افروز گفتگو کی۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر ایمریٹس پروفیسر عبدالحق نے اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اقبال کا مطالعہ، مطالعہ کرنے والوں کو خصوصی اعزاز عطا کرتا ہے اور شخصیت سازی میں معاون ہوتا ہے۔

افتتاحی اجلاس کی نظامت کرتے ہوئے کالج کے شعبۂ اردو و فارسی کے صدر ڈاکٹر شمیم احمد نے بتایا کہ عرصۂ دراز سے اردو اور فارسی کی تدریس سے وابستہ اس کالج کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ کالج کے میگزین 'دی اسٹیفنین' کے دسمبر 1915 کے شمارے میں اقبال کی نظم 'حقیقتِ حسن' کا انگریزی ترجمہ شامل ہے۔ جو اب تک کی تحقیقات کے مطابق اقبال کے کلام کا اوّلین انگریزی ترجمہ ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر توقیر احمد خان نے اظہارِ تشکر کرتے ہوئے اس سیمینار کو کالج کی تاریخ کا ایک یادگار سیمینار قرار دیا۔

'اقبال اور عظمت آدم' توسیعی خطبے کے دوران اسٹیج پر بائیں سے پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی اور ڈاکٹر ندیم احمد

پروفیسر آفاق حسین صدیقی اور پروفیسر منیر عالم فریدی نے دوسرے اجلاس کی صدارت کی۔ اس اجلاس میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر محمد کاظم نے 'فنونِ لطیفہ اور اقبال' ذاکر حسین پوسٹ گریجویٹ ایوننگ کالج کے استاد ڈاکٹر مظہر احمد نے 'اقبال کی ظریفانہ شاعری' شعبۂ فارسی کے پروفیسر علیم اشرف نے 'زبورِ عجم کی روشنی میں اقبال کا مطالعہ' اور نیشنل کونسل فار ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کے شعبۂ لسانیات کے پروفیسر محمد نعمان خان نے 'اقبال کا نظریۂ فکر وفن' کے موضوعات پر اپنے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر مشتاق قادری نے اجلاس کی نظامت کی۔

پروفیسر توقیر احمد خان اور پروفیسر محمد نعمان خان نے سیمینار کے تیسرے اجلاس کی صدارت کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر مشتاق قادری نے 'کلامِ اقبال میں تصورِ جمال' پروفیسر ابن کنول نے 'اقبال: ایک نظر میں' اور پروفیسر آفاق حسین صدیقی نے 'اقبال کی شاعری میں حب وطن: اردو کلام کے حوالے سے' کے موضوعات پر اپنے مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر احمد امتیاز نے نظامت کی۔ سیمینار میں بڑی تعداد میں اساتذہ، ریسرچ اسکالر اور طلبہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 مارچ 2014

اقبال اور عظمت آدم

نئی دھلی: شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں 'اقبال اور عظمت آدم' کے موضوع پر منعقدہ توسیعی خطبے سے خطاب کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے اقبال کی شاعری میں عظمت آدم کے حوالے سے تفصیل سے روشنی ڈالی اور اشعار کے ذریعے اقبال کی شاعری میں انسانی عظمت کی آفاقیت کو واضح کیا۔ انھوں نے کہا کہ اقبال واضح مذہبی تشخص، فلسفیانہ مزاج کے حامل تھے، ان کی شاعری کی فکری و تصوراتی کائنات کا مرکزی حوالہ صحیح معنوں میں انسان ہی ہے۔ اقبال جب بھی مذہب کی باتیں کرتے ہیں تو وہ عالمگیریت کی باتیں کرتے ہیں۔ انھوں نے اقبال کے غیر جانبدارانہ مطالعہ کرنے کی صلاح دی۔ شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ عظمت آدم پوری نسل انسانی کے لیے ہے اور بحیثیت مسلمان اس کے مرتبے میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس نے عظمت آدم پر زور دیا۔ اس پروگرام کے کنوینر اور ناظم ڈاکٹر ندیم احمد نے مہمان مقرر کا تعارف پیش کیا۔ اس موقعے پر جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ و طالبات بھی کثیر تعداد میں موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم اپریل 2014

شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ توسیعی خطبہ

نئی دھلی: صرف صفوی دور میں ہی شاعر اور ادبا ہندوستان نہیں آئے بلکہ اس سے پہلے بھی یہ سلسلہ جاری تھا۔ حافظ و سعدی جیسے فارسی کے مایہ ناز شاعر ہندوستان

توسیعی خطبہ کا ایک منظر

کے شیفتہ تھے، جس کا پتہ ہمیں ان کے اشعار سے ملتا ہے۔ یہ بات جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ فارسی کی جانب سے 'سرزمین ہند میں طوطیان شیراز کے نغمے' کے عنوان سے توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے دانش گاہ آزاد، ایران کی ڈاکٹر فریبا رئیسی نے کہی۔ ڈاکٹر فریبا رئیسی نے ہندوایران کے دیرینہ روابط کا ذکر کرتے ہوئے صفوی دور میں شیراز سے ہندوستان آنے والے شعرا، ادبا کا تفصیلی تذکرہ کیا۔ انھوں نے خاص طور سے شیرازی شعرا کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے مشہور شاعر امیر خسرو کو 'طوطی ہند' اور 'سعدی ہند' کے لقب سے اس لیے نوازا گیا کہ انھوں نے سعدی شیرازی کی پیروی کی ہے۔ تاج محل کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کے اس بہترین عجوبہ کے معمار عیسیٰ شیرازی کا تعلق شہر شیراز سے تھا۔ اس بات سے یہ پتہ لگتا ہے کہ

ہنداورایران کے روابط نہایت ہی قدیمی ہیں۔

پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ فارسی اور اردو کو ایک دوسرے سے کبھی بھی جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اردو فارسی ہی کی مرہونِ منت ہے۔ پروفیسر منور مسعودی نے کشمیر کی تہذیب وتمدن پر فارسی کے اثرات کے حوالے سے گفتگو کی۔ صدر شعبۂ فارسی پروفیسر عراق رضا زیدی نے کہا کہ شیراز ہی وہ جگہ ہے کہ جہاں فارسی کا تاریخی لہجہ موجود ہے ورنہ دیگر مقامات پر تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔ توسیعی خطبہ کے کوآر ڈی نیٹر ڈاکٹر سید کلیم اصغر نے مہمانوں کا استقبال کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 مارچ 2014

سجاد ظہیر یادگاری خطبہ

نئی دھلی: پروفیسر قاضی افضال حسین نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقد کیے گئے چھٹے سجاد ظہیر میموریل لکچر میں 'ادب کا پس نو آبادیاتی مطالعہ' کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایڈورڈ سعید کی مشہور زمانہ کتاب Orientalism کا ذکر کیا اور کہا کہ مغرب میں اس کتاب کے بعد استعمار اور استعماریت کے حوالے سے نیا فکری رویہ شروع ہوا۔ انھوں نے کہا کہ ادب میں ہم سے کہا گیا کہ شاعری تجربے کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ حالی چونکہ تخیل کو قوت ممیزہ کا پابند کرنا چاہتے تھے اس لیے گڑبڑ پیدا ہوئی۔ انھوں نے اس نئے تصور کی اطلاقی تصویر بھی پیش کی جس کے ذیل میں انھوں نے خصوصیت کے ساتھ نذیر احمد کے ناول 'مرأۃ العروس' اور 'توبۃ النصوح' اور ان کے کرداروں کے حوالے سے بتایا کہ ان کے ذریعہ یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جو کردار بادشاہ کے زیر نگیں ہے وہاں نظام درست نہیں جب کہ جو کردار انگریز حکومت کے زیر اثر ہے وہ خوش حال بھی ہے اور وہاں نظم و ضبط بھی ہے۔ انھوں نے محمد حسین آزاد کے حوالے سے بھی علمی گفتگو کی۔ صدر جلسہ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ قاضی افضال تو اس سے بھی زیادہ مشکل موضوعات پر لکھتے پڑھتے رہے ہیں لہٰذا اس موضوع پر بات کرنا ان کے لیے تو اور آسان تھا۔ صدر جلسہ نے مغرب کے نئے تصورات کی اطلاقی نوعیت پر توجہ دلائی۔ شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی نے مہمان مقرر پروفیسر قاضی افضال حسین اور صدر جلسہ پروفیسر عتیق اللہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کا تعارف بھی پیش کیا۔ لکچر کے کنوینر ڈاکٹر کوثر مظہری نے سجاد ظہیر کی علمی و ادبی فتوحات کا ذکر کیا اور لکچر کے موضوع اور غرض وغایت پر بھی روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 مارچ 2014

شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہادی حسن یادگاری خطبے کے دوران اسٹیج پر دائیں سے: شاداب بھٹناگر، ڈاکٹر سید کلیم اصغر ڈاکٹر موسی رائے، ڈاکٹر علی فولادی اور ڈاکٹر عراق رضا زیدی اور دیگر طلبہ

ہادی حسن یادگاری خطبہ

نئی دھلی: شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام منعقدہ تیرہویں پروفیسر ہادی حسن یادگاری خطبہ کے دوران اپنے خصوصی خطاب بعنوان 'ہندوستانی موسیقی کے ایک عظیم معمار امیر خسرو دہلوی' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر موسی رائے (شانتی نکیتن، کلکتہ) نے کہا کہ امیر خسرو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے عظیم نمائندہ تھے۔ خسرو نے جو ملے جلے راگ اور آہنگ ایجاد کیے ان میں 'خیال، قول، قلبانہ، نقش ونگار، ضم، بسیط، ترانہ، ساز گیری، غنم، زیلف، غل، غارا، ایمن، سہیلا، سر پردہ، مجیرا، فردوست، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ خسرو ہندوستانی سازوں کے علاوہ عرب و ایرانی سازوں میں چنگ، دف، رباب، نال، طنبور، بربط، رود عود، طبل، تاسہ، نفیر، دہل، شہنائی وغیرہ سے بھی خود واقف تھے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے کلچرل کاؤنسلر سفارت جمہوری اسلامی ایران ڈاکٹر علی فولادی نے کہا کہ فارسی کو ہندوستانی تہذیب سے کبھی جدا نہیں کیا جاسکتا اور اس کی زندہ مثال امیر خسرو کے اشعار ہیں۔ انھوں نے امیر خسرو اور شیخ سعدی کا موازنہ کرتے ہوئے کہا کہ سعدی کے یہاں دقت طلب الفاظ موجود ہیں لیکن خسرو کے اشعار آسان اور دلنشین ہیں جو عوام کی سمجھ میں آسانی سے آجاتے ہیں۔ قبل ازیں ڈاکٹر عبدالحلیم شعبۂ فارسی نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر ہادی حسن کا تعارف پیش کیا اور مہمان خصوصی کا بھی ضمنی تعارف کرایا۔ نظامت موصوف نے کی۔ خطبہ کا آغاز یاسر عباس نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ آخر میں صدر شعبۂ فارسی پروفیسر عراق رضا زیدی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آج کا یہ ہادی حسن یادگاری خطبہ اس نظریہ سے اور یادگاری ہے کہ ہم نے خسرو کی شاعری کے حوالے سے گفتگو نہ کرتے ہوئے ان کی موسیقی پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر موسی رائے کا یہ انوکھا خطبہ جس میں مقالہ کے ساتھ ساتھ خسرو کی خوبصورت غزلیں نہایت ہی حسین انداز میں پیش کیں جس سے ہم کو خسرو کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی موسیقی کے بارے میں بھی نہایت اہم معلومات حاصل ہوئیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 مارچ 2014

عربی زبان کی تدریس پر توسیعی خطبہ

نئی دھلی: جامعہ حضرت نظام الدین اولیا ذاکر نگر، اوکھلا نئی دہلی کے زیر اہتمام جامعہ کے ریڈنگ روم میں 'عربی زبان کی تدریس' کے موضوع پر توسیعی خطبہ کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی پروفیسر خلدون سعید استاد جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نے شرکت کی۔ پروگرام کی صدارت مفتی محمد رضا قادری مصباحی پرنسپل جامعہ حضرت نظام الدین اولیا نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر خلدون سعید نے عربی زبان کی تدریس کے طریقوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ایک زبان کو دوسری زبان میں منتقل کرنا انتہائی مہارت کا کام ہے اور یہ کثرت مشق کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی زبان کے قواعد کی تدریس میں 2 طریقے رائج ہیں ایک کلی اور دوسرا استقرائی۔ کلی طریقہ میں پہلے قواعد پھر امثال کا ذکر ہوتا ہے اور استقرائی طریقہ میں پہلے امثال پھر قواعد کا ذکر ہوتا ہے۔ جامعہ حضرت نظام الدین اولیا کے پرنسپل مفتی محمد رضا قادری مصباحی نے اپنے صدارتی خطبہ میں مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت عربی زبان کی عمومی اشاعت کے لیے مدارس کی موجودہ نظام تعلیم میں تبدیلی لانے کی سخت ضرورت ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 مارچ 2014

جے این یو میں امیر خسرو پر کبیر میموریل لکچر

نئی دھلی: جواہر لال نہرو کے ہندوستانی زبانوں

کے مرکز میں بی بی سی لندن سے وابستہ رہے مشہور صحافی اور دانشور قربان علی نے کبیر میموریل لیکچر پیش کیا۔ لیکچر کا

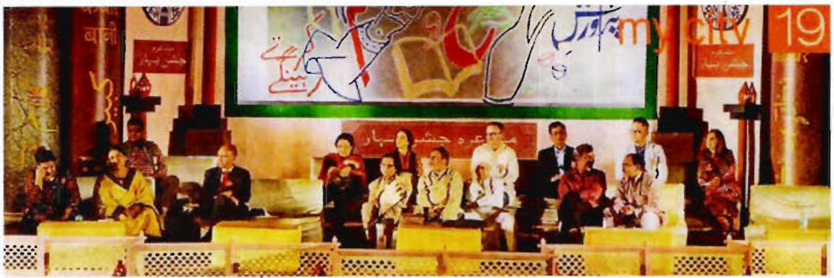

جشن بہار ٹرسٹ کے زیر اہتمام سالانہ بین الاقوامی مشاعرہ کے اسٹیج کا منظر

موضوع امیر خسرو اور ہندوستانی تہذیب تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے صدارت کی۔ کبیر میموریل لیکچر کے کنوینر پروفیسر انور پاشا نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ اس پرآشوب دور میں جب کہ ہماری مشترکہ تہذیب پر چہار جانب سے حملہ ہو رہا ہے، نئی نسل کو امیر خسرو کے کارناموں سے آگاہ کرانا بے حد ضروری ہے۔ مشترکہ تہذیب کی حفاظت وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ورنہ سیکولرزم کا درخت سوکھ جائے گا۔ خصوصی لیکچر پیش کرتے ہوئے قربان علی نے خسرو کے حالات زندگی پر گفتگو کی اور انھیں نابغہ روزگار قرار دیا۔ آج بھی اگر کسی کو ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا اولین سفیر قرار دیا جاسکتا ہے تو وہ کوئی اور نہیں حضرت امیر خسرو کی ذات ہوگی۔ انھوں نے خسرو کی تمام تصنیفات کا حوالہ دے کر یہ ثابت کیا کہ وہ حقیقی معنوں میں ہندوستانی تہذیب کی زندہ مثال تھے۔ اس موقعے پر قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے مہمان مقرر اور حاضرین کو بھروسہ دلایا کہ خسرو کے حوالے سے کوئی بھی پروجیکٹ کونسل کے پاس آئے گا تو ہم اس پہ ضرور غور کریں گے اور بھرپور مالی مدد فراہم کریں گے۔ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے پروفیسر اسلم اصلاحی نے کئی واقعات سنا کر امیر خسرو کی اہمیت اور ان کی ہمہ گیر شخصیت کو اجاگر کیا۔ اپنے صدارتی خطبے میں سید شاہد مہدی نے کئی مفید مشورے دیے۔ پروگرام کے اخیر میں ڈاکٹر شفیع ایوب نے مہمان مقرر، صدر محترم اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اخلاق آہن، ہندی کے استاد پروفیسر دیوندر چوبے، تمل زبان و ادب کے استاد ڈاکٹر چندر سیکرن کے علاوہ بڑی تعداد میں اسکالرس اور طلبا نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 اپریل 2014

شاہ ولی اللہ لائبریری کی حالت زار

نئی دہلی: جامع مسجد کے نزدیک تاریخی فصیل بند شہر گلی پہاڑی املی میں حضرت شاہ ولی اللہ پبلک لائبریری ہے جہاں ہزاروں نادر و نایاب کتابیں موجود ہیں۔ بہت

سی کتابوں کو دیمک سے بچانے کے لیے پلاسٹک کور میں محفوظ کیا گیا ہے۔ لائبریری میں تقریباً 16000 کتابیں ہیں جن میں زیادہ تر اردو اور فارسی زبان کی کتابیں ہیں۔ لائبریری پچھلے کئی برسوں سے اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرتی آرہی ہے۔ جگہ کی کمی کے باعث بہت سی کتابیں کارٹون میں باندھ کر دوسری محفوظ جگہ پر رکھ دی گئی ہیں۔ لائبریری کے صدر محمد نعیم کا کہنا ہے کہ دیمک اور جگہ کی کمی کی وجہ سے ہم بہت سی کتابوں سے محروم ہوگئے ہیں۔ ہم پچھلے کئی برسوں سے لائبریری کے لیے اراضی الاٹ کرانے کے لیے جدوجہد کرتے آرہے ہیں۔ یہ لائبریری ہم نے عوام کے استفادہ کے لیے بنائی ہے۔ مزید وہ کہتے ہیں کہ 90 فیصد کتابیں ہم نے فصیل بند شہر کے قدیم گھرانوں سے جمع کی ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے بہت سے شہروں جیسے آگرہ، سہارنپور وغیرہ سے بھی کتابیں منگوائی ہیں۔ اس کے علاوہ پورے ملک کی مختلف اسکریپ مارکیٹ سے کتابیں لائی گئی ہیں۔ لائبریری میں موجود نایاب کتابوں میں سے ایک 100 سال پرانا قرآن مجید ہے جس کا خط 13 مختلف خطاطی کے خطوں پر مشتمل ہے یہ قرآن ہمیں ایک بوڑھی خاتون سے حاصل ہوا جب وہ اپنے بستر مرگ پر تھی۔ لائبریری کے جنرل سکریٹری سکندر مرزا چنگیزی نے بتایا کہ لائبریری میں دیوان غالب، غالب کے خطوط جو کہ ان کی اپنی تحریر میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ صوفی ازم پر ایک کتاب 'صوفی ازم سیر الکتب' جو کہ 100 صوفی سنت پر فارسی زبان میں 100 سال پہلے شائع کی گئی تھی، اس کے علاوہ اور بہت سی نادر و نایاب کتب موجود ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 مارچ 2014

جشن بہار ٹرسٹ کے زیر اہتمام سالانہ عالمی مشاعرہ

نئی دہلی: اردو کی تہذیبی روایت مشاعرہ کو زندہ رکھنے کے لیے جشن بہار ٹرسٹ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والا سالانہ بین الاقوامی مشاعرہ کا انعقاد دہلی پبلک اسکول متھرا روڈ میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ہوا۔ مشاعرے کا آغاز شمع روشن کرکے کیا گیا۔ اس مشاعرے میں پروفیسر خلیل ٹوکر، ترکی، پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی، ریحانہ روحی پاکستان، اجمل سراج، پاکستان، احمد سلمان پاکستان، فہمیدہ ریاض پاکستان، پروفیسر وسیم بریلوی، منظر بھوپالی، نسیم نکہت، آغا سروش، ترنم ریاض، پاپولر میرٹھی، پرمود تیواری، نشتر امروہوی، جاپان سے پروفیسر سویامانے 'یاسر' تاجکستان سے زیبونیسو مالا کھواشریک تھے۔ مشاعرہ کی نظامت منصور عثمانی نے کی۔ اس موقعے پر سپریم کورٹ کے جج اور مہمان خصوصی ٹی ایس ٹھاکر نے اردو کے حوالے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو دلوں کو چھونے والی زبان ہے جس طرح اردو دنیا میں دوسری زبانوں میں ایک شیریں ہے، اسی طرح اردو کی طرح اردو شاعری کسی دوسری زبان میں نہیں کی جاسکتی۔ اردو شاعری کی دلکشی سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ یہ زبان باہمی ہم آہنگی اور امن و محبت کی زبان ہے۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید نے کہا کہ اردو نے دنیا کو نیا راستہ دکھایا ہے، اردو ایک تہذیب اور ثقافت کی علمبردار زبان ہے جس میں ہندوستان کی ثقافت سمائی ہوئی ہے۔ مہمان اعزازی کے طور پر مدعو دوردرشن کے ڈائریکٹر جنرل ترپراری چرن اردو کی دلکشی اور نغمگی کے حوالے سے اہم باتیں کیں۔ انھوں نے اردو کے آغاز اور اس کے ارتقا پر بھی روشنی ڈالی۔ مشاعرہ معنویت کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ اس بین الاقوامی شہرت کے حامل مشاعرے کی اپنی تہذیبی حیثیت ہے جو پچھلے 16 سالوں سے مستقل منعقد ہوتا چلا آرہا ہے۔ انھوں نے ڈی ڈی اردو پر اردو پروگرام کی بارے میں بھی بتایا۔ مشاعرہ کی بانی کامنا پرساد نے مشاعرہ کی روداد پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ 16واں مشاعرہ ہے۔ انھوں نے اردو زبان کی شیرینی اور حسن آفرینی پر دلچسپ گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان میں سمندر کی گہرائی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس مشاعرہ کو منفرد بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 اپریل 2014

ماڈرن اسکول میں شنکر وشاد مشاعرے میں اسٹیج پر بیٹھے ہوئے شعرائے کرام ومہمانان

49واں شنکر وشاد مشاعرہ

نئی دھلی: دہلی کے دل میں ابھی اردو کی چاہت برقرار ہے اور اردو کے لیے دہلی والوں کا دل دھڑکتا ہے۔ دہلی کے شنکر وشاد مشاعرہ میں سامعین کی اتنی کثرت سے شرکت اس بات کا ثبوت ہے۔ یہ بات ماڈرن اسکول میں شنکر لال مرلی دھر میموریل سوسائٹی کے زیراہتمام منعقد کیے گئے پروقار شنکر و شاد ہند- پاک مشاعرہ میں حکومت ہند کے منصوبہ بند کمیشن کی ممبر سیدہ سیدین حمید نے کیا۔ سیدہ سیدین حمید نے مزید کہا کہ مشاعرے اور ادبی سرگرمیاں دہلی کی تاریخی روایت کا حصہ ہیں اور دہلی کی اپنی ایک خاص تہذیب ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کے اس پرآشوب دور میں اتنے طویل عرصے تک اردو سے محبت کے مشن پر قائم رہنا اپنے آپ میں ایک اہم کام ہے۔ شنکر وشاد پریوار اور ڈی سی ایم پریوار اس کے لیے قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اپنے بزرگوں کے مشن کو جاری رکھا اور آج بھی اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے اس موقعے پر اردو کی خدمات کے حوالے سے خشونت سنگھ اور عابد حسین کا ذکر کرتے ہوئے انھیں خراج عقیدت بھی پیش کیا۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ دہلی میں شنکر وشاد پریوار اردو اور ادب کی خدمت کا کام انجام دیتا رہے گا۔ اس سے قبل محترمہ سیدین حمید، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اور پدم شری بیکل اتساہی نے مشاعرہ کی شمع روشن کی۔ مشاعرہ کا آغاز روایتی انداز سے شنکر وشاد کے کلام سے کیا گیا۔ استاد جمیل نے اپنی مترنم آواز میں ان کا کلام پیش کیا۔ مشاعرہ کی صدارت پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے اور نظامت انور جلال پوری نے کی۔ بعد ازاں فہمیدہ ریاض، عزیز نبیل، ذکیہ غزل، منور رانا، ملک زادہ منظور احمد، ترنم ریاض، نواز دیوبندی، گوہر رضا، اعجاز پاپولر میرٹھی، چرن سنگھ بشر، ش ک نظام، خوشبیر سنگھ شاد و دیگر شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 مارچ 2014

دہلی میں رسالہ 'رہنما' کی شاخ کا افتتاح

نئی دھلی: ''ماہنامہ 'رہنما' (اردو/ ہندی) محض ایک جریدہ نہیں بلکہ یہ ایک تحریک اور مشن ہے جو ہمیں صالح معاشرے کی تشکیل میں معاونت کرتا ہے''۔ یہ باتیں مرکزی جمعیت اہلحدیث (دہلی) کے ناظم عمومی اور معروف عالم دین مولانا اصغر علی مدنی نے افتتاحی تقریب میں فرمائیں۔ مولانا موصوف نے مزید کہا کہ میگزین کے مدیر رضوان ریاضی ایک اولوالعزم اور بلند حوصلہ انسان ہیں۔ میگزین رہنما کے شمارے کی رونمائی بھی عمل میں آئی۔ ڈاکٹر کوثر مظہری نے رہنما کے متعلق اظہار خیال کرتے

ہوئے کہا کہ یہ اپنے مواد کی رنگارنگی اور ترتیب کے اعتبار سے اپنی نمایاں اہمیت رکھنے والا رسالہ ہے۔ اور اب یہ صرف چمپارن کا رسالہ نہیں بلکہ پوری اردو دنیا کا رسالہ بن چکا ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر مولا بخش نے رسالے کے ایڈیٹر رضوان ریاضی اور جوائنٹ ایڈیٹر نسیم احمد نسیم کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے صحت منداور تعمیری رسالے کی آج اشد ضرورت ہے۔ ڈاکٹر مشتاق صدف نے سابقہ صحافتی تجربات ومشاہدات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس رسالے میں کئی اہم چیزوں کی شمولیت ابھی باقی ہے۔ ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے میگزین 'رہنما' سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے اسے اپنی پسند کے اہم ترین چند رسالوں میں شمار کیا۔ اخیر میں مدیر رہنما جناب ریاضی نے تفصیل کے ساتھ میگزین رہنما کے آغاز وارتقا کی بابت اظہار خیال کیا اور دہلی میں اس کی شاخ کے قیام کا مقصد بھی اجاگر کیا۔ پروگرام کی صدارت مولانا اصغر علی مدنی نے فرمائی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے انجام دیے۔

رپورٹ: ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، نئی دہلی، 31 مارچ 2014

آندھرا پردیش:

مانو میں اردو کی وکی پیڈیا ورکشاپ

حیدرآباد: زبانوں کی بقا وترقی کے لیے ضروری ہے کہ انھیں سائنس وٹکنالوجی کے بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ کیا جائے۔ اہل اردو کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ آگے بڑھ کر اپنی زبان کو جدید ٹکنالوجی سے وابستہ کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ ان خیالات کا اظہار مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں منعقدہ اردو وکی پیڈیا ورکشاپ کے موقعے پر سنٹر فار انٹرنیٹ اینڈ سوسائٹی، بنگلور کے پروجیکٹ ڈائرکٹر سید مزمل الدین نے کیا۔ موصوف شعبہ مطالعات ترجمہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور سینٹر فار انٹرنیٹ اینڈ سوسائٹی کے اشتراک سے منعقد ہونے والے اردو وکی پیڈیا ٹریننگ ورکشاپ سے خطاب کررہے تھے۔ قبل ازیں ورکشاپ کے آغاز میں پروفیسر محمد ظفرالدین صدر شعبہ مطالعات ترجمہ ڈین اسکول برائے السنہ، لسانیات و ہندوستانیات ورکشاپ، کی غرض وغایت اور اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ اردو وکی پیڈیا ورکشاپ کے ذریعے شعبہ مطالعات ترجمہ یہ چاہتا ہے کہ ہمارے طلبہ کو اردو کی پیڈیا میں مختلف موضوعات پر مواد کے داخلے اور ترمیم کے ذریعہ اسے ثروت مند بنانے کی تربیت دی جائے۔ اس ورکشاپ سے سنٹر فار انٹرنیٹ اینڈ سوسائٹی کے ڈائرکٹر وشنو وردھن نے بنگلور سے ویڈیو کانفرنس کے ذریعے آن لائن خطاب کرتے ہوئے وکی پیڈیا کی اہمیت وافادیت بتائی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 6 مارچ 2014

اتر پردیش:

یوپی میں اردو میڈیم اسکولوں کا قیام ضروری: اختر الواسع

لکھنؤ: ملک میں لسانی اقلیتوں کے مفادات کے تحفظ اور اس سے متعلق اسکیموں کی نگرانی کے لیے قائم دستوری عہدہ 'کمشنر برائے لسانی اقلیات' پر نامزد کیے گئے پروفیسر

تصویر میں کمشنر برائے لسانی اقلیات پروفیسر اختر الواسع

اختر الواسع کا کہنا ہے کہ وہ تعلیمی ادارے جنھیں لسانی اقلیتوں نے اپنی ثقافتی اور لسانی شناخت کے حوالے سے

قائم کیا ہے انھیں لسانی اقلیتی ادارے کے طور پر تسلیم کرنے اور سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا اختیار کمشنر برائے لسانی اقلیات کو ملنا چاہیے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ مرکز کی سطح پر قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات (این سی ایم ای آئی) قائم ہے جس کا کام مذہبی اقلیات کے ذریعے قائم تعلیمی اداروں کو تسلیم کرنے اور انھیں سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا اختیار حاصل ہے، اسی طرح لسانی اقلیتوں کے لیے بھی نظم ہونا چاہیے۔ اپنی لکھنؤ آمد کے موقعے پر پروفیسر اختر الواسع نے ریاستی گورنر بی ایل جوشی سے ملاقات کی اور ان کی توجہ یوپی میں اردو میڈیم اسکول قائم کیے جانے کی ضرورت کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ اختر الواسع نے کہا کہ یوپی میں اردو کا سب سے بڑا مسئلہ تو یہی ہے کہ مادری زبان میں تعلیم کا نظم ہونا چاہیے جو نہیں ہے۔ جو لوگ اردو میڈیم اسکول قائم کرنا چاہتے ہیں حکومت ان کو تسلیم کرے اور منظوری دے، ریاستی حکومت کو اس پر آمادہ کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی کہ وہ پرائمری تعلیم اردو لسانی اقلیت کو اردو میڈیم سے دینا یقینی بنائے۔ اس کے لیے بیسک شکشا بورڈ کے ضابطہ میں حکومت کو ترمیم کرنی ہوگی۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ بہار، آندھرا پردیش، کرناٹک اور مہاراشٹر جیسی ریاستوں میں اردو کی صورت حال قدرے بہتر ہے۔ انھوں نے گورنر کے سامنے یہ بات رکھی کہ اردو لسانی اقلیت کے مطالبہ کے مطابق اردو میڈیم اسکول کے قیام کے امکانات کے لیے ریاستی حکومت پر اپنے اثرات کا استعمال کریں۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 مارچ 2014

علامہ شبلی نعمانی ماضی آگاہ مستقبل شناس

لکھنؤ: 'علامہ شبلی نعمانی: ماضی آگاہ مستقبل شناس' کے عنوان سے ایک سمپوزیم کا اہتمام نیوکلیس ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی نے کیا۔ سمپوزیم سے دارالمصنفین کے ڈائرکٹر اور مہمان خصوصی پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے اپنے خطاب میں کہا کہ علم و تحقیق کے میدان میں شبلی نے خود کو قید نہیں کرلیا بلکہ ملت اسلامیہ کے لیے خود کو وقف کیا، جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندر ملت اسلامیہ کا درد تھا۔ ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی نے کہا کہ شبلی نے ہندو مسلم اتحاد اور ملک کی خوش حالی کے لیے جو لائحہ عمل بن سکتا تھا۔ اس کی منظم کوشش کی۔ مہمان خصوصی اور کمشنر برائے لسانی اقلیات پروفیسر اختر الواسع نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ شبلی کی ہمہ جہت شخصیت اور کارناموں سے صرف نظر کرکے ہندوستانی مسلمانوں کی کوئی تاریخ نہیں لکھی جاسکتی۔ وہ ادارہ ساز اور افراد ساز تھے۔ اس موقعے پر دیگر مقررین نے بھی خطاب کیا اس کامیاب سمپوزیم کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر عمیر منظر نے انجام دیے۔ ڈاکٹر شاہ محمد فائز نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی کتاب 'شبلی شناسی کے سو سال' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ آخر میں نیوکلیس ایجوکیشنل سوسائٹی کے جنرل سکریٹری نثار احمد نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 مارچ 2014

نیوکلیس ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے تحت منعقدہ سمپوزیم میں 'شبلی شناسی کے سو سال' نامی کتاب کا اجرا عمل میں آیا

بزم خواتین کی تہنیتی تقریب

لکھنؤ: یوم بزم خواتین کی جانب سے ایک تہنیتی تقریب کا اہتمام پریس کلب میں کیا گیا۔ تقریب کی صدارت بزم خواتین کی صدر بیگم شہناز سدرت اور نظامت ڈاکٹر منصور حسن خاں نے کی۔ مہمان خصوصی ذکی کاکوروی مقیم حال امریکہ تھے۔ اس موقعے پر ذکی کاکوروی، بیگم شہناز سدرت، سدرت اللہ انصاری اور ڈاکٹر عشرت ناہید کے دست ہائے مبارک سے رقیہ بیگم، ڈاکٹر عروج فاطمہ، درگیش مہروترا اور قریشہ خان کو بزم خواتین کی طرف سے 'بیگم افزا ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ تقریب کا دوسرا اہم پہلو مسرور ایجوکیشنل سوسائٹی کی جانب سے شائع کردہ بانی بزم خواتین و آل انڈیا تعلیم گھر مرحوم حیات اللہ انصاری کی ہمہ جہت شخصیت پر یادگاری مجلّہ کی رسم اجرا تھی۔ روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 9 مارچ 2014

علی گڑھ میں اردوئے معلا کا دوسرا جلسہ

علی گڑھ: انجمن اردوئے معلا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے معلا کا دوسرا جلسہ زیر صدارت پروفیسر قاضی جمال حسین، شعبۂ اردو کے منعقد ہوا۔ جلسے کے مہمان خصوصی صدر شعبۂ اردو، پروفیسر عقیل احمد اور سابق صدر شعبۂ اردو، پروفیسر محمد زاہد تھے۔ پروگرام کی نظامت انجمن کے سکریٹری علیم اللہ نے کی۔ آج کا یہ جلسہ خالص تخلیقی تھا۔ جس میں کئی طلبا نے شرکت کی۔ محمد اسلم مصباحی کا انشائیہ، علیم اللہ ابن یعقوب کا افسانہ اور غزالہ سلطان، خیرالدین اعظم اور عبیداللہ نفیس نے اپنی اپنی غزلوں سے سامعین کو محظوظ کیا۔ اسلم نے اپنے انشائیہ میں موجودہ زمانے کے مشاعروں پر نقطہ چینی کرتے ہوئے ان کے حالات و کوائف کو ایسے دلچسپ انداز میں پیش کیا کہ سامعین خوب لطف اندوز ہوئے۔ علیم اللہ کا افسانہ منگودادا موجودہ سیاسی تناظر میں لکھا گیا افسانہ تھا۔ غزالہ اور خیرالدین اعظم نے اپنی تین تین غزلیں پیش کیں جب کہ عبیداللہ نفیس نے اپنی ایک غزل نہایت سنجیدگی کے ساتھ پیش کی۔ آخر میں صدر جلسہ کا اصلاحی خطبہ ہوا جس میں انھوں نے طلبا کو نصیحت کرتے ہوئے ایسے جلسوں میں شرکت کرنے کی ترغیب دی اور ساتھ ہی انھوں نے شریک تمام شعرا اور مضمون نگار طلبا کی خوب ہمت افزائی کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 20 مارچ 2014

علی گڑھ میں اسلامی خطاطی کی نمائش

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن کے زیر اہتمام ایک سہ روزہ 'ہندوستانی اسلامی خطاطی' کی نمائش کا انعقاد کیا گیا۔ نمائش کا افتتاح وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ضمیرالدین شاہ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے بیگم وائس چانسلر محترمہ صبیحہ سمیس شاہ، پرووائس چانسلر بریگیڈیئر جناب سید احمد علی اور دیگر حضرات بھی موجود تھے۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے وائس چانسلر نے کہا کہ مغربی اور اسلامی ممالک میں اسلامی خطاطی کے فن کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اور اسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ حیدرآباد سے روزنامہ سیاست کے مینیجنگ ڈائرکٹر جناب ظہیرالدین علی خاں اور ان کے ساتھ تشریف لائے مہمان خطاط اساتذہ نے اپنے بہترین شہ پاروں سے نمائش کو زینت بخشی۔ طلبہ کی اس کوشش کو ناظرین اور زائرین نے بہت سراہا اور دل کھول کر تعریف کی۔ آخر میں خطاطی کے دو طلبا روحی خاں اور وشنو مہیشوری نے وائس چانسلر اور پرووائس چانسلر کو یادگاری نشان پیش کیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 21 مارچ 2014

لٹریری اینڈ کلچرل سوسائٹی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا پروگرام

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تاریخی ہال سرسید ہال نارتھ لٹریری اینڈ کلچرل سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں محفل مشاعرہ بھی شامل تھا۔ مہمانِ خصوصی شعبۂ قانون کے ممتاز استاد ڈاکٹر شکیل صمدانی اور مہمانِ اعزازی پونہ (مہاراشٹر) سے

آئے انیس چشتی و شیخ افضل تھے۔ ڈاکٹر شکیل صمدانی نے کہا کہ آج اردو ادب دم بخود ہے۔ آج اردو کے کم استعمال سے سیاسی شعور بھی غائب ہو چکا ہے۔ صدارتی خطبہ میں معروف شاعر ڈاکٹر الیاس نوید نے اردو ادب اور شعر و شاعری کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اگر آج ہم اردو کے ساتھ ساتھ چلیں تو ہمیں ہر وہ عزت و تکریم ملے گی جس کے ہم مستحق ہیں۔ پونہ (مہاراشٹر) سے آئے عظیم نقاد انیس چشتی نے کہا کہ اردو آج جہاں ہونی چاہیے تھی وہاں نہیں ہے۔ اس پروگرام کے بعد ایک مشاعرے کا بھی انعقاد کیا گیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 مارچ 2014

مولانا محمد علی جوہر، مجاہد آزادی، شاعر اور صحافی

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور اتر پردیش اردو اکادمی کے باہمی اشتراک سے دو روزہ

قومی سیمینار کا انعقاد بعنوان 'مولانا محمد علی جوہر: مجاہد آزادی' شاعر اور صحافی' عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کی۔ مہمانان خصوصی کے بطور پروفیسر محمد یونس (شیخ الجامعہ محمد علی جوہر یونیورسٹی، رام پور) اور پروفیسر منظور احمد (شیخ الجامعہ، سبھارتی یونیورسٹی، میرٹھ شریک ہوئے۔ مہمانانِ ذی وقار کی حیثیت سے پروفیسر جے کے پنڈیر (پروائس چانسلر، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی)، پروفیسر وائی وملا (ڈی ایس ڈبلیو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ نے شرکت کی جب کہ خصوصی مقرر کی حیثیت سے نواسۂ مولانا محمد علی جوہر ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی تشریف لائے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر رباب انجم نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ پروگرام کا آغاز ڈاکٹر محمد یونس غازی نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ پروفیسر جے کے پنڈیر نے مہمانوں کے ساتھ مل کر شمع روشن کی۔ ڈاکٹر آصف علی اور پروفیسر صالحہ رشید نے مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت اور کارناموں پر اپنا پرمغز مقالہ پیش کیا۔ خصوصی مقرر ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مولانا محمد علی جوہر ایک سچے، بے باک اور محبِ وطن انسان تھے۔ مہمان خصوصی پروفیسر محمد یونس نے کہا کہ وہ صحیح معنوں میں ایک سچے ہندوستانی، مجاہد آزادی، شاعر اور بلند پایہ صحافی تھے۔ پروفیسر جے کے پنڈیر نے کہا کہ اس طرح کے سیمیناروں میں ملک کی عظیم ہستیوں کے تعلق سے معلومات کے ساتھ ساتھ حب الوطنی کے جذبہ کو بھی فروغ ملتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ مولانا محمد علی جوہر کی اتنی بڑی شخصیت ہونے کے پیچھے ان کی ماں بی اماں کا ہاتھ رہا۔ آج کی عورتوں کو اس سے نصیحت حاصل کرنا چاہیے تبھی معاشرے میں مولانا محمد علی جوہر جیسی شخصیت پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے افسانوی مجموعے 'لینڈرا' کے پاکٹ بکس ایڈیشن کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس موقعے پر عمائدین شہر اور کثیر تعداد میں طلبہ طالبات نے شرکت کی۔ روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 30 مارچ 2014

اقبال کی شخصیت اور فن

سہارنپور: اسلامیہ ڈگری کالج کے شعبۂ اردو کی طرف سے اقبال کی شخصیت اور فن پر سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کی صدارت پروفیسر فیاض انصاری اور نظامت پروفیسر ضیغم عباس زیدی نے کی۔ سیمینار کے مہمان خصوصی ڈاکٹر جمیل مانوی نے اقبال کی شخصیت اور فن پر سیر حاصل گفتگو۔

اسلامیہ انٹر کالج کے پرنسپل پروفیسر جلال عمر نے اقبال کی شاعری کے محاسن اور فنی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ ہندو کنیا انٹر کالج کی پرنسپل ڈاکٹر قدسیہ انجم نے کلام اقبال کے رنگ تغزل کو عورت کا مرہون منت بتایا۔ شمین زبیری نے کہا کہ اقبال حب الوطن تھے، وطنیت کے نظریے کے پرستار ہرگز نہیں تھے اور ان کی شاعری کی اساس قرآن کریم اور حضور اکرمؐ کی ذات مقدمہ تھی۔ پروفیسر ضیغم عباس نے اقبال کے نظریہ عشق اور حب رسولؐ پر اپنا مقالہ پیش کیا اور انھیں اسلامی اور انسانی نظریات کی ترجمانی کرنے والا شاعر بتایا۔ سیمینار میں کالج کے پرنسپل آر کے شرما، پروفیسر اختر علی خاں اور منتظمہ کمیٹی کے نائب منیجر قاضی شوکت حسین کے علاوہ کالج کی طالبات نے بھی مقالات پڑھے۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 مارچ 2014

شبلی اپنی اردو شاعری کی روشنی میں

اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکادمی میں 'شبلی اپنی اردو شاعری کی روشنی میں' کے موضوع پر ایک یادگاری خطبے کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر بطور مہمان خصوصی مشہور ناقد

اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ شبلی نے ایک طرف اسلامی تاریخ کے عظیم کرداروں کو اردو میں متعارف کرانے کا بیڑا اٹھایا تو دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں کا دفاع کرنے کے لیے اردو شاعری کا سہارا لیا۔ ناظم جلسہ اور شبلی اکادمی کے سینئر رفیق مولانا عمیر الصدیق ندوی نے پروفیسر خالد محمود کی ادبی و تنقیدی خدمات پر روشنی ڈالی۔ دارالمصنفین کے ڈائریکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے کہا کہ انھوں نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور بظاہر ایک دوسرے سے تعلق نہ ہونے کے باوجود اس کا حق ادا کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شباب الدین، مولانا محمد طاہر مدنی، ڈاکٹر فخر الاسلام، پروفیسر تسنیم فاطمہ، ڈاکٹر عمیر منظر، نثار جیراجپوری، شوکت علی علیگ وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' گورکھپور، 9 مارچ 2014

امروہہ میں مولانا شہباز کی شاعری پر سیمینار

امروہہ: سردار حمیدی تعلیمی مشن کی جانب سے یوپی اردو اکادمی کے تعاون سے ایک سیمینار 'مولانا شہباز امروہوی کی شاعری وان کا طنز ومزاح' کے عنوان سے ستیم واٹکا میں منعقد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر سردار ایوب خاں نے کی جب کہ نظامت عبدالحق انجم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی پروفیسر منظر عباس نقوی نے

شہباز امروہوی کی شاعری پر روشنی ڈالی۔ مہمان ذی وقار عتیق الرحمٰن فاروقی اور عامر مصطفےٰ رضوی نے کہا کہ شہباز امروہوی کی شاعری کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی شاعری میں ادب کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔شیبان قادری نے کہا کہ مصحفی کی سرزمین امروہہ میں اہل قلم، اہل ہنر، اہل نظر پیدا ہوئے ان میں شہباز امروہوی منفرد اسلوب کے سبب ممتاز نظر آتے ہیں۔ سردار حمیدی مشن کے سکریٹری بابر مرزا نے سوسائٹی کی کارگزاری پر روشنی ڈالی۔مشن کے صدر ڈاکٹر افتخار انیس نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 31 مارچ 2014

اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں مدارس اسلامیہ کی خدمات ناقابل فراموش

دیوبند: دارالعلوم دیوبند میں متحدہ پورنیہ بہار کے طلبا کی جانب سے ایک شاندار بیت بازی مقابلہ کا انعقاد کیا گیا جس میں متعلقہ طلبا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بیت بازی مقابلہ بزم شاد اور بزم قاصر کے نام منسوب تھا۔اس موقعے پر مہمان خصوصی عبداللہ عثمانی نے صاف لفظوں میں کہا کہ اردو اگر زندہ ہے تو وہ مدارس کی دین ہے۔اس موقعے پر اپنے صدارتی کلمات میں مولانا فضیل احمد ناصر نے کہا کہ طلبہ کو چاہیے کہ تدریسی مشاغل کے ساتھ اردو ادب سے اپنا رشتہ استوار کریں۔ پروگرام کی نظامت شمس الزماں نے کی۔معروف شاعر عبداللہ راہی اور ڈاکٹر عدنان انور نعمانی نے شرکت کی۔ پروگرام کو کامیاب بنانے والوں میں سلمان احمد، جرجیس اکرم، وصی احمد، فہیم الدین، و جملہ رفقا نے اہم رول ادا کیا۔تقریب کا اختتام مولانا ناصری کی دعا پر ہوا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 24 مارچ 2014

علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے ایک متحرک رکن تھے

وارانسی: علی سردار جعفری صدی تقریبات کے سلسلے سے بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبہ اردو نے بدھ کو ایک لکچر کا انعقاد کیا۔ آرٹس فیکلٹی کے آر کے ہال میں ہونے والے اس پروگرام کی صدارت شعبۂ ہندی بی ایچ یو کے صدر پروفیسر بلراج پانڈے نے کی۔ جلسہ میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد پروفیسر علی احمد فاطمی نے کلیدی خطبہ دیا۔ پروگرام کا آغاز بی ایچ یو کے بانی پنڈت مدن موہن مالویہ کے مجسمے کی گل پوشی سے کیا گیا۔ اس کے بعد جامعہ کی طالبات نے جامعہ کا ترانا گایا۔

شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر نسیم احمد نے اپنے مخصوص انداز میں مہمانوں کا استقبال کیا۔ اپنے خطاب میں پروفیسر علی احمد فاطمی نے بتایا کہ علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے ایک رکن تھے، مگر ان کی شاعری میں صوفیانہ رنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔ان کی نظم 'نئی دنیا کو سلام' ان کے فکری تجربات کی شاہد ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 مارچ 2014

مکالمہ جبرئیل وابلیس پر سیمینار

بلریاگنج اعظم گڑھ: علامہ اقبال کی مشہور نظم 'مکالمۂ جبرئیل و ابلیس' اگرچہ بائیس مصرعوں پر مشتمل ہے، مگر موضوع اور فن شعر کے اعتبار سے فصاحت و بلاغت کا ایسا دلچسپ اور فکر انگیز مرقع ہے کہ کئی طویل نظموں سے زیادہ اہمیت حاصل کرگئی ہے۔ اس نظم کے توسط سے اقبال نے پہلی بار اپنے فلسفہ خودی کو واضح کیا ہے۔ان خیالات کا اظہار پروفیسر خالد محمود نے جامعۃ الفلاح کے ابواللیث ہال میں کیا۔ دارالمصنفین کے ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ جامعۃ الفلاح کے ناظم مولانا محمد طاہر مدنی نے مہمانوں کا خیر مقدم اور تعارف پیش کیا۔مولانا نے پروفیسر خالد محمود کی علمی اور عملی سرگرمیوں سے طلبہ کو واقف کرایا۔ مولانا عبدالعظیم فلاحی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 مارچ 2014

بہار:

انجمن ترقی اردو گوپال گنج کی تشکیل نو

گوپال گنج: انجمن ترقی اردو گوپال گنج کی تشکیل نو کے بعد اس کے نئے دفتر کے افتتاح کے سلسلے میں ایک

تقریب آزاد نگر وارڈ نمبر 22 شبنم ہوٹل کے عقب میں سید مبین الحق کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ اظہار الحق صدیقی صدر انجمن ترقی اردو بہار کے ہاتھوں فیتہ کاٹ کر کے رسم افتتاح ادا ہوئی۔اپنے صدارتی خطبہ میں سید مبین الحق نے کہا کہ انجمن ترقی اردو گوپال گنج کو پورے بہار میں سب سے زیادہ فعال کرنا ہے۔ سابق صدر معراج الدین تشنہ نے نو منتخب صدر کی ہمت افزائی کی۔اس موقعے پر فہیم جوگاپوری، سمیع بہواروی اور ڈاکٹر ذکی ہاشمی کو اعزازات اور توصیفی سند سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' پٹنہ/رانچی، 11 مارچ 2014

تمل ناڈو:

دستورِ ہند-اقلیتی حقوق اوراردو

چنئی: تمل ناڈو اردو رابطہ کمیٹی، چنئی کے زیر اہتمام مشہور ومعروف شاعر اور کمیٹی کے صدر ملک العزیز کا تب کی صدارت میں ایک پروگرام ونیتا میٹریکولیشن اسکول، ویپری، چنئی میں منعقد ہوا جس میں زکوٰۃ فاؤنڈیشن

آف انڈیا اور ہندوستان کے معروف کالم نگار ڈاکٹر سید ظفر محمود کے علاوہ کئی باذوق ادیب وشعرا شریک رہے۔ اس اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ملک العزیز نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ باشندگان تمل ناڈو نے اردو ادب کی بقا وارتقا میں جو بے مثال کارنامہ انجام دیا ہے، وہ سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس پروگرام کی نظامت تمل ناڈو اردو رابطہ کمیٹی کے سکریٹری اور صدر شعبۂ تاریخ، اسلامیہ کالج، وانمباڑی کے پروفیسر ایم محمد سہیل نے انجام دیں۔ ڈاکٹر ظفر محمود نے کہا کہ ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد گیارہ کروڑ ہے لیکن سرکاری مردم شماری کے مطابق زبان اردو میں بات چیت کرنے والوں کی تعداد صرف پانچ کروڑ بتلائی گئی ہے جو سراسر اردو اور اہل اردو کی حق تلفی ہے۔ ایم ایس شریف، ڈائرکٹر اسلامک بینکنگ، چنئی نے ڈاکٹر سید ظفر محمود کی تقریر کی جھلکیوں کو بزبان تمل ترجمہ کیا۔ محترمہ کے رضوانہ بانو نے اپنی شیریں تقریر سے ہر سامع کو محظوظ کیا، انھوں نے سامعین سے درخواست کی کہ وہ اپنی اولاد کو اردو تعلیم دیں اور جہاں اردو کی تعلیم نہ ہو، وہاں اپنی اولاد کو داخلہ نہ دینے کی تجویز بھی پیش کی۔ آخر میں درج ذیل قرار دادیں منظور کی گئیں جس کو ملک العزیز

نے چار سو سے زیادہ سامعین کے سامنے پڑھ کر سنایا اور منظوری حاصل کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' بنگلور، 10 مارچ 2014

جموں کشمیر:

عالمی اردو ٹرسٹ کی کشمیر شاخ کا آغاز

سرینگر: ہندوستان میں اردو کی ترقی و ترویج کے لیے سرگرم عالمی اردو ٹرسٹ نے جموں و کشمیر کو اردو زبان کی محفوظ پناہ گاہ قرار دیتے ہوئے ریاست میں اپنی سرگرمیاں شروع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ٹرسٹ نے کہا ہے کہ اردو

زبان کشمیریوں کی اپنی زبان نہ ہوتے ہوئے بھی ریاست کی مادری زبان کی طرح ہی یہاں مقبول ہے اور یہ کہ کشمیری عوام اس زبان سے محبت کرتے ہیں۔ عالمی اردو ٹرسٹ نے یہاں ایک پریس کانفرنس کے دوران تنظیم کے باب کشمیر کی تشکیل و آغاز کے موقعے پر ان مشاہدات کا اظہار کیا اور کہا کہ ریاست میں اردو اور اردو داں حلقے کے مفاد میں ہر ممکن کوشش کی جائیں گی۔ اے رحمٰن نے رواں سال نومبر میں کرشن چندر کی اردو کے تئیں خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے سری نگر میں ایک شاندار تقریب کے انعقاد کا بھی اعلان کیا۔ اس موقعے پر عالمی ٹرسٹ کے کشمیر باب کے لیے ایگزیکیٹو کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں غلام نبی خیال انور شاہ، بشیر عارف، جاوید آزر اور ایاز رسول نازشامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 مارچ 2014

مغربی بنگال:

اردو نظام تعلیم کو مستحکم کرنا وقت کی اہم ضرورت

کلکتہ: اس دلیل کے ساتھ کہ دنیا کی کوئی بھی زبان روزگار سے جڑے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، مغربی بنگال کے مشہور ادبی رسالہ مژگاں کی تجدید اشاعت کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے بنگال میں اردو تحریک کے اہم رکن اور ہیومن رائٹس پروٹیکشن ایسوسی ایشن کے چیئرمین شمیم احمد نے کہا کہ اردو زبان کے دائرہ کار کو وسعت دیے بغیر اس کی بقا ممکن نہیں ہے۔ اس موقعے پر نیشنل لائبریری کلکتہ کے اہم عہدے دار اور مشہور نقاد ابوذر ہاشمی نے کہا کہ اردو ادب کو روزگار سے جوڑنے کے بجائے اقدار سے جوڑنے کی ضرورت ہے۔ پروگرام کے صدر اور کلکتہ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر منصور عالم نے رسالے کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ رسالے ایک زمانے میں ہماری روح کی تازگی اور فکر کی توانائی کا اہم ذریعہ ہوتے تھے۔ مشہور نقاد اشفاق احمد نے رسالوں میں غیر معیاری مضامین کی شمولیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ عموماً ادبی رسالوں میں غیر معیاری مضامین شامل ہوتے ہیں جس کی وجہ سے رسالے اچھے پڑھنے والے قاریوں سے محروم ہوتا جارہا ہے۔ تقریب سے خطاب کرنے والوں میں ڈاکٹر محبوب راہی، پروفیسر نصرت جہاں، شاہنواز خاں، رضوان رضا، نوشاد مومن شامل تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20 مارچ 2014

مہاراشٹر:

بیاول میں اردو مصنّفین کانفرنس

ممبئی: بیاول میں مولانا ابوالکلام آزاد شکشنک و بہواد یشیہ سنستھا کے زیر اہتمام نیز مہاراشٹر راجیہ اردو ساہتیہ اکادمی ممبئی کے تعاون سے مولانا آزاد ہال میں کل مہاراشٹر اردو مصنّفین کانفرنس کا نعقاد عمل میں آیا۔ جس کی

صدارت معروف قلمکار قاضی مشتاق احمد صاحب نے فرمائی جبکہ افتتاح اقرا ایجوکیشن سوسائٹی جلگاؤں کے صدر الحاج عبدالکریم سالار صاحب نے شمع افروزی کے ذریعے کیا۔ اس مصنّفین کانفرنس میں مختلف اصناف سخن پر سینئر قلمکاروں نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ معروف قلمکار ڈاکٹر عظیم راہی نے افسانچے کی اہمیت، افادیت پر روشنی ڈالی۔ اردو ڈرامے کے مسائل پر صدر کانفرنس قاضی مشتاق احمد صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اردو صحافت کے عنوان پر ہفت روزہ 'خیر اندیش' مالیگاؤں کے مدیر و بانی خیال انصاری نے اردو صحافت کی صورتحال پیش کرتے ہوئے اردو صحافت کے مسائل اور ان کے ممکنہ حل پر گفتگو کی۔

خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے قاضی مشتاق احمد نے پوری کانفرنس کا سیر حاصل تجزیہ پیش کیا۔ جناب حبیب منظر، اشفاق عبدالغنی شیخ صاحب وغیرہ نے خصوصی طور پر شرکت کی اور اپنے ادبی ذوق کا مظاہرہ کیا۔ جناب رئیس فیض پوری اور انیس مخشری صاحب نے اس طرح کی کانفرنس کو بار بار منعقد کرانے کی ضرورت پر بات کی۔ جناب ایس ایم انور نے کانفرنس کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

پریس ریلیز، رحمان رضا، بیاول، مہاراشٹر، 26 مارچ 2014

شعبۂ اُردو میں یک روزہ قومی سیمینار

مراٹھواڑہ: ڈاکٹر بابا صاحب بی آر امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد کے شعبۂ اردو میں عزیز احمد کی صد سالہ یومِ پیدائش کے موقع پر یک روزہ قومی

سیمینار بہ عنوان 'عزیز احمد شخصیت اور فن' منعقد کیا گیا۔ اس سیمینار میں کل پانچ اجلاس ہوئے۔ پہلے اجلاس (برائے طلبا و طالبات) کی صدارت ڈاکٹر انور ظہیر انصاری نے کی۔ اس اجلاس میں مقالہ نگاروں نے 25 مقالات پیش کیے۔ دوسرے اجلاس (افتتاحی اجلاس) میں پروفیسر محمد غیاث الدین صدر شعبۂ اُردو نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ سیمینار کے اغراض ومقاصد پر ڈاکٹر کیرتی مالینی جاولے سیمینار کنوینر، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو نے روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر وجے پانڈھری پانڈے وائس چانسلر ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد نے صدارت و سیمینار کا افتتاح کیا۔ پروفیسر خالد سعید صدر شعبۂ اُردو مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی حیدرآباد نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ تیسرا اجلاس ڈاکٹر غلام دستگیر پرنسپل مہیلا مہاودیالہ شولاپور کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں کل 6 تحقیقی مقالات پیش کیے گئے۔ چوتھے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر انور ظہیر انصاری نے کی۔ اس اجلاس میں کل 7 تحقیقی مقالات پیش کیے۔ پانچواں اجلاس صدر شعبۂ اردو پروفیسر محمد غیاث الدین صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں پرنسپل غلام دستگیر، ڈاکٹر انور ظہیر انصاری اور ڈاکٹر شرف النہار نے اپنے تاثرات پیش کیے۔ تمام اجلاس میں نظامت اور شکریہ کے فرائض ڈاکٹر مسرت فردوس نے انجام دیے۔

پریس ریلیز، کرتی مالنی، جاولے، مہاراشٹر، 2 اپریل 2014

رشید اندوری: حیات، شخصیت اور خدمات

اندور: شعبۂ اردو اسلامیہ کریمیہ کالج کے زیر اہتمام 'رشید اندوری : حیات، شخصیت اور خدمات' موضوع پر یک روزہ صوبائی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ جس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر مختار شمیم (سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج بڑواہ ایم پی) نے کی۔ مہمانِ خصوصی جناب پروفیسر حلیم خان کے ہاتھوں شمع افروزی کی رسم ادا کی گئی، جس میں صدر سمینار پروفیسر مختار شمیم، دوسرے اجلاس کے صدر پروفیسر خلیل احمد صدیقی مشیر، ڈاکٹر حدیث انصاری، پروفیسر عزیز اندوری، رشید اندوری صاحبان نے بھی تعاون کیا۔ شمع افروزی کے بعد کالج کے پرنسپل پروفیسر ایم کے جھونور صاحب نے استقبالیہ خطبہ پیش کرتے ہوئے تمام حضرات کا تہہ دل سے استقبال کیا۔ اس کے بعد سمینار کی غرض و غایت اور مقاصد بیان کرتے ہوئے تمہیدی خطاب شعبۂ اردو کی صدر پروفیسر شبانہ نکہت انصاری نے بیان کیا۔ اس سیمینار میں تین اجلاس کا اہتمام کیا گیا جس میں نامور مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے۔

پریس ریلیز، شبانہ نکہت انصاری، صدر شعبۂ اردو، اسلامیہ کریمیہ، کالج، اندور، 31 مارچ 2014

بھساول میں ادبی سیمینار کا انعقاد

بھساول: حسنین فاؤنڈیشن بھساول کے زیر اہتمام یہاں بی زیڈ ہائی اسکول میں مختلف ادبی موضوعات پر سیمینار منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت عابد سر نے کی، افتتاح عبدالکریم سالار (اقرا جلگاؤں) نے کیا جبکہ ڈاکٹر محمود حسین (علیگ)، الحاج عاشق سیٹھ اور الحاج شریف ٹھیکیدار بطور خصوصی مہمان شریک تھے۔ ادبی سیمینار میں ضلع جلگاؤں کے ممتاز اہلِ قلم احسان رسول پوری (بعنوان شکیل بدایونی چند یادیں)، احمد کلیم فیض پوری (شمس اعجاز کی یادیں)، رشید قاسمی (خاندیس میں اردو افسانے کی صورتِ حال)، قیوم اثر (صابر زاہد جدید ادب کا نمائندہ شاعر)، قیوم راز (ایمان بیاولی کی شعری خدمات)، ایم رفیق (حضرت امیر خسرو: حیات و شاعری)، رحیم رضا (ادب اطفال صورتِ حال اور امکانات)، مشتاق کریمی (اردو مہاراشٹر کی دوسری سرکاری زبان کیوں؟) اور ایس ایم انور (سعادت حسن منٹو مختصر نویسی کے حوالے سے) نے اپنی نگارشات پیش کیں۔ نظامت کے فرائض مشتاق کریمی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر کافی تعداد میں ادب دوستوں نے شرکت کی۔ سیمینار کے انعقاد میں ممتاز افسانہ نگار احمد کلیم فیض پوری نے فاؤنڈیشن کو اپنا قیمتی تعاون دیا۔ فاؤنڈیشن کے صدر عبدالتواب سر اور دیگر اراکین نے بڑی محنت کی۔

پریس ریلیز حسنین فاؤنڈیشن، بھساول، 20 مارچ 2014

اعزاز و اکرام

پروفیسر اختر الواسع کمشنر برائے لسانی اقلیات

نئی دھلی: صدر جمہوریہ پرنب مکھرجی نے مرکزی وزارت اقلیتی امور کی سفارش پر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائریکٹر پروفیسر اختر الواسع کو کمشنر برائے لسانی اقلیات نامزد کیا ہے۔ اختر الواسع کمیشن کے 12 ویں اور ایسے پہلے کمشنر برائے لسانی اقلیات ہیں، جن کی مادری زبان اردو ہے۔ کمشنر برائے لسانی اقلیات ایک

دستوری عہدہ ہے جو آئین کی دفعہ 350B کے تحت قائم ہے۔ قومی کمیشن برائے لسانی اقلیات 1957 سے قائم ہے اور ملک بھر میں لسانی اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کی نگرانی اور تحفظ کا کام انجام دیتا ہے۔ پروفیسر واسع 1979 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بطور لکچرر وابستہ ہوئے اور 1991 میں پروفیسر ہوئے۔ وہ 1999 سے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے مسلسل ڈائریکٹر ہیں۔ اردو اکادمی دہلی کے مسلسل 3 مرتبہ وائس چیئرمین رہے۔ حال ہی میں انھوں نے مرکزی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کو اردو کے فروغ کے حوالے سے ایک رپورٹ پیش کی۔ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ان کے اعزاز میں ایک تہنیتی تقریب کا انعقاد عمل میں آیا جس میں انھوں نے کہا کہ میرے لیے قومی کمیشن برائے لسانی اقلیات کے کمشنر کے عہدے پر تقرر خوشی کا موقع ضرور ہے، لیکن اس سے زیادہ تکلیف مجھے اس بات کی ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے میرا رسمی تعلق ختم ہو رہا ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ علی گڑھ نے مجھے بنایا، البتہ جامعہ نے مجھے نئی پہچان دی۔ انھوں نے کہا کہ شعبے سے میرا رسمی تعلق ضرور ختم ہوا ہے، لیکن شعبے کے لیے جب بھی اور جیسی بھی میری ضرورت ہوگی میں ہمیشہ اس کے لیے تیار رہوں گا۔ شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے موجودہ صدر پروفیسر اقتدار محمد خاں نے اس موقعے پر جذبات سے پر لہجے میں کہا کہ پروفیسر اختر الواسع کے جانے سے شعبے اور جامعہ میں ان کا خلا شدت کے ساتھ محسوس کیا جائے گا، لیکن ہمیں فخر ہے کہ ان کی وجہ سے شعبے اور جامعہ کا نام ہمیشہ نمایاں ہوتا رہا۔ پروفیسر محمد اسحاق نے اس موقعے پر پروفیسر اختر الواسع کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ کمشنر برائے لسانی اقلیات کے عہدے پر ان کے تقرر سے امید کی جاتی ہے کہ عرصے سے گمنامی میں پڑے قومی کمیشن برائے لسانی اقلیات کی نہ صرف یہ کہ کارکردگی میں اضافہ ہوگا، بلکہ لسانی اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کا تحفظ بھی زیادہ بہتر انداز میں ہوگا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر سید شاہد علی نے کی اور شکریہ جنید حارث نے ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' 7 مارچ و روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 مارچ 2014

نظام صدیقی کو ساہتیہ اکادمی کے ہندوستانی زبانوں کا ترجمہ ایوارڈ

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کے صدر وشوناتھ پرشاد تیواری کی صدارت میں ساہتیہ اکادمی کی مجلس انتظامیہ کی میٹنگ میں 23 ہندستانی زبانوں کے ساہتیہ اکادمی ترجمہ ایوارڈ 2013 کے لیے کتابوں کے انتخاب کو منظوری دی گئی۔

اردو میں ترجمہ کے لیے ممتاز نقاد اور اسکالر نظام صدیقی کو ان کے بہترین ترجمہ 'کیاپ' کے لیے منتخب کیا گیا جو ممتاز فکشن نگار منوہر شیام جوشی کے ناول 'کیاپ' کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب پر ساہتیہ اکادمی منوہر شیام جوشی کو اپنے اعلیٰ ایوارڈ سے نواز چکی ہے۔

پریس ریلیز، مشتاق صدف، پروگرام آفیسر، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 10 مارچ 2014

ملک زادہ منظور احمد

آگرہ: معروف شاعر و ادیب ملک زادہ منظور احمد کو 'چترانشی فراق انٹرنیشنل ایوارڈ 2014' سے سرفراز کیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ آگرہ کے ادبی، ثقافتی اور سماجی ادارے 'چترانشی' کے زیر اہتمام سورسدن آڈیٹوریم آگرہ میں دیا گیا۔

یہ ایوارڈ اردو ادب کی عظیم شخصیت و معروف شاعر پدم بھوشن

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام منعقد پروگرام میں ایوارڈ یافتگان گروپ پوز دیتے ہوئے

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کی یاد میں دیا جاتا ہے۔ انھیں 51 ہزار روپے اور اعزاز نامہ پیش کیا گیا۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 17 مارچ 2014

جاوید اختر کو شعری مجموعہ 'لاوا' کے لیے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ

نئی دھلی: نغمہ نگار جاوید اختر کو کمانی آڈیٹوریم میں منعقد تقریب کے دوران ان کے شعری مجموعہ 'لاوا' کے لیے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ ہندی کی معروف مصنفہ مردلا گرگ کو ان کی تصنیف 'مل جل من' کے لیے اس انعام سے نوازا گیا۔ یہ انعام تمام 24 ہندوستانی زبانوں کے شعرا، ادیب اور مصنفین کو پیش کیا گیا۔ اس انعام کے تحت ایک ایک لاکھ روپے کا چیک، شال اور ایک مومنٹو شامل ہے۔ اس موقعے پر ساہتیہ اکادمی کے صدر وشوناتھ پرساد تیواری اور مہمان خصوصی رماکانت رتھ نے بڑی علمی گفتگو کی۔ یہ المیہ ہے کہ ہماری مادری زبان ہی ہمارے کنبے کے لوگوں تک نہیں پہنچ پارہی ہے۔ پروگرام کے دوران اردو زبان میں جاوید اختر، ہندی میں مردلا گرگ، آسامی میں روندسرکار، پنجابی میں منموہن، اڑیہ میں وجے مشرا، بنگلہ میں سبودھ سرکار، میتھلی میں سریشور جھا، گجراتی میں چینو مودی، ملیالم میں ایم این پالور انگریزی میں تیمسلاؤ، بوڈ میں انل بوڈو اور ڈوگری میں سیتارام سپولیہ کو بھی انعام سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 مارچ 2014

جتندر پرواز کو 'کنور مہندر سنگھ بیدی میموریل ایوارڈ'

دھلی: نوجوان شاعر جتندر پرواز کو دلی کی ادبی تنظیم 'کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریری ٹرسٹ' نے ان کی شعری

خدمات کے لیے 'کنور مہندر سنگھ بیدی میموریل ایوارڈ' سے نوازا جو نقد پچاس ہزار روپے پر مشتمل ہے۔ پدم بھوشن گوپی چند نارنگ نے پرواز کو ایوارڈ سے نوازتے ہوئے کہا کہ ''پرواز اردو کی نوجوان پیڑھی کے شاعر ہیں اور اردو میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ ان کا احترام کرتے ہوئے مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔'' اس موقعے پر پدم شری گلزار دہلوی پدم شری کشمیری لال ذاکر، ڈاکٹر سید شریف الحسن نقوی ونارنگ ساقی، وغیرہ نے جتندر پرواز کو مبارکباد پیش کی۔

پریس ریلیز، جتندر پروام، نئی دہلی، 26 مارچ 2014

شکیل اختر

نئی دھلی: ریڈیو جامعہ سے وابستہ ڈاکٹر شکیل اختر کو بہار اردو اکادمی کی طرف سے ان کی خدمات کے اعتراف میں رضوان احمد ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ شکیل اختر کو یہ ایوارڈ ان کی تازہ کتاب 'روبرو' کے لیے دیا گیا ہے۔ روبرو ان کے ذریعہ کیے گئے ریڈیو انٹرویوز کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ریڈیو کے حوالے سے ہی ڈاکٹر شکیل اختر کی تین کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 مارچ 2014

محمد احمد عبداللہ

بلرام پور: اترپردیش میں ضلع بلرامپور کے ایک گاؤں جیتاپور سے تعلق رکھنے والے اور جے این یو کے طالب محمد احمد عبداللہ سنابلی کو بتاریخ 14 مارچ 'پرم ویر چکریافتہ' کیپٹن باناسنگھ نے 'انڈ جینیس' 'اتھسٹھ بھارت' ایوارڈ سے نوازا۔ یہ ایوارڈ تعلیمی سال 2013 میں نمایاں کارکردگی کی بنا پر دیا گیا۔

پریس ریلیز محمد احمد عبداللہ، ریسرچ اسکالر، جے این یو نئی دہلی 25 مارچ 2014

رسم اجرا:

'حاضر غائب' کا اجرا

مالیر کوٹلہ: صوبہ پنجاب کے قصبہ مالیر کوٹلہ میں تنظیم 'افسانہ کلب' کے زیر اہتمام اشتیاق سعید کے افسانوں کا مجموعہ 'حاضر غائب' کا اجرا دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبہ اُردو اور نقاد پروفیسر ارتضیٰ کریم کے ہاتھوں مالیر کوٹلہ کلب کے وسیع احاطے میں عمل میں آیا۔ اس جلسے کی صدارت سہراب گروپ آف کمپنیز کے ڈائریکٹر امجد علی نے فرمائی۔ چند گوئل اور محترم محمد اشرف مہمانانِ خصوصی تھے۔ نظامت کے فرائض افسانہ کلب کے صدر بشیر مالیر کوٹلوی نے کی۔ کتاب کا اجرا کرتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ اشتیاق سعید کے افسانے دیہی افسانہ نگار کے طور پر دیکھا ہے، لیکن اشتیاق سعید کے افسانے صرف دیہی ہی نہیں بلکہ شہری زندگی کی بھی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ اورنگ آباد کے افسانہ نگار نورالحسنین، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، اور بشیر مالیر کوٹلوی نے اشتیاق سعید کی افسانہ نگاری پر گفتگو کی۔

پریس ریلیز، اشتیاق سعید، مہاراشٹر، 23 مارچ 2014

اسباب بغاوت ہند

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سرسید احمد خاں کے 116 ویں یوم وفات پر علی گڑھ کے ممتاز اشاعتی

ادارے علیشا پبلی کیشنز نے سرسید کی تصنیف کردہ کتاب 'اسباب بغاوتِ ہند' کی اشاعت نو کی ہے جس کے مدیر ممتاز صحافی جسیم محمد ہیں۔ علیشا پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع سرسید کی اسباب بغاوت ہند کا مزمل منزل کامپلیکس میں واقع میڈیا سینٹر پر اجرا کرتے ہوئے علیشا پبلی کیشنز کے سرپرست پروفیسر رضاء اللہ خاں نے کہا کہ اسباب بغاوتِ ہند میں سرسید احمد خاں نے ہندوستان کی اولین تحریکِ آزادی کے بنیادی اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کی اشاعت کے مقصد کو واضح کیا۔ پریس ریلیز، جسیم محمد، علی گڑھ، 26 مارچ 2014

غزل کے رنگ

گلبرگہ: افلاک پبلی کیشنز گلبرگہ کے زیر اہتمام منعقدہ اکرم نقاش اور سہیل اختر کی مرتب کردہ کتاب 'غزل کے رنگ' کی رسم اجرا 2 مارچ 2014 بروز اتوار افسانہ نگار ڈاکٹر اکرام باگ کے ہاتھوں گلبرگہ میں عمل میں آئی۔ رسم اجرا کے بعد اکرام باگ نے کہا کہ یہ ایک عمدہ انتخاب ہے۔ غزل کی معتبر آواز جناب مصحف اقبال توصیفی اور ڈاکٹر فدائی نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ صدرِ جلسہ وہاب عندلیب نے کتاب کے مرتبین اکرم نقاش اور سہیل اختر کو مبارکباد پیش کی۔ روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 7 مارچ 2014

حدیث عنبر

دیوبند: دیوبند کے مدرسہ جامعہ امام محمد انور شاہ میں

منعقدہ ایک پروگرام میں ادیب و شاعر مولانا فضیل احمد ناصری القاسمی کے شعری مجموعہ حدیث عنبر کی رسم اجرا جامعہ کے مہتمم مولانا احمد خضر شاہ مسعودی شیخ الحدیث کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ آل انڈیا تنظیم علماء حق دہلی کے قومی صدر مولانا اعجاز عرفی نے بطور مہمان خصوصی شرکت فرمائی۔ اس موقعے پر مولانا احمد خضر شاہ، مولانا اعجاز عرفی نے اظہار خیال کیا۔ روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 مارچ 2014

چاندنی، شبنم اور دھوپ

بھوپال: اردو کے منفرد غزل اور رباعی گو شاعر نور محمد یاس کی رباعیات کے مجموعے 'چاندنی، شبنم اور دھوپ' کا اجرا ہوا۔ بھوپال کے نمائندہ اصحاب نے شرکت کر کے تخلیق کار کو مبارکباد پیش کی۔ اس کے ساتھ ہی پروفیسر عبدالمجید خاں کے منتخب مقالات، ناصر بھوپالی کے مجموعے 'یک نقطہ' کی رسم رونمائی بھی انجام پائی۔ یہ تقریب معروف افسانہ نگار اور صحافی نعیم کوثر کی زیر صدارت منعقد ہوئی جب کہ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے بزرگ شاعر علی عباس امید ڈاکٹر محمد نعمان نے شرکت کی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 19 مارچ 2014

'مشاعرہ اور کوی سمیلن'

امروھہ: امروہہ سے تعلق رکھنے والی ادب کی ممتاز ترین شخصیت امریکہ میں مقیم نور امروہوی کے رسالہ 'مشاعرہ اور کوی سمیلن' 2013 کا رسم اجرا 20 مارچ کو ہاشمی گرلس پی جی کالج میں ہوا۔ نور امروہوی امریکہ و دیگر یوروپین ممالک میں اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ نور امروہوی معیاری سطح کا ایک عالمی مشاعرہ و کوی سمیلن ہر سال امریکہ میں کراتے ہیں۔ اسی سلسلہ کا آخری مشاعرہ نومبر 2013 میں ہوا تھا۔ امروہہ کے خدمت گزار ڈاکٹر حکیم سراج الدین ہاشمی اور اردو اکادمی کے صدر منور رانا نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی تھی۔ تقریب میں بطور مہمان خصوصی جدہ (سعودی عرب) سے تشریف لائے وجہت کمال نجمی نے شرکت کی جب کہ تقریب کی صدارت شہر چیئرمین ڈاکٹر افسر پرویز نے انجام دی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 21 مارچ 2014

بیتے ہوئے دن

لکھنؤ: افسانہ نگار رتن سنگھ کی خودنوشت سوانح 'بیتے ہوئے دن' کی رسم اجرا مشرف عالم ذوقی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ رتن سنگھ نے لکھنؤ کی ادبی مجالس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یشپال، امرت لال ناگر، رام لعل، مدرا راکشش، کرشن کگڑ جیسے نہ جانے کتنے لوگ اس شہر سے ملے، سجاد ظہیر نے میری ملاقات ملک راج آنند سے کرائی۔ میں پاکستان سے آکر چار باغ اسٹیشن پر کھڑا تھا، ذہنی طور پر میں آج بھی وہیں کھڑا ہوں۔ انیس اشفاق نے اپنی صدارتی تقریر میں علی عباس حسینی، عابد سہیل، رام لعل، مسیح الحسن رضوی، رضیہ سجاد ظہیر، ڈاکٹر صبیحہ انور، عائشہ صدیقی وغیرہ کے نام لیتے ہوئے کہا کہ کہانی کی تخلیق میں افسانہ نگاری میں لکھنؤ کا بہت حصہ ہے۔ رتن سنگھ کرافٹ مین شپ کے ماہر ہیں، نیریٹیو پاور اور تخلیقی فیلو رتن سنگھ کے افسانوں کی خاص پہچان ہے، وہ افسانہ کی تخلیق میں کسی تاخیر یا تفصیل کے قائل نہیں ہیں۔ شفاعت علی صدیقی کا مضمون رتن سنگھ کی بھتیجی نے حاضرین کو پڑھ کر سنایا۔ شاہنواز قریشی نے رتن سنگھ پر خوبصورت انشائیہ پیش کیا۔ شمیم نکہت، پروفیسر شارب ردولوی، عابد سہیل نے رتن سنگھ کی شخصیت اور خدمات پر گفتگو کی۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 اپریل 2014

کپل سبل کے مجموعہ کلام 'چشم دید' کا اجرا

نئی دھلی: مائنارٹیز ویلفیئر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ایوان غالب میں مرکزی وزیر کپل سبل کی ہندی نظموں کے اردو زبان میں ترجے پر مشتمل کتاب 'چشم دید' کی رسم اجرا معروف شاعر پروفیسر وسیم بریلوی کے ہاتھوں میں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر کپل سبل نے کہا کہ ہندوستان میں اردو سے زیادہ میٹھی کوئی زبان نہیں ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے وہ اپنی

کپل سبل کی نظموں کے مجموعہ 'چشم دید' کا اجرا کرتے ہوئے پروفیسر وسیم بریلوی، پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر خواجہ اکرام و دیگر

جانب سے ہر ممکن خدمات دینے کو تیار ہیں۔ کپل سبل نے مزید کہا کہ میرے والد ہیرا لعل سبل وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر تھے۔ انھوں نے اردو کے نامور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے مقدمات میں ان کی پیروی کی۔ اس موقعے پر کپل سبل نے اپنی نظمیں سنائیں اور ان کی ایک نظم جو عدنان سمیع کی گائی ہوئی تھی وہ سامعین کو سنائی۔ قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین وسیم بریلوی نے کہا کہ اردو دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے۔ شاعری اور مشاعروں کے ذریعے ہم نے پوری دنیا میں اردو کا لوہا منوالیا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین نے 'چشم دید' پر تبصرہ کیا۔ ماہر تعلیم فرید احمد نے کہا کہ کپل سبل کی ہندی نظموں کی اردو میں ترجمہ کی گئی کتاب 'چشم دید' کا اجرا کراتے ہوئے ہمیں بے انتہا مسرت ہو رہی ہے۔ دیگر مہمانان میں کتاب کے مترجم ڈاکٹر موسیٰ رضا، انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے نائب صدر صفدر ایچ خان، ذاکر حسین کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اسلم پرویز، خواجہ خلیل اللہ، ڈی پی سی سی کے جنرل سکریٹری محمود ضیا، سیتارام بازار کی میونسپل کونسلر سیما طاہرہ اور حافظ مطلوب کریم کے نام قابل ذکر ہیں۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 اپریل 2014

انیسویں صدی میں ادب، تاریخ اور تہذیب

نئی دھلی: پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی 80 ویں سالگرہ کے موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ میں ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ سابق گورنر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی کے ہاتھوں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کے اعزاز میں ترتیب دی گئی کتاب 'انیسویں صدی میں، ادب، تاریخ اور تہذیب' کا اجرا بھی کیا گیا۔ کتاب کو ڈاکٹر اطہر فاروقی، ڈاکٹر رضا حیدر اور ڈاکٹر سرور الہدیٰ نے ترتیب دیا اور 'انجمن ترقی اردو ہند' نے شائع کیا ہے۔ اس میں 22 ادیبوں کے مضامین شامل ہیں۔ یہ تمام مضامین 19 ویں صدی کی تاریخ، ادب اور تہذیب کا احاطہ کرتے ہیں۔ جلسے کی ابتدا میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے کتاب کا تعارف پیش کیا اور ڈاکٹر سرور الہدیٰ، سید شاہد مہدی اور پروفیسر منیجر پانڈے نے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی ادبی خدمات پر گفتگو کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، یکم اپریل 2014

سخنور

پٹنہ: اردو کونسل ہند کے زیر اہتمام مقامی بہار اُردو اکادمی، پٹنہ کے کانفرنس ہال میں کناڈا سے تشریف لائے

شاعر وادیب اور ماہنامہ 'سخنور' (ٹورنٹو) کے مدیر جناب افضل امام کے اعزاز میں شاندار اعزازی محفل کا انعقاد کیا

گیا اس موقعے پر اُردو کونسل ہند کی جانب سے جناب افضل امام کی شعری وادبی خدمات پر سابق وائس چانسلر پدم شری پروفیسر ڈاکٹر (کیپٹن) شرف عالم نے 'اردو کونسل ایوارڈ' اور 'سندِ اعتراف' سے نوازا۔ کونسل کے قومی صدر اور سابق وزیر حکومت بہار شمائل نبی نے افضل امام کی شال پوشی کر کے ان کی عزت افزائی کی۔ افضل امام کی نئی نثری تصنیف 'یادوں کی خوشبو' کا اجرا پدم شری پروفیسر ڈاکٹر (کیپٹن) شرف عالم کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ مہمان خصوصی بہار اُردو اکادمی کے سکریٹری جناب امتیاز احمد کریمی تھے۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے افضل امام کی تصنیف 'یادوں کی خوشبو' پر مقالہ پیش کیا۔ مہمانِ اعزازی پروفیسر ڈاکٹر (کیپٹن) شرف عالم نے اپنی تقریر میں اردو کونسل کے ذریعہ اس اعزازی محفل کی ستائش کی۔ افضل امام نے قدردانی کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کیا۔

قومی صدر جناب شمائل نبی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو کونسل ہندی شاعروں اور ادیبوں کی ہمیشہ سے قدردان رہی ہے۔ کونسل کے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر اسلم جاوداں نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ منفرد شاعر جناب بدیع الزماں سحر نے اپنی ایک نظم 'افسانہ وحقیقت' سنائی۔ کونسل کے ناظم انوار الہدیٰ نے تمام مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، اسلم جاوداں، پٹنہ، 24 مارچ 2014

فہمیدہ ریاض کے ناول 'ہم لوگ' کا اجرا

نئی دھلی: انڈیا انٹرنیشنل سینٹر لودی روڈ پر ساکشی کے زیر اہتمام شعری نشست بعنوان 'امن کے پیغام کی' کا انعقاد کیا گیا، اس موقعے پر معروف شاعرہ اور ناول نگار فہمیدہ ریاض کے تازہ ترین ناول کا اجرا بھی اعجاز احمد کے ہاتھوں کیا گیا۔ اس تقریب کی نظامت کے فرائض سبودھ لال نے انجام دیے۔ مریڈولا ستیش ٹنڈن نے افتتاحیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ فہمیدہ ریاض صاحبہ کے اعزاز میں اس تقریب کا انعقاد کیا گیا تاکہ غیر اردو داں طبقہ بھی انھیں سنے اور پڑھے۔ وبھوتی نارائن رائے نے کہا کہ فہمیدہ ریاض نے اب تک تین ناول قلم بند کیے ہیں جو ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ تہذیب وثقافت کے حوالے سے ہیں۔ فہمیدہ ریاض نے اس تقریب کے لیے میری ڈولا ستیش ٹنڈن کا شکریہ ادا کیا۔ یتیم کا انصاف، روشنائی، اپنے اشعار بھول جاتا ہوں، جیسی نظمیں اشوک لال نے پیش کی۔ ترنم ریاض نے وادی کشمیر کے حوالے سے نظم پیش کی۔ سبودھ لال، کملیش ڈبرال، شبانہ نذیر وفا، ایل این واجپئی نے اپنی شاعری سے سامعین کو مسحور کردیا۔ معروف صحافی جاوید نقوی نے بھی گفتگو کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 5 اپریل 2014

غالب اکادمی میں علیم صبا نویدی کی کتابوں کا اجرا

چینئی: 27 مارچ 2014 بمقام دہلی، دبستانِ ابر کے زیرِ اہتمام بمقام غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین، دہلی میں تامل ناڈو کے مایہ ناز شاعر ادیب اور نقاد علیم صبا نویدی کی دو کتابوں 'اردو شاعری میں نئے تجربے' اور 'اردو

نظم کے سلسلے' اور انور بارہ بنکوی کے شعری مجموعہ 'لفظ لفظ آسمان' کی رسمِ اجرا ڈاکٹر ماجد دیوبندی اور عظیم اختر کے دستِ مبارک سے عمل میں آئی۔ اس جلسے کی صدارت جناب محمد عمران انصاری قومی نائب صدر، آل انڈیا مومن کانفرنس نے فرمائی اور نظامت جناب شمس رمزی نے کی۔

پریس ریلیز، کے ایم اشفاق رحمٰن مظہر چینئی، 7 اپریل 2014

وفیات

شہرۂ آفاق صحافی خوشونت سنگھ چل بسے

نئی دھلی: صحافی وناول نگار خوشونت سنگھ طویل علالت

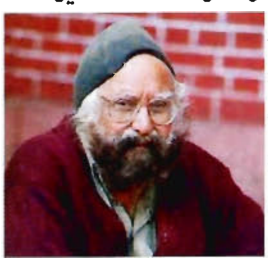

کے بعد جمعرات کو دل کا دورہ پڑنے سے چل بسے وہ 99 برس کے تھے۔ پسماندگان میں ایک بیٹا راہل سنگھ اور بیٹی مالا ہے۔ خوشونت سنگھ دہلی کے سوجان سنگھ پارک میں رہائش پذیر تھے اور وہیں انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ ان کی آخری رسوم میں متعدد سینئر سیاسی رہنماؤں نے شرکت کی۔ اس سے قبل وزیر اعظم منموہن سنگھ اور یو پی اے کی چیئرپرسن سونیا گاندھی نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ خوشونت سنگھ تقسیم ہند سے پہلے کے متحدہ پنجاب کے ضلع خوشاب کے ہدالی (جواب پاکستان میں ہے) میں 2 فروری 1915 کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد سر سوبھا سنگھ ایک مشہور ومعروف بلڈر تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم ماڈرن اسکول میں پائی اور پھر اعلیٰ تعلیم گورنمنٹ کالج لاہور، سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی اور کنگ کالج لندن میں حاصل کی۔ خوشونت سنگھ حکومت ہند کے جریدہ 'یوجنا' السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا اور دو بڑے انگریزی اخبار نیشنل ہیرالڈ اور ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر بھی رہے۔ وہ شاعری کے دلدادہ اور فی البدیہہ مزاحیہ جملے بولنے میں ماہر تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 21 مارچ 2014

صدیق مجیبی

رانچی: بہار اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین پروفیسر صدیق مجیبی کا 6 مارچ کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی عمر تقریباً 84 سال تھی اور کچھ روز قبل ان کا برین ہیمبرج ہونے کے بعد رانچی میں مقامی اسپتال میں علاج چل رہا تھا۔ رانچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے استاد اور صدر شعبہ کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ ان کا مجموعہ کلام شجر ممنوعہ ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ملک کے ادبی وعلمی حلقوں میں ان کی رحلت پر رنج و ملال ہے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی اردو کونسل کے قومی صدر شمائل نبی، مشہور شاعر حسن نواب حسن، ڈاکٹر اسلم جاوداں، اثر فریدی، اشرف النبی قیصر، ڈاکٹر محبوب عالم، امتیاز کریم، انوار الہدیٰ، سمیت کئی لوگوں نے ان کے سانحہ ارتحال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے ان کے انتقال کو اردو دنیا کا ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 مارچ 2014

مولانا احمد علی قاسمی کی وفات

نئی دھلی: مولانا احمد علی قاسمی آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے جنرل سکریٹری اور سنٹرل حج کمیٹی کے وائس چیرمین اور ماہنامہ دعوت وعزیمت کے مدیر رہے ہیں۔ محمد ادیب ممبر آف پارلیامنٹ نے کہا کہ مولانا احمد علی قاسمی صاحب اپنی بات بڑی بے باکی اور بے خوفی سے کہتے تھے اور انھوں نے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اور دوسری جماعتوں کے پلیٹ فارموں سے قوم وملت کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ جناب الیاس ملک نائب صدر العلم سوسائٹی نے کہا کہ مولانا احمد علی قاسمی صاحب کے انتقال سے ایک دور کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ وہ قوم وملت کے مخلص وایماندار قائد ورہنما اور ہمدرد انسان تھے۔ وہ ارباب اقتدار کے سامنے بڑی جرأت وہمت سے بات رکھا کرتے تھے۔

پریس ریلیز، شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 22 مارچ 2014

ڈاکٹر سوامی شیاما نند سرسوتی روشن

نئی دہلی: دنیائے ادب میں رباعی سے اپنی شناخت بنانے والے پشاور پاکستان (1920) میں پیدا ہوئے ڈاکٹر سوامی شیاما نند سرسوتی روشن کا 94 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ اس طرح روشن دنیائے ادب میں اپنا نام روشن کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔ مالویہ نگر کے کھڑکی ایکسٹینشن سے متصل جہاں پناہ میں تعزیتی نشست کا انعقاد سیفی منزل میں کیا گیا۔ محترمہ سہرش اروڑہ، پروفیسر عراق رضا زیدی، اوم پرکاش اروڑہ، ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی کے ساتھ روشن اور ان کی رباعی کے حوالوں سے پذیرائی کرنے والوں میں آر پی شرما مہرش، پروفیسر ستیہ پرکاش شرما تفتہ زاری، شمشیر سنگھ، کاوش پرتاب گڑھی، ڈاکٹر اخلاق آہن، پروفیسر صادق وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر شیاما نند سرسوتی روشن کی ایک درجن سے زائد کتابیں رباعی آئیں ہیں جو اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ہیں۔ انھوں 1300 رباعی اردو اور 1700 سے زیادہ ہندی میں لکھی ہیں۔ روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 مارچ 2014

خراج عقیدت

مرزا احمد جمیل

مالیگاؤں: مرزا احمد جمیل اس دارفانی سے کوچ کر گئے لیکن کمپیوٹرائزڈ کتابت ان کا ایسا کارنامہ ہے جو مدتوں تک باقی رہے گا۔ اگرچہ کمپیوٹرائزڈ کتابت نے خطاطوں کو بے روزگار کر دیا لیکن مرزا مرحوم کی جانفشانی سے اردو خوش نویسی کو نئی زندگی ملی ہے۔' ان الفاظ میں مالیگاؤں کے معروف خوش نویس گل ایوبی نے مرزا احمد جمیل کی رحلت پر خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ پینٹر نثار احمد (85) نے کہا کہ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مرزا جمیل کے کام کو آگے بڑھایا جائے اور برقیاتی کتابت میں نئی جہتیں تلاش کی جائیں۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 مارچ 2014

پروفیسر افغان اللہ

لکھنؤ: پروفیسر افغان اللہ خان بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے، ان کے جیسا مخلص اور پرکشش شخصیت کا مالک نہیں دیکھا، وہ لوگوں سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے، سب کو پیار کرتے، انھوں نے کبھی دوسروں کی کمیاں نہیں تلاش کیں بلکہ ہمیشہ خوبیوں کا تعارف اور تعریف کرتے تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو ایک استاد کی نظر سے دیکھتے اور اولاد کی طرح دلارتے تھے۔ ان خیالات کا اظہار مقررین و دانشوروں نے پروفیسر افغان اللہ خان کی چھٹی برسی کے موقعے پر ہوئے ایک یادگاری سیمینار میں کیا۔ پروفیسر افغان اللہ خاں میموریل کمیٹی کے تحت ابوبازار میں ہوئے سیمینار کی صدارت کر رہے مرحوم پروفیسر کے قریبی دوست و معروف شاعر مہیش اشک نے کہا کہ ان کے انتقال کے بعد کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب ان کی یاد نہ آئی ہو۔ ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی۔ کانگریسی لیڈر طلعت عزیز نے ایک فرد کی طرح تھے۔ نیا دور کے مدیر ڈاکٹر سید وضاحت حسین رضوی صحافی کمار ہرش، محمد حامد علی، ڈاکٹر رضی الرحمٰن ڈاکٹر درخشاں تاجور، پروفیسر چندر بھوشن انکر، ضمیر احمد پیام وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ سیمینار کی نظامت محبوب سعید حارث نے کی۔ روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 مارچ 2014

سید اطہر الدین اطہر

میرٹھ: سید اطہر الدین اطہر کی پہلی برسی کے موقعے پر سید اطہر الدین میموریل سوسائٹی اور شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ نے مشترکہ طور پر تقریب، شعبۂ اردو کے پریم چند سیمینار ہال میں منعقد کی جس کی سرپرستی سید علیم الدین (سابق چیئرمین، پھلاؤدہ) نے، صدارت پروفیسر انور پاشا (جے این یو، نئی دہلی) اور نظامت آفاق احمد خاں نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر پروفیسر جے کے پنڈیر (پرووائس چانسلر، سی سی ایس یو) شریک ہوئے۔ جبکہ استقبالیہ کی رسم سید معراج الدین اور اظہار تشکر کی رسم سید ذکی الدین (سابق ایم ایل اے) نے ادا کی۔ پروگرام کے پہلے حصے میں مرحوم کی شخصیت اور خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ اطہر مرحوم کے مجموعۂ نظم 'لہر' اور شعبۂ اردو کی سہ ماہی میگزین 'ہماری آواز' کے خصوصی شمارے 'بوئے اطہر' کا اجرا بھی کیا گیا۔ ڈاکٹر آصف علی نے مقالہ پیش کیا۔ سبھارتی ٹرسٹ، البرکات، علی گڑھ اور مشرف عالم ذوقی کو اطہر الدین نیشنل ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ پروگرام کے دوسرے حصے میں شاداں پھلاؤدی، طالب زیدی، جسیم الدین ہمدم، ڈاکٹر یونس غازی، نذیر میرٹھی، انیس میرٹھی اور عامر نظیر ڈار وغیرہ نے مرحوم اطہر کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے سید اطہر الدین میموریل سوسائٹی کے مستقبل کے منصوبوں کو بیان کیا اور مرحوم کے ادبی امتیازات کا ذکر کیا۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر انور پاشا نے مرحوم اطہر کی ادبی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری میں عصری حسیت ان کی انفرادیت کے طور پر سامنے آئی ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 14 مارچ 2014

علامہ اسید الحق قادری کے چہلم پر عالم ربانی کانفرنس کا انعقاد

بدایوں: گزشتہ چار مارچ کو عراق میں ایک دہشت گردانہ

حملے میں شہید ہونے والے خانقاہ قادریہ کے ولی عہد اور ممتاز محقق و دانشور علامہ اسید الحق کے عرس چہلم کے موقعے پر انھیں تعزیت پیش کی گئی۔ علامہ اسید الحق کے شاگرد خاص عبدالعلیم قادری کے استقبالیہ خطبہ کے ساتھ عالم ربانی کانفرنس کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ کانفرنس کے مہمان خصوصی خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ کے چشم و چراغ اور چیف انکم ٹیکس کمشنر سید محمد اشرف نے علامہ اسید الحق کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے خانقاہ قادریہ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز کر دیا ہے، اس سلسلے کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اس کام میں خانقاہ برکاتیہ ہر قدم پر ان کے ساتھ ہے۔ سابق ممبر پارلیمنٹ اور مشہور دانشور مولانا عبیداللہ خاں اعظمی نے اپنے خطاب میں کہا کہ علامہ اسید الحق ان باکمال لوگوں میں سے تھے، جو سچے وارث علوم دینیہ ہیں۔ اس موقعے پر سید شاہ شمیم الدین منعمی نے کہا کہ علامہ اسید الحق قادری صرف خانقاہ قادریہ کے نقیب نہیں بلکہ وہ جملہ خانقاہوں کے امین اور سچے وارث تھے۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ علامہ اسید الحق ہندوستان ہی نہیں، پورے برصغیر کی ایسی شخصیت تھے جن کے بغیر اہل تصوف کی محفلیں نامکمل رہتی تھیں۔ این سی پی یو ایل کے ڈائریکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ علامہ کسی عجوبہ روزگار سے کم نہیں۔ انھوں نے جو مختصر سی زندگی گزاری، اس پر بھی رشک ہوتا ہے اور جو موت آئی اس پر بھی فخر ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ علامہ اسید الحق کے ذریعہ جو مشن شروع ہوا ہے، علمی بنیادوں پر اتحاد کے ساتھ اس مشن کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے استاد مولانا مبارک حسین مصباحی نے کہا کہ خانقاہ قادریہ سے علم و فن کا سلسلہ پچھلے آٹھ سو برسوں سے جاری ہے، علامہ اسید الحق نے اسی سلسلہ کو بحسن و خوبی آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر علیم اشرف جائسی نے بھی علامہ اسید الحق کو خراج عقیدت پیش کیا۔ خانقاہ قادریہ کے صاحب سجادہ اور علامہ اسید الحق کے والد بزرگوار حضرت سالم میاں کے دعائیہ کلمات کے ساتھ کانفرنس کا اختتام ہوا۔ نظامت ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن نے کی۔ اس موقعے پر مولانا خوشتر نورانی کی ادارت میں نکلنے والے ماہنامہ جام نور کے 400 صفحات پر مشتمل خصوصی شمارے عالم ربانی نمبر کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 اپریل 2014